اسلام

دینِ معرفت

سید محمد صحفی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

اسلام

دینِ معرفت

سیّد محمد صحفی

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس: ۵۴۲۵
کراچی۔پاکستان

مترجم ——— محمد فضل حق

نظر ثانی ——— رضا حسین رضوانی

مصحح ——— محمد باقر تقوی

سر ورق ——— محمود حسن آرٹسٹ

کتابت ——— سید جعفر صادق

طبع سوم ——— ۱۴۱۳ھ ، ۱۹۹۲ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دی جائیگی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کیجائیگی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنیوالے پر یہ شرط عائد نہ کرنیکے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

Acc No. 15017 Date 6/1/11
Section معارف اسلامی Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

انتساب

اُن نوجوانوں کے نام

جو

دینِ اسلام سے شغف رکھتے ہیں اور اس کی معرفت چاہتے ہیں

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

اسلام

"کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیت اور عبادت کا بلندترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو، اس کے معتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔"

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد ابو القاسم موسوی خوئی دام ظلّہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پُورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجّہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسول ؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کرچکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کرچکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچّے بچّیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:

(شیخ) یُوسُفؒ علی نفسیؒ نجفیؒ

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلّہ العالی

قارئینِ گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ اِس ادارے کی مطبوعات کی تیّاری کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اُجاگر کرنا ہے۔ اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اِس کتاب کی تیّاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گرانقدر رہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اِس کتاب کا مطالعہ اُسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا بھی ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے۔

" (اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی اور انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار: سیکرٹری نشر و اشاعت

فہرست

اسلام میں کام اور محنت ---------- ۱۵
اسلام میں عِلم کا مقام ---------- ۳۷
اسلام میں والدہ کا مقام ---------- ۵۳
اسلام میں نیکوکاری ---------- ۷۷
اسلام میں الکحلی مشروبات کی ممانعت ---------- ۱۰۱
اسلام میں قمار بازی کی مخالفت ---------- ۱۲۳
اسلام میں جھوٹ کے خلاف جہاد ---------- ۱۴۶
اسلام میں اجتماعی روابط ---------- ۱۷۳
اسلام میں آدابِ معاشرت ---------- ۱۹۷
اسلام میں بھائی چارہ اور غمخواری ---------- ۲۲۵
اسلام میں دوستی کا آئین ---------- ۲۴۸
اسلام میں پاکیزگی اور صفائی ---------- ۲۷۱

اسلام میں تربیت کا انداز ---------- ۲۹۳
اسلام میں بچّوں کی تربیت ---------- ۳۱۳
اسلام میں قرضِ حسنہ ---------- ۳۳۹
اسلام میں گناہ کے خلاف جنگ ---------- ۳۶۰
اسلام میں بیوی اور شوہر کے حقوق ---------- ۳۸۰
اسلام میں استاد کا مقام ---------- ۴۰۰
اسلام میں امانت کی ادائیگی ---------- ۴۲۰
اسلام میں اخلاق ---------- ۴۴۱
اسلام میں حقائقِ علمی ---------- ۴۶۱
اسلام میں علمی مباحث ---------- ۴۸۶
اسلام میں ایفائے عہد ---------- ۵۰۹
اسلام میں استقامت ---------- ۵۳۱

پیش لفظ

اِسلام کی تعلیمات میں انسان کی تمام ضروریات کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے اور ہر موقع محل کے مطابق کافی اور مکمّل احکامات دیے گئے ہیں۔

اسلامی احکام کے مطالعے اور تحقیق سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے اور جوں جوں ایک انسان علم و فضیلت کے اِس سرمدی سرچشمے سے فیضیاب ہوتا ہے اس کا سر خود بخود اس کی تعظیم میں جُھک جاتا ہے۔

انسان کے علم و دانش میں جس قدر ترقی ہوتی ہے اسی قدر وہ اِسلامی تعلیمات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتا ہے اور ان کی قدر قیمت سے بیشتر واقف ہوتا ہے۔

اِسلام ایک زندہ دین ہے۔ یہ ایک ایسا آبِ حیات ہے جو اقوام کو زندگی بخشتا ہے اور ان کی نجات اور ترقّی کے اسباب مہیّا کرتا ہے۔

اسلام کے قوانین چونکہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہیں اس لیے ان کی افادیّت کسی ایک دَور یا ایک مقام تک محدود نہیں۔

یہ قوانین اُس خُدائے بزرگ و برتر نے وضع کیے ہیں جس نے اپنے دستِ قُدرت سے انسان کو پیدا کیا اور جو اس کے وجود کے ہر ذرّے سے واقف ہے فقط وہی جانتا ہے کہ کونسی چیز انسان کی خوش بختی کا موجب ہے اور کونسی چیز اسے تباہی اور بربادی سے دوچار کرنے والی ہے۔

مکتبِ اسلام نے عملی طور پر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ ربِّ جلیل چاہے تو ایک سرگرداں، ناسمجھ اور بدبخت قوم کو ایک قلیل مدّت میں ایک ایسی مہذّب اور ترقی یافتہ قوم بنا سکتا ہے جو جہانِ بشریّت میں تمدّن، علم اور فضیلت کی علَم بردار بن کر اُبھرے۔

آپ قبل از اسلام کے دَور کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور دیکھیں کہ لوگ تباہی اور بربادی کے کس خطرناک بھنور میں پھنسے ہوئے تھے اور پھر صدرِ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ انہی لوگوں نے کیسے فضیلت اور انسانیّت اور علم و دانش کی جانب جست لگائی اور اسلامی تعلیمات نے کیونکر ان کے وجود کو سراسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔

تاہم بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کے دشمنوں نے مسلمانوں اور قرآنی حقائق کے مابین جدائی ڈال دی اور ملّتِ اسلامیہ کو فتنہ و فساد اور گناہ کی راہ پر لگا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تفوّق اور اقتدار سے محروم ہو گئی۔

پہلا انحراف جو مسلمانوں کے انحطاط کا موجب بنا یہ تھا کہ انھوں نے رسولِ اکرمؐ کے حقیقی جانشینوں کا دامن چھوڑ دیا۔

اسلام کے جلیل القدر پیغمبرؐ نے اپنے حینِ حیات میں واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ قرآن اور ہمارے اہلِ بیتؑ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اور ان دو میں سے فقط ایک (خواہ وہ قرآن ہو یا اہلِ بیتؑ) مسلمانوں کی نیک بختی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

جو مسلمان حقیقی خوش نصیبی کے خواہشمند ہیں انھیں چاہیئے کہ قرآنی تعلیمات آنحضرتؐ کے جانشینوں سے (یعنی امام علیؑ اور ان کے گیارہ فرزندوں سے) حاصل کریں اور پھر ان پر سختی سے عمل کریں۔

اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں اسلام کے احکام قرآنِ مجید اور رسولِ اکرمؐ کے خاندان کی زبان میں پیش کیے جائیں اور ان پر سادہ اور عام فہم الفاظ میں بحث کی جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ جس کی جانب توجّہ دلانا ضروری ہے یہ ہے کہ بحث کے دوران مختلف اسکالروں کے نظریات بھی نقل کیے گئے ہیں تاکہ ہمیں پتا چل جائے کہ جو احکام پیشوایانِ اسلام نے چودہ سو سال قبل دیے تھے دنیا کے اہلِ علم نے سالہا سال کے مطالعہ کے بعد ان کی افادیّت سمجھ لی ہے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہم مسلمان کس قدر گرانبہا سرمائے کے مالک ہیں جس سے ہم بے خبر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کا ادراک ہمیں اس خوابِ گراں سے جگا دے جو ہم پر سالہاسال سے مستولی ہے اور خداوندِ کریم اور احکامِ قرآنی کی جانب لوٹ کر ہم اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کر سکیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ حاضر میں نوجوان نسل اور پڑھے لکھے طبقے کی جانب سے حقائقِ دین کو سمجھنے کی خاطر جس جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کی مثال سابقہ ادوار میں نہیں ملتی۔

جو دینی کتابیں اور مقالے منطقی اور مدلّل انداز میں لکھے جائیں اور ہر قسم کی حاشیہ آرائی سے پاک ہوں آجکل ان کے خریدار اور قاری باقی سب کتابوں اور تحریروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتے ہیں۔

اہلِ علم لوگ دینی تعلیمات کو علم و دانش کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اسلام بھی اسی طرزِ تفکر کا حامی ہے اور اس کے قواعد و ضوابط کی بنیاد اِسی اصُول پر رکھّی گئی ہے۔

اسلام نے ہر مرحلے پر اپنے پیروؤں اور دوسرے بنی نوع انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے اور کبھی بھی اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ اس کے احکام آنکھیں بند کر کے قبول کر لیے جائیں۔

اسلام کی تعلیمات میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو علم اور عقل کے معیار پر پوری نہ اُترتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دین سائنسی ترقّی کے پہلو بہ پہلو پیش قدمی کرنے اور اپنی شان و شوکت اور عظمت کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

موجودہ نسل ان گوناگوں علمی خیالات اور نظریات سے واقف ہے جو اُسے مشرقی اور مغربی ممالک سے بہم پہنچائے جا رہے ہیں اور مختلف فلسفیانہ مکاتب سے بھی اس کا رابطہ قائم ہے لہٰذا وہ اپنی دینی تعلیمات کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ چاہتی ہے کہ جہاں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے وہاں اس کے اعتقادات بھی روحانی قدر و قیمت کے لحاظ سے اس تعلیم کے ہم پلّہ یا اس سے مقابلتاً بلند تر سطح پر ہوں۔

جو مذاہب دَورِ حاضر کا یہ تقاضا پُورا نہ کر سکیں وہ لازمی طور پر سائنس کی طاقت کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ سے ایک زیادہ زبردست قوت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

اگر انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل یہ نعرہ لگاتا ہے کہ "میں عیسائی کیوں نہیں ہوں؟" اور اپنے اس مذہب سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت صحیح معنوں میں اس کے اطمینان اور نجات کا موجب نہیں ہے۔ حتّٰی کہ وہ خدا کا وہ تصوّر

بھی قبول کرنے سے قاصر ہے جو عیسائیت پیش کرتی ہے کیونکہ وہ خدا اور وہ مذہب کسی طور بھی علمی معیارات پر پورے نہیں اُترتے۔

بڑے بڑے مسیحی اسکالر اور مفکر بھی عموماً عیسائیت کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ اسے عقلیت پسند اور منطقی مذہب نہیں سمجھتے۔ ان کی اپنے مذہب کے متعلق اس بے عقیدگی کا اظہار ان مضامین اور مقالات سے ہوتا ہے جو گاہے بگاہے چھپتے رہتے ہیں۔

بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کی مذہب سے واقفیت محض واجبی اور ان تعلیمات تک محدود ہے جو انھیں کلیسا اور عیسائیت سے حاصل ہوئی ہیں۔ ان کی مذہب کے بارے میں قنوطیت کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی جانچ پڑتال کے بغیر تمام مذاہب سے عداوت پر تُل گئے ہیں اور انھیں بے اعتبار اور ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں۔

جو حضرات اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو کتاب ان کے زیرِ نظر ہے اس کا مصنّف ایک عیسائی ہے اور وہ دوسرے مذاہب کو بھی عیسائیت کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے جو خرافات اور اوہام کا ایک پلندہ ہے لہٰذا اس کے نظریات عیسائیت کے بارے میں تو درست ہو سکتے ہیں لیکن ان کا اطلاق تمام مذاہب پر نہیں کیا جا سکتا۔

بہت سے ایسے عیسائی اسکالر جنھوں نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کیا ہے جب اسلامی تعلیمات کی خوبیوں سے متعارف ہوتے ہیں تو بے اختیار سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس دینِ حق کی والہانہ انداز میں تعریف کرتے ہیں۔

دَورِ حاضر میں ہمارے پڑھے لکھے نوجوانوں اور اسکالروں کا اسلام پر ایمان عمیق اور اساسی اور اسی بنا پر راسخ اور غیر متزلزل ہے کیونکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے روشن خیال نوجوان اپنی دینی تعلیمات کے بارے میں تحقیق

اور جستجو کرتے ہیں تاکہ حقیقت کا ادراک پیدا کر کے دلی اطمینان سے بہرہ ور ہو سکیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان جو ملک بھر میں اور بیرونِ ملک لوگوں کے مختلف طبقات اور بالخصوص نوجوان طبقے سے براہِ راست رابطہ قائم رکھتی ہے اور جسے ہر روز دینی معلومات کے سلسلے میں سینکڑوں خطوط موصول ہوتے ہیں روشن ضمیر مسلمانوں کے اپنے مذہب کے بارے میں دلی لگاؤ سے بخوبی آگاہ ہے۔

عظیم اسکالروں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور دوسری بزرگ علمی شخصیتوں کے ہاتھوں جو محققانہ اور فاضلانہ کتابیں اسلامی تعلیمات کے بارے میں لکھی جاتی ہیں اُن سے اِن حضرات کے اس الہامی دین سے دلی شغف کا پتا چلتا ہے۔

ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ اہلِ علم کی کاوشوں کی بدولت اسلامی مسائل کے بارے میں نئی سے نئی تحقیقات کی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس تحقیقات اور مطالعے کا دائرہ باقاعدگی سے وسیع تر ہو رہا ہے اور نتیجے کے طور پر لوگوں کی دینی معلومات کی سطح زیادہ بلند ہو رہی ہے۔

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ ادارہ اسلام کے خدمت گزاروں میں سے ہے اور اپنی ہمت کے مطابق اس سلسلے میں اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم ہمیں خدمت گزاری کی بیشتر توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم اسلام کی آسمانی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ واقفیت پیدا کر سکیں اور ان پر عمل کر کے سعادتِ دارین حاصل کر سکیں۔

اسلام میں کام اور محنت

"کام کرو اور اطمینان رکھو کہ تم کامیاب ہو گے"۔
امام علی علیہ السلام

اسلام میں کام اور محنت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اسے اس دُنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی انسان کی خوش بختی کا بہت بڑا ذریعہ گردانا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اسّی سے زیادہ آیات میں دو چیزوں کو انسان کی فلاح اور خوش بختی اور حصولِ جنّت کے لیے شرط قرار دیا ہے یعنی (۱) ایمان اور (۲) عملِ صالح۔

کام کسے کہتے ہیں؟ دانشوروں نے اس کے بارے بہت کچھ کہا ہے لیکن عرفِ عام میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"کام ہر اس چیز سے عبارت ہے جس کے لیے کسی مقصد کے حصُول کی خاطر وقت صرف کرنے اور مشقّت برداشت کرنے کی ضرورت ہو"۔

لہٰذا ہر اُس عمل کو جو انسان کسی مقصد کے حصول کے لیے انجام دے بالعموم "کام" کہا جاتا ہے۔

ایک کاریگر جو ایک بجلی کی موٹر کی مرمّت کے لیے محنت کرتا ہے وہ کام کرتا ہے۔ ایک آرکیٹکٹ جو ایک عمارت کا نقشہ تیّار کرنے کے لیے کاغذ پر لکیریں کھینچتا ہے وہ بھی کام کرتا ہے۔ ایک مصوّر جو اپنا وقت صرف کرکے اور دماغ پر زور ڈال کر قدرتی مناظر کینوس پر منعکس کرتا ہے وہ بھی کام کرتا ہے اور ایک چوکیدار جو عمارت کے صدر دروازے پر کھڑا ہوا اس میں آنے جانے والوں پر نظر رکھتا ہے وہ بھی کام میں ہی مشغول ہوتا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کو معاشرے میں بیکار نہیں کہا جاتا اور ان تمام افعال کو کام سمجھا جاتا ہے لیکن جو شخص کسی مقصد کے بغیر سڑک کی فٹ پاتھ پر گھومے یا بلا مقصد ایک کاغذ پر لکیریں کھینچے اسے بیکار کہا جاتا ہے اور بطور تفریح گھومنے پھرنے اور ازراہِ تفنّن لکیریں کھینچنے کو کام نہیں کہا جاتا۔

مندرجہ بالا مثالوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ معاشرہ کام کو محض جسمانی حرکات اور مادّی کاوشوں پر منحصر نہیں سمجھتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص عدالت میں ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کرلے جو خود اس کے لیے نقصان دہ ہو لیکن اس کے نتیجے میں حقدار کو اس کا حق مل جاتا ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے بڑا عظیم کام سرانجام دیا ہے۔

اگر ایک اُستاد طالب علموں کو سبق پڑھاتا ہے یا ایک خطیب یا واعظ لوگوں کی ہدایت کے لیے تقریر کرتا ہے تو وہ فقط باتیں کرتا ہے لیکن لوگ اسے بیکار نہیں سمجھتے بلکہ اس پڑھائی اور تقریر کو ایک بیش قیمت کام شمار کرتے ہیں۔

عملِ صالح

قُرآنِ مجید میں استعمال شدہ الفاظ "عملِ صالح" جن کا اُردو میں ترجمہ "شائستہ کام" کیا جا سکتا ہے مقبولِ عام معانی کے حامل ہیں۔ اس سے مراد ہر وہ اچھا اور درست کام ہے جو از روئے مصلحت اور معقول مقصد کے حصول کی خاطر انجام پائے۔

مثلاً ایک ماں کا بچّے کو دُودھ پلانے اور اس کی پرورش کے لیے راتوں کو جاگنا ایک شائستہ کام ہے لیکن شراب نوشی اور غل غپاڑہ مچانے کے لیے جاگتے رہنا ایک ناپسندیدہ کام ہے۔

حلال روزی کمانے کے لیے محنت اور دوڑ دھوپ کرنا عملِ صالح ہے لیکن دوسروں پر بوجھ بننا اور ہر ایک کے آگے دستِ سوال دراز کرنا ناشائستہ کام ہے۔

اسلام میں ان کاموں کو جو فرد اور معاشرے کے لیے منفعت بخش ہوں اور لوگوں کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کے لیے مفید ہوں صالح اور شائستہ اعمال شمار کیا گیا ہے۔

کام عبادت ہے

انسان جو جائز کوششیں اور کاوشیں اپنی بسر اوقات اور ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے کرتا ہے اسلام انھیں عبادت قرار دیتا ہے۔

ایک قوی اور توانا شخص جس کا ڈیل ڈول خوبصورت تھا، بازو طاقتور تھے، پٹھے گٹھے ہوئے تھے اور بدن صحت مند اور کسرتی تھا، رسولِ اکرمؐ اور

آپ کے صحابہ کے پاس سے گزرا۔ صحابۂ کرام نے اس قوی شخص کو تعجب آمیز نگاہوں سے دیکھا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے:

"اگر یہ شخص اپنی حیران کُن قوت کو اللہ کی راہ میں اور اس ذات اقدس کی خوشنودی کے لیے کام میں لاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔"

یہ سُن کر آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

"اگر یہ شخص اپنے والدین کی ضروریاتِ زندگی مہیّا کرنے کیلیے محنت کرتا ہے تو اس کی یہ محنت اللہ کی راہ میں ہے اور اگر وہ اپنی نوعمر بیٹیوں کی حاجات رفع کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ کوشش بھی اللہ کی راہ میں ہے اور اگر وہ حلال طریقے سے اپنی بیوی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے محنت کرے تو یہ بھی خدا کی راہ میں ہے اور اگر اپنی روزی مہیّا کرنے کے لیے کام کرے تاکہ دوسروں کا دستِ نگر نہ ہو تو یہ بھی اللہ کی راہ میں ہی ہے۔"

ایک اور حدیث میں رسولِ اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اگر ایک شخص ایک رسّی لے کر پہاڑیوں میں جائے اور لکڑیاں اکٹھی کرے پھر انھیں کندھے پر اُٹھائے اور ان کے ذریعے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنی حاجات کے لیے دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرے۔"[1]

کام جہاد ہے

اسلام کے عالی مرتبت پیشواؤں نے اپنے اقوال میں کام اور محنت کی اِس

[1] صحیح بخاری

قدرتاکید فرمائی ہے کہ اس سے بڑھ کر اس موضوع پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔

امام ہشتم علی بن موسیٰ الرضا علیہ السّلام نے کام کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی افضل قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"جو شخص اپنے اور اپنے عیال کے اخراجات پورے کرنے کے لیے محنت اور کوشش کرے اور اپنی روزی اللہ تعالیٰ کے فضل سے کام اور مشقّت کی روشنی میں تلاش کرے تو اس کی جزا اور اجر اُس شخص کی جزا اور اجر سے زیادہ ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔"[1]

بیکاری سے اسلام کی جنگ

اسلام نے سُستی، کاہلی اور بیکاری سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جنگ کی ہے اور بے کاری کو انسان کی تیرہ بختی اور بدنصیبی کی وجہ قرار دیا ہے۔

امام الصّادق علیہ السّلام نے عمر بن مسلم کا حال پُوچھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس نے تو عبادت پر کمر کس لی ہے، کام اور تجارت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور اپنا تمام وقت عبادت میں گزارتا ہے۔

امام علیہ السّلام یہ سُن کر ناخوش ہوئے اور فرمایا:

"اُس پر افسوس ہے! کیا اُسے اس بات کا علم نہیں کہ جو شخص کام نہیں کرتا درگاہِ الٰہی میں اُس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔؟"

اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو جاری رکھتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

"رسولِ اکرمؐ کے کچھ صحابہ نے جب یہ آیت سُنی کہ:

"جو شخص تقویٰ اور پرہیزگاری کو اپنا پیشہ بنائے اللہ اس کے

---

[1] وسائل الشیعہ

سامنے ایک دروازہ کھول دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی مہیّا کرتا ہے جس کا اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔"[1]

تو انھوں نے کام اور محنت ترک کر دی اور اپنے سامنے دروازے بند کر لیے اور عبادت میں مشغول ہو گئے اور دل ہی دل میں کہنے لگے کہ اب ہمیں کام کاج اور کسبِ معاش کی حاجت نہیں ہے۔

جب رسولِ اکرمؐ کو ان لوگوں کے اِس عمل کی اطّلاع ملی تو آپ نے ان کی حاضری کا حکم دیا۔ جب وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا: "تم نے کام کاج کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے اور فقط عبادت پر کیوں اکتفا کرنے لگے ہو؟" انھوں نے عرض کیا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزی مہیّا کرنے کی ضمانت دی ہے لہٰذا ہم نے بھی کام کاج ترک کر دیا ہے اور عبادت میں مشغول ہو گئے ہیں۔"

آنحضرتؐ نے انھیں سرزنش کی اور فرمایا:

"جو شخص یہ روش اختیار کرے اور کام کاج سے سبکدوش ہو جائے اس کی دعا قبول نہ ہو گی۔ تم لوگوں پر لازم ہے کہ کام کرو اور اپنی روزی اللہ تعالیٰ کی مدد سے محنت اور مشقّت کے ذریعے حاصل کرو۔"

ایک اور موقع پر آنحضرتؐ نے فرمایا:

"جو غذا انسان اپنے کام اور محنت سے حاصل کرے بس وہی پاکیزہ ترین غذا ہے۔"

اگرچہ اسلام عبادت اور اللہ تعالیٰ سے لَو لگانے اور اُس کی بارگاہ میں بندگی کا اقرار کرنے کو ہر شخص کا قطعی فریضہ سمجھتا ہے جس سے اجتناب نہیں

---

[1] سورۃ الطّلاق آیات ۲، ۳

کیا جا سکتا تاہم وہ اس بات کا بھی سخت مخالف ہے کہ انسان ہر وقت عبادت میں مصروف رہے اور ضروری محنت اور مشقت ترک کر دے۔

امام علی علیہ السلام کے ثروت مند مصاحبین میں سے علاء بن زیاد حارثی نامی ایک شخص بیمار تھا۔ چنانچہ ایک دن آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کا گھر بڑا شاندار اور وسیع تھا۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

"کیا ہی اچھا ہوتا اگر تجھے ایک ایسا گھر آخرت میں میسّر ہوتا جو ہمیشہ تیرے قبضہ میں رہتا اب بھی اگر تو اُس گھر میں غریبوں اور محتاجوں کو مہمان رکھے اور اپنے اقربا کو یہاں بُلائے اور ان کی خاطر تواضع کرے اور جو حقوق اللہ تعالیٰ نے تجھ پر واجب کیے ہیں وہ ان کے حقداروں تک پہنچائے تو خدائے بزرگ و برتر تجھے آخرت میں بھی ایسا ہی گھر عنایت فرمائے گا۔"

علاء بن زیاد نے فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوئے اور امام علی علیہ السلام کے ارشادات کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے عرض کیا:

"یا امیر المومنین ع! مجھے اپنے بھائی عاصم بن زیاد کے طور طریقوں کے بارے میں آپ کے پاس شکایت کرنی ہے۔"

امام علیہ السلام نے پوچھا:

"اس نے کیا کیا ہے؟"

علاء نے جواب دیا:

"اُس نے پھٹے پُرانے کپڑے پہن لیے ہیں۔ دنیاوی کاروبار ترک کر دیا ہے اور عبادت میں مصروف ہو گیا ہے۔"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اسے میرے سامنے لاؤ۔"

جب عاصم بن زیاد پیشِ خدمت ہوا تو آپ نے اُس سے فرمایا:

"اے اپنی جان کے دشمن! شیطان نے تجھے پریشانی اور سرگردانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تو نے اپنے بیوی بچّوں پر رحم نہیں کیا اور یہ غلط راستہ اختیار کر لیا ہے۔ کیا تیرا یہ خیال ہے کہ اللہ نے اپنی پاکیزہ نعمتیں تجھ پر حلال تو کر دی ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ تُو اُن سے فائدہ اُٹھائے۔؟"

عاصم نے عرض کیا:

"میں نے موٹا جھوٹا لباس پہننے اور معمولی خوراک استعمال کرنے میں آپ کی پیروی کی ہے۔"

امامِ عالیمقامؑ نے فرمایا:

"افسوس ہے تم پر! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمھاری مانند نہیں ہوں اور میری ذمّے داریاں بھی تمھاری ذمّے داریوں کی طرح نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشواؤں اور ائمۂ برحق پر یہ بات واجب کی ہے کہ وہ اپنی زندگیاں غریب اور نادار طبقوں کی زندگیوں کے مساوی قرار دیں تاکہ افلاس اور ناداری مفلوک الحال لوگوں کو بے آرام اور پریشان حال نہ کر دیں۔" [1]

مندرجہ بالا داستان پر غور کرنے سے یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ ہر مسلمان، خواہ اس کے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں اور اگرچہ وہ مادّی نقطۂ نگاہ سے ثروت مند اور بے نیاز ہو یہ حق نہیں رکھتا کہ کام اور محنت سے ہاتھ کھینچ

---

[1] نہج البلاغہ

لے اور معاشرے میں اپنے وجود کو بے اثر بنا دے۔

پیشوایانِ اسلام کی سیرت

ہمارے گرامی قدر پیشوایانِ دین کی سیرت اور مفید کاموں میں ان کی شرکت اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور سعادت بخش دین ہے جو رُوح کی تقویت اور آخرت کی سعادت کے حصول کے علاوہ اپنے پیروؤں کو مختلف میدانوں میں محنت اور کوشش کی ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ ایک زندہ، سربلند اور آسودہ حال قوم بن سکیں۔

دینِ مسیحی اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات لوگوں کو عزلت نشینی اور رہبانیت کی دعوت دیتی ہیں اور انھیں اس امر کی جانب مائل کرتی ہیں کہ وہ دنیا سے بے اعتنائی برتیں اور اسے ترک کر دیں۔

دینِ مسیحی کا کہنا ہے کہ دنیا ایک پُل کی مانند ہے جسے عبور تو کرنا چاہیے لیکن اس پر سکونت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

اسلام ایک زندہ اور زندگی بخشنے والا دین ہے۔ وہ بنی نوعِ انسان کے جسم و جان اور ان کی دونوں جہانوں کی خوش بختی کی جانب توجّہ دیتا ہے۔

اسلام کے جلیل القدر پیغمبر حضرت محمدؐ بن عبداللہ سالہا سال تک گلّہ بانی اور تجارت میں مشغول رہے۔ امام علی علیہ السّلام کھیتی باڑی اور شجرکاری کرتے تھے۔ تمام پیشوایانِ اسلام کام کاج کرتے تھے اور مفید کاروبار سے جو کچھ حاصل ہوتا اس سے لذّت اُٹھاتے تھے۔

محمد بن مُنکدِر جس کا شمار تارک الدنیا صوفیوں میں ہوتا تھا کہتا ہے کہ ایک دن جب کہ میں مدینے کے نواح میں ایک بستی میں گیا ہوا تھا میں نے امام محمد الباقرؑ

کو دیکھا کہ اپنے دو خدمتگاروں کے کندھوں کا سہارا لیے ہوئے اور اس حالت میں کہ آپ کا پسینہ بہہ رہا تھا، کھیتی باڑی کے کام سرانجام دینے کے لیے اپنے کھیتوں کی جانب تشریف لے جا رہے تھے۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ سبحان اللہ! قریش کا ایک بزرگ اس شدید گرمی میں اس حالت میں دنیا کی طلب میں جا رہا ہے۔ مجھے چاہیئے کہ اس سے مل کر اسے نصیحت کروں۔

یہ ارادہ کر کے میں امام علیہ السّلام کے پاس گیا اور سلام کے بعد کہا:

"اس شدید گرمی میں آپ دنیا کی طلب میں جا رہے ہیں۔ اگر اس وقت آپ کی موت واقع ہو جائے تو آپ کی کیا حالت ہو گی؟"

امام عالیمقامؑ رُک گئے اور ایسے صریح اور قاطع انداز میں جس سے اسلامی تعلیمات کی عظمت مترشّح تھی مجھ سے فرمایا:

"اگر اس حالت میں میری موت واقع ہو جائے تو میں عین اس وقت دنیا سے آنکھیں بند کروں گا جب کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوں گا۔ میں اس لیے کام کرنے جا رہا ہوں کہ تمہارا اور تم جیسے دوسرے اشخاص کا محتاج نہ رہوں اور اپنے اہلِ خانہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کروں اور اگر اس حالت میں مجھے موت آ جائے تو مجھے کوئی پروا نہیں کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوں۔"

محمّد بن منکدر شرمندہ ہو گیا اور اپنے بے بنیاد اور بچگانہ اعتراض پر معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا:

"میں بزعمِ خود آپ کو صحیح مشورہ دینا چاہتا تھا لیکن آپ نے مجھے نصیحت فرمائی ہے اور ایک بہت بڑی غلط فہمی سے نجات

دلا دی ہے۔"

رسولِ اکرمؐ کے پہلے جانشین امام علی ابن ابی طالب علیہ السّلام نے اپنی پر افتخار زندگی کے دوران اپنے اقوال اور افعال سے لوگوں کو مفید کام کاج اور محنت کا سبق دیا۔

امام علیؑ کے کھیتوں کا منتظم ابی نیزر کہتا ہے کہ ایک دن آپ کھیتی باڑی کے کام کی دیکھ بھال کے سلسلے میں تشریف لائے۔ چونکہ چاشت کا وقت تھا اس لیے آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کھانا تو ہے لیکن خلیفہ کے استعمال کے قابل نہیں ہے۔ میں نے اسی کھیت سے کچھ کدّو توڑ کر پکا لیے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

"جاؤ لے آؤ۔"

پھر آپ اُٹھے اور قریب ہی ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے پر گئے اور اپنے ہاتھ دھوئے۔ پھر آپ نے تھوڑے سے پکّے ہوئے کدّو تناول فرمائے اور دوبارہ نہر کے کنارے گئے اور اپنے ہاتھ ریت سے مَل کر پانی سے دھوئے۔ پھر آپ نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا:

"لعنت ہے اس شخص پر جس کا پیٹ اُسے دوزخ کی آگ کی طرف کھینچ لے جائے۔"

پھر آپ نے کدال پکڑی اور زمین دوز نالی میں داخل ہو گئے اور اسے کھودنا شروع کر دیا۔

کچھ دیر آپ نے مشقّت کی جب تھک گئے اور پسینہ آپ کے چہرے سے بہنے لگا تو نالی سے باہر تشریف لائے۔ چہرے سے پسینہ پونچھا۔ پھر دوبارہ کدال

پکڑی اور نالی میں داخل ہو گئے۔ آپ نے کھدائی جاری رکھی حتیٰ کہ اچانک پانی پورے زور شور سے جاری ہو گیا۔ آپ تیزی سے نالی سے باہر نکل آئے اور فرمایا:

"میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس نالی کو صدقہ قرار دیا ہے تاکہ اس کی آمدنی حاجتمندوں کی بہبود کے لیے خرچ کی جائے۔"

پھر آپ نے مجھے قلم اور کاغذ لانے کے لیے فرمایا۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی اور کاغذ اور قلم آپ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے یوں تحریر فرمایا:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اس تحریر کے مطابق امیر المؤمنین علی نے دو کھیت جن کے نام "قنات ابی نیزر" اور "بغیبغہ" ہیں شہر کے مفلس اور نادار لوگوں کی بہبود کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو دَورانِ سفر ناداری اور درماندگی کا شکار ہو جائیں صدقہ قرار دیے ہیں۔

میں نے یہ کام اس غرض سے انجام دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میسّر ہو اور میں روزِ قیامت کے عذاب سے محفوظ رہوں۔

یہ دو کھیت بیع یا ہبہ نہیں کیے جا سکتے اور انھیں محتاجوں کی فلاح و بہبود کے مصرف میں لانا چاہیے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی میراث میں لے لے اور وہ بہترین وارثوں میں سے ہے۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جو شخص دنیاوی امور میں سُست اور کاہل ہو آخرت کے امُور میں وہ زیادہ کاہل ہو گا۔"

آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

"وہ شخص بہترین مسلمانوں میں سے نہیں ہے جو دنیا کی خاطر آخرت کی جانب سے آنکھیں مُوند لے یا آخرت کی خاطر دُنیا سے ہاتھ کھینچ لے بلکہ بہترین مسلمان وہ ہے جو دُنیا سے بھی بہرہ مند ہو اور آخرت سے بھی متمتع ہو۔" [1]

ان نصیحتوں کے سلسلے میں جو قوم کے دانشمندوں نے قارون کو کیں، قرآن مجید یوں ارشاد فرماتا ہے:

"ان تمام نعمتوں اور دولت کے ہوتے ہوئے جو اللہ نے تجھے عطا کی ہیں سعادتِ اُخروی کی تلاش میں رہ اور دُنیا میں جو تیرا نصیب اور حصّہ ہے اُسے بھی فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تُو بھی لوگوں پر احسان کر۔" [2]

اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے احکام میں لوگوں کو اس امر کی دعوت دی ہے کہ دُنیا اور آخرت دونوں کا لحاظ رکھّیں اور نیک کام کر کے اور ہمہ پہلو کوششیں انجام دے کر سعادتِ دارین حاصل کریں۔

دو محاذوں پر کوشش

بہت سے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر اسلام واقعی کام اور محنت کا موّید ہے اور اپنے پیروؤں کو تلاش اور کوشش کی دعوت دیتا ہے تو پھر جو روایات دنیا کی مذمّت میں وارد ہوئی ہیں ان کی کیا توجیہ اور تفسیر کی جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث اور اسلامی روایات میں دنیا کی غیر مشروط مذمّت نہیں کی گئی بلکہ ایک سلسلۂ روایات میں اُس دُنیا کی مذمّت کی گئی ہے

---

[1] حیات الحیوان [2] سورۃ القصص آیت ۷۷

جس میں اغراض کی آلائش ہو، جس کا مقصد ذاتی رُتبہ اور مقام حاصل کرنا، دوسروں پر ظلم وستم ڈھانا اور جذبات اور حقائق کو تباہ و برباد کرنا ہو۔

روایات کے ایک اور حصّے میں دنیا سے محبّت اور دلبستگی کی مذمّت کی گئی ہے اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے دل میں دنیا کی محبّت جاگزیں ہوجائے تو وہ اسے لغزشوں، گناہوں اور برائیوں کی طرف راغب کرتی ہے اور بدبختی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ دنیا کو حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھیں، اس کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھیں، دنیا سے فائدہ اٹھانے کے لیے عاقلانہ کوشش کریں۔ صحیح اور جائز طریقوں سے کام کاج کریں اور ساتھ ہی ساتھ آخرت کو بھی نہ بھلائیں تاکہ خوش نصیبی اور نیک بختی کے حقدار بن سکیں۔

گزشتہ اور موجودہ اقوام کے حالات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ کئی ایک لوگ جن کے سروں میں دنیا کے عشق کا سودا سمایا ہوا تھا جرائم، خونریزیوں، چوریوں، مظالم اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور اپنی انسانیت اور شرافت کو داغدار بنالیا۔

اسلام کہتا ہے کہ دُنیا حاصل کرنے کے لیے غلط اور غیر انسانی راستوں پر نہ چلو اور پاکیزگی اور فضیلت کی حدود سے باہر قدم نہ رکھو۔

لہٰذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام نے اس دُنیا کی زندگی کو بڑی اہمیّت دی ہے اور اس بارے میں مفصّل قواعد و ضوابط اور قوانین وضع کیے ہیں۔ اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ معاملات جو انسان کے تمام تر اجتماعی مسائل اور دنیاوی زندگی کے بارے میں اور ان کے متعلق جو بحث کی گئی ہے وہ انسانی زندگی کی تاریخ کے وسیع ترین اور اہم ترین معاشرتی حقوق سے تعلق

رکھتی ہے باوجودیکہ دُنیا کے ماہرینِ حُقوق نے معاشرتی حقوق کے سلسلے میں بیحد کاوش کی ہے اور انھیں ایک بلند مقام پر پہنچا دیا ہے تاہم وہ ابھی تک اسلامی حقوق کے رُتبے تک نہیں پہنچ پائے۔

جو قواعد وضوابط آجکل اسلامی ممالک میں قانون کی صورت رکھتے ہیں اور نافذ العمل ہیں وہ ان مباحث کا ایک فی صد بھی نہیں جو اسلامی دانشوروں اور فقہاء نے مرتّب کیے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو مواد اسلامی فقہ سے معاشرتی قانون کی شکل میں استخراج کیا گیا ہے وہ ایک یونیورسٹی کے سالہا سال کے نصاب کی نسبت سے سالِ اوّل کی ایک ابتدائی کتاب سے بھی کم ہے۔

اگر اسلام لوگوں کے اجتماعی مسائل اور دنیاوی زندگی کی شان وشوکت اور اس کے امور کی تنظیم کو کوئی اہمیّت نہ دیتا اور زندگی کو باعثِ ننگ اور ناقابلِ اعتنا سمجھتا تو پھر اتنے قوانین وضوابط کیوں وضع کرتا؟ اور اگر وہ عیسائیت کی طرح دُنیا کو ایک ایسا قابلِ نفرت مُردار لاشہ سمجھتا جس سے دُور رہنا مناسب ہوتا تو پھر کوئی قانون بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی!

معاملات کے مباحث کے علاوہ جن امور کا تعلّق لوگوں کی دنیاوی زندگی سے ہے حتّیٰ کہ عبادات کی بحث میں بھی بہت سے مادّی اور دنیاوی پہلوؤں کو مدِّنظر رکھا گیا ہے۔

عبادات میں لوگوں کے اللہ تعالیٰ کی جانب متوجّہ ہونے اور اس ذاتِ اقدس سے رابطہ قائم کرنے کے پہلو کے علاوہ کچھ اور مقاصد بھی مضمر ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلّق انسان کی دنیاوی زندگی سے ہے۔ حتّیٰ کہ نماز اور روزے میں بھی جنھیں اکثر لوگ محض عبادت اور اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، انسان کی زندگی کی بہبود کے لیے اتنے فوائد اور بھلائیاں پوشیدہ ہیں کہ اگر ہم اِس

بحث کو چھیڑنا چاہیں تو اپنے موضوع سے دُور ہو جائیں گے اور بات بہت طویل ہو جائے گی۔ اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ مُباحث میں ان تمام موضوعات کی وضاحت کی جائے گی۔

جو کچھ اُوپر بیان ہوا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے لوگوں کے دنیاوی امور کی جانب بھی خاص توجّہ مبذول کی ہے اور ان کی زندگی بہتر بنانے کے لیے جامع قواعد وضوابط مرتّب کیے ہیں۔ آخر میں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام نے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ دونوں اطراف میں کوشش کریں یعنی اپنے جسم اور روح کی ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو غلاظتوں سے محفوظ رکھیں اور اپنی دنیا کو آباد رکھیں اور آخرت کو آباد کرنے کا سامان بھی مہیّا کریں۔

اسلام کہتا ہے: کوشش کرو اور معقول اور صحیح محنت کے ذریعے دونوں جہانوں میں نیک بخت اور سعادت مند ہو جاؤ۔

کام کرنا چاہیئے لیکن ہر کام نہیں

اسلام میں بہت سے کاموں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کی وجہ وہ خرابیاں ہیں جو ان کاموں کو انجام دینے سے وجود میں آتی ہیں۔

مثلاً جوئے کے سامان کی تیاری بھی کام ہے لیکن یہ ایک ایسا کام ہے جس سے بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔

نشہ آور اشیاء کی تیاری اور ان کا بیچنا بھی کام ہے لیکن یہ ایک ایسا کام ہے جس کی تباہ کاریوں کی بنا پر اسے اسلام میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! شراب (یعنی ہر وہ چیز جو انسان کو مست کر دے اور

اس کی عقل کو زائل کر دے) اور کسی چیز کو پرستش کے لیے رکھ چھوڑنا (جیسے ظہورِ اسلام سے قبل لوگ بُتوں کو پوجتے تھے) اور فال گیری (جس قسم کی بھی ہو) سب حرام، ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔ انھیں ترک کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ تم نجات پا جاؤ۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے مابین دشمنی اور عداوت پیدا کر دے۔ کیا (ان خطرات کے پیشِ نظر) تم ان دونوں چیزوں سے ہاتھ کھینچ لو گے؟"[1]

کتنے اختلافات ہیں جو دوستوں کے درمیان جوئے کی بساط پر پیدا ہوتے ہیں، کتنی ناقابلِ اصلاح عداوتیں ہیں جو جُوئے کی خاطر جنم لیتی ہیں، کتنے اشخاص ایسے ہیں جو جوئے بازی کے نتیجے میں اپنی تمام دولت ضائع کر بیٹھتے ہیں اور کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتے ہیں، کتنے ایسے جرائم ہیں جو اس بنا پر لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں!

الکحل اور شراب سے تیّار کردہ مشروبات بہت بڑی تباہ کن بلا ہیں۔ یہ شراب خواروں کے جسم اور بدن کے مختلف اعضاء کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔ کتنے ہی جرائم ہیں جو مست لوگوں سے مستی کے عالم میں سرزد ہوتے ہیں اور کتنے ہی نقصانات ہیں جن کا خطرہ بعض لوگوں کی شراب خواری کی بنا پر معاشرے کو لاحق ہو جاتا ہے! دنیا کے دانشوروں اور محقّقین نے اس بارے میں کافی تحقیقی کام کیا ہے اور لوگوں کو شراب کے نقصانات سے آگاہ کرنے کے لیے بہت سے مقالے لکھّے ہیں۔

جُوئے اور شراب کی وجہ سے جو منحوس اثرات بنی نوعِ انسان پر مرتّب ہوتے ہیں اُن کی بنا پر اسلام نے ان چیزوں کو پلید شمار کیا ہے۔ ان کے تیّار کرنے اور بیچنے کی ممانعت کی ہے اور ان کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کام اور

---

[1] سورۃ المائدہ، آیات ۹۰، ۹۱

محنت کو اسلام میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور عبادات کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی بھی جزا ملے گی۔ بشرطیکہ وہ کام صحیح اور عاقلانہ ہو اور فرد اور معاشرے کے لیے اور لوگوں کے دین اور دنیا کے لیے مفید ہو۔

اچّھے کام

ایک نکتہ جسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اچّھے کام کی، جس کی جانب ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کئی ایک نشانیاں ہیں۔

اچّھے کام کی ایک نشانی تو وہ مختلف اعمال ہیں جو افراد بہتر زندگی گزارنے کے لیے انجام دیتے ہیں اور جتنا کام کریں اس کا معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔

اچّھے کام کی ایک اور نشانی وہ اقدامات ہیں جو افراد کو اپنے اجتماعی روابط بہتر بنانے اور مقدّس رُوحانی مقاصد حاصل کرنے کے لیے انجام دینے چاہئیں۔

اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان اور نیکی سے پیش آنا، اپنے ہم جنسوں کی بہتری کی خاطر اجتماعی خدمات انجام دینا اور اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنا اور اسی طرح کے دوسرے کام شائستہ ترین کام ہیں۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"بے شک اللہ اپنے بندوں کو عدالت، نیکوکاری اور اپنے اقربا پر مہربانی کرنے کا حکم دیتا ہے اور بُرے اور ناپسندیدہ کاموں، ظلم اور سرکشی سے منع فرماتا ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ تم نصیحت کو مانو۔" [1]

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

---

[1] سورۂ النحل۔ آیت ۹۰

"خدا کے نزدیک محبوب ترین شخص وہ ہے جس سے خلقِ خدا کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے۔"

اس سے بہتر کون سا کام ہو سکتا ہے کہ انسان کا وجود معاشرے کے لیے خیر و خدمت کا منبع ہو اور دوسرے انسان اس کے وجود سے استفادہ کریں۔

ہر معاشرے میں بہت سے ضعیف العمر، بیمار اور کمزور اشخاص ہوتے ہیں اور ہر قوم میں ایسے یتیم بچے ہوتے ہیں جن کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا۔ اس سے بہتر اور کون سا کام ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے کام کے اوقات میں کچھ وقت کا اضافہ کر دے اور اس زائد وقت میں جو کچھ کما سکے اسے ایک لاوارث بچے یا ایک بیمار یا مفلوک الحال شخص کے لیے مخصوص کر دے۔

یہ نیکیاں اور خدمات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انسان کے محبوب ہونے کا موجب بنتی ہیں۔ اس کا ضمیر بھی مطمئن رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اسے دنیا اور آخرت میں اس کی نیکیوں کا اجر دیتا ہے۔

امام الصادق علیہ السلام نے فرمایا:

"جو لوگ احسان کے قابل ہوں اور جو اس کے قابل نہ ہوں اُن سے احسان کرو۔ اگر وہ احسان کے قابل نہیں ہیں تو تمھیں اس کے قابل ہونا چاہیے۔"[1]

امام الباقر علیہ السلام نے فرمایا:

"اگر میں مسلمانوں کے ایک خاندان کی سرپرستی کروں، ان کی غذا اور لباس کا انتظام کروں اور معاشرے میں ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کروں تو میں اسے ستر مستحبی حج بجا لانے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"[2]

---

[1]، [2] الکافی طرائف الحکم

ہر شخص کی زندگی میں کچھ وقت فرصت اور فراغت کا بھی ہوتا ہے اور اس وقت کو گزارنے کے لیے لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ اس قیمتی وقت کو بیکار یا نقصان دہ کام انجام دینے میں ضائع کر دیتے ہیں حالانکہ وہ بہت سے مفید اقدامات کر سکتے ہیں اور اس فرصت کے وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہمارے سینکڑوں ایسے ہم جنس ہسپتالوں میں داخل ہیں جن کے بدن کمزور اور روحیں غمگین ہیں۔ انھیں دلجوئی اور غمخواری کی ضرورت ہے۔ ان میں کچھ ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جنھیں مالی امداد کی حاجت ہو۔

اگر ہم اپنی سلامتی اور تندرستی کے لیے شکرانے کے طور پر اپنی فرصت کے اوقات میں بیماروں کی عیادت کریں اور کچھ دیر کے لیے ان کا دکھ سنیں، ان سے ہمدردی کا اظہار کریں اور اگر بن پڑے تو ان کی خدمت اور مدد کریں تو ہم ایک ایسا انسانی فعل انجام دیں گے جو دونوں جہانوں میں ہماری فلاح اور نیک بختی کا موجب ہوگا۔

بحث کا خاتمہ اور مشاہیر کے اقوال

۱ - اگر تمھیں یہ یقین نہ ہو کہ تم نے جو کام کیا ہے وہ معاشرے کے لیے فائدہ مند ہے تو پھر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم نے کوئی اچھا کام انجام دیا ہے۔
(ٹالسٹائی)

۲ - زندگی کی قیمت تین چیزیں ہیں: ارادہ، کام اور کامیابی۔ (پاسچر)

۳ - خوشی اس کے لیے ہے جو دوسروں کی خوشی کے لیے کام کرے۔
(اشتور گاتھا)

۴ - نیکوکار لوگوں کے علاوہ کوئی شخص نیک بخت نہیں ہے۔ (سیسرون)

۵ - ذہانت کا ۹۹ فی صد پیشانی کا پسینہ ہے اور ایک فی صد روح کا الہام ہے۔
(ایڈیسن)

۶ - کام خوش نصیبی کا سرمایہ ہے۔ (سقراط)

۷ - کام جسم اور روح کا بہترین دوست ہے۔ (گلیلیو)

۸ - بڑے لوگ اپنے کام کے علاوہ کسی چیز پر اعتماد نہیں کرتے اور کسی سے مدد نہیں مانگتے۔ (کنفیوشس)

۹ - کام اور محنت مقاصد حاصل کرنے کا وسیلہ اور سیدھا راستہ ہے۔
(ڈاکٹر گرلینگ)

۱۰ - کام اور محنت فقط ہماری زندگی کو بہتر اور آسان ہی نہیں بناتی بلکہ انسان کو باوقار اور بزرگ بنا کر پیش کرتی ہے۔ (شیلر)

۱۱ - ہم اس لیے وجود میں آئے ہیں کہ دوسروں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں۔
(المکبس)

۱۲ - کامیابی ان کے لیے ہے جو دوسروں سے زیادہ مستقل مزاج ہوں۔
(نپولین)

۱۳ - میری ترقی کا راز دو الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کام اور ایمان۔
(ایڈیسن)

۱۴ - انسان جتنا زیادہ کام کرے گا اتنا ہی اور زیادہ کام کرنے پر قادر ہوگا۔
(ولیم جیمز)

۱۵ - کام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دن کو چھوٹا اور عمر کو لمبا کرتا ہے۔
(ڈیڈرو)

۱۶ - انسان جتنا زیادہ کام کرتا ہے اُتنا ہی خوش نصیبی کی منزل سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ (سیسرون)

۱۷ - ایک گھنٹے کا کام کاج ایک مہینہ تہمتیں لگانے اور غیبت کرنے کے مقابلے میں دل کو زیادہ تسلّی دیتا ہے اور جیب کو دولت سے بھر دیتا ہے۔
(بنجمن فرینکلن)

۱۸ - میں کام کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ اگر میں کام نہ کروں تو میرے اخلاق فاسد ہو جائیں گے۔ (ٹالسٹائی)

۱۹ - بے وقوفوں کو زیادہ کام اور مشقّت کے ذریعے سدھایا جاسکتا ہے۔

(بزرجمہر)

۲۰ - جس طرح مرد اپنی شخصیّت کو عامۃ النّاس اور معاشرے میں اُجاگر کرتے ہیں اسی طرح عورتیں گھر کی چار دیواری میں بچّوں کی پرورش کرکے اور گھر کے دوسرے فرائض انجام دے کر اپنی شخصیّت کا لوہا منوا سکتی ہیں۔
(بلزاک)

اسلام میں علم کا مقام

جن مسائل کو اسلام میں بے حد اہمیت دی گئی ہے اور جن کے بارے میں بہت زیادہ تاکید اور سفارش کی گئی ہے ان میں سے ایک مسئلہ علم و دانش کا ہے۔

حصولِ علم کو اسلامی فرائض اور دینی واجبات میں شمار کیا گیا ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس کتاب میں "علم و دانش" کے عنوان کے تحت اسلام کی تبلیغ کریں اور قرآن مجید، روایات اور تاریخِ اسلام سے مطالب نقل کریں اور کہیں کہ اسلام نے یوں علم کی تائید کی ہے اور لوگوں کو اس کے حصول کی ترغیب دلائی ہے۔

نہیں، ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور پھر یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ مسئلہ کسی سے پوشیدہ ہو۔ نیز اس سلسلے میں اتنا کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اس کی تکرار کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں اس قسم کے مطالب بیان کرنا اور لکھنا بھی دکھ کی دوا نہیں ہے کیونکہ صدیوں کی تقاریر اور تحریروں کے باوجود مسلمانوں کی موجودہ حالت ایسی ہے جیسی کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔

علامۂ فقید مرحوم شرف الدین عاملی نے جو ایک بے مثل عالم اور لبنانی شیعوں کے بے نظیر پیشوا تھے سالہا سال تک تکالیف برداشت کیں اور اہلِ تشیّع اور امامیہ دانشوروں کو متعارف کرانے کے لیے بڑی قیمتی اور مفید کتابیں لکھ کر شائع کیں لیکن جب یہ سب تکالیف اٹھا کر اور صعوبتیں برداشت کر کے انھوں نے لبنان کے شیعوں کی ناگفتہ بہ حالت پر نظر ڈالی تو انھیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ لوگ بہت ہی گھٹیا سطح پر ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ لبنان کی آبادی کے مختلف طبقات میں سے سب سے زیادہ نادار، مفلوک الحال اور پسماندہ طبقہ شیعہ ہی ہیں۔ ان میں کوئی ڈاکٹر، انجینیئر، پروفیسر یا دوسرے گرامی قدر لوگ نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ قابلِ توجہ نہیں۔ البتہ قُلی، حجّام، حمّامی اور خاکروب کے پیشے اہلِ تشیّع نے اپنا رکھے ہیں۔ ان بزرگوار نے یہ حالات دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا کہ شیعہ طبقے کی اس پسماندگی اور مفلوک الحالی کے پیشِ نظر میری تصانیف کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ جو لوگ میری کتابیں پڑھیں گے اور ساتھ ہی ساتھ شیعوں کی حالت دیکھیں گے وہ تو کہیں گے کہ اگر شیعہ مذہب ایک مفید اور نجات بخش مکتبِ فکر ہوتا تو ضروری تھا کہ اس مکتب کے پیروؤں کی حالت بھی بہتر اور زیادہ آبرومندانہ ہوتی۔

اس غور و فکر کے نتیجے میں ان بزرگوار نے کمرِ ہمت کس لی اور فیصلہ کیا کہ وہ عملاً شیعوں کی حالت بہتر بنائیں گے اور ایک بنیادی اور ہمہ پہلو انقلاب برپا کر دیں گے۔

انھوں نے بہت سی رفاہی انجمنیں اور اسکول قائم کیے اور اپنے حامیوں کی بھرپور امداد کے ذریعے اس قابل ہو گئے کہ لبنان کے شیعوں کے حالات بہتر بنائیں اور انھیں جہالت اور پسماندگی سے نجات دلائیں۔

بلا شُبہ یہ بڑی تعجب خیز بات ہے کہ ہم مسلمانوں نے فقط باتوں پر اکتفا کیا اور علم و دانش کی راہ پر چلنے سے باز رہے۔

امام علی علیہ السّلام نے اپنے آخری وصیت نامے میں تمام مسلمانانِ عالم کو خبردار کیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر (یعنی غیر مسلم) قرآنِ مجید کی اعلیٰ و ارفع تعلیمات پر عمل درآمد کے معاملے میں تم پر سبقت لے جائیں اور تم پیچھے رہ جاؤ۔ [1]

فرانسیسی دانشور ڈاکٹر گوسٹاولوبون یوں رقمطراز ہے :

"جس زمانے میں اسلامی تمدّن اُندلس میں اوجِ کمال پر تھا ہمارے علمی مراکز ان قلعوں سے عبارت تھے جن میں ہمارے امراء اور رؤسا نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے اَن پڑھ ہونے پر فخر کرتے تھے ہم عیسائیوں میں سب سے زیادہ علم والے وہ نادان راہب تھے جو اپنی تمام عمریں اس کام پر صرف کر دیتے تھے کہ گرجوں اور خانقاہوں سے یونان اور روم کی کتابیں نکالیں، ان کی تحریریں مٹا دیں اور اسکی بجائے ان اوراق پر مذہبی کلمات اور اوراد پر مبنی چیزیں لکھ دیں۔"

وِل ڈیورنٹ (Will Durant) اپنی کتاب "تاریخِ تمدّن" (History of Civilization) میں لکھتا ہے :

"قرونِ وسطیٰ میں مسلمان علوم کے میدان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مراکش اور آذربائیجان میں ریاضیات کے شعبے میں بے حد ترقّی ہوئی جس سے ایک دفعہ پھر اسلامی تمدّن کا کمال واضح ہو گیا۔ نباتیات کا علم جسے تھیوفراسٹس (Theophrastus) کے بعد بھلا دیا گیا تھا مسلمانوں کے ذریعے ایک دفعہ پھر زندہ ہو گیا۔ ادریسی نے نباتیات پر ایک

---

[1] نہج البلاغہ

کتاب لکھی اور ۳۶۰ جڑی بوٹیوں کے خواص بیان کیئے۔ اس کی توجہ صرف طبی مسائل تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اُس نے سائنس اور نباتیات کے بارے میں بھی بحث کی ہے۔

دوسرے ادوار کی طرح اس دَور میں بھی ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے بڑے طبیب مسلمان ہی تھے۔

ہسپتالوں کی تعمیر اور ان کے لیے ضروری سازوسامان مہیا کرنے میں بھی مسلمانوں نے اہلِ دنیا کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ جو ہسپتال نورالدین نے ۵۵۶ ہجری بمطابق ۱۱۶۰ میلادی میں تعمیر کرایا اس میں تین سو سال تک تمام مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا اور ادویات بھی بلامعاوضہ فراہم کی جاتی تھیں۔ تمام بڑے بڑے اسلامی شہروں میں دیوانوں کی دیکھ بھال کے لیے پاگل خانے موجود تھے۔"

جس زمانے میں یورپ اور عیسائیت جہالت اور نادانی کی آگ میں جل رہے تھے مسلمان ایک ایسے عالیشان تمدّن کے مالک تھے جس کی محض ایک جھلک مؤرّخین نے ہمیں دکھائی ہے۔

بلاشبہ جو تمدّن مسلمانوں کو میسّر آیا وہ اسلام کی تعلیمات کی بدولت تھا کیونکہ اسلام سے پہلے وہ بھی جہالت اور فساد میں غرق تھے اور تواریخ سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ وہ کتنی بُری زندگی گزار رہے تھے۔

اسلام ایک وسیع اور جچے تُلے لائحۂ عمل اور مفید اور نجات بخش تعلیمات کے ساتھ آیا۔ اس نے اس فاسد اور غلیظ معاشرے کو قدم بقدم نیک بختی کی جانب چلایا اور جاہل اور پسماندہ افراد سے ایک عالم اور ترقی یافتہ ملّت کی تشکیل کی۔

تحصیلِ علم کے لیے اسلام نے کوئی قید یا شرط قبول نہیں کی اور اسے تمام

اشخاص کے لیے (خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد) عُمر کے تمام ادوار میں، ہر مقام پر اور ہر اُستاد کے ذریعے جو میسّر ہو، واجب اور لازم قرار دیا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ آنحضرتؐ سے نقل کی گئی مندرجہ ذیل چار مختصر احادیث سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے:

۱۔ طَلَبُ العِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔

"علم و دانش حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔"

اس جملے میں ایسی کوئی قید اور استثنا نظر نہیں آتی جیسی کہ اسلام کے بہت سے دوسرے احکام میں وجود رکھتی ہے اور اس میں مرد اور عورت کے مابین کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ لفظ 'مسلم' کے معنی 'مسلمان' کے ہیں خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ مندرجہ بالا حدیث میں رسولِ اکرمؐ نے اہلِ عالم پر واضح کر دیا ہے کہ علم ایک لازمی وظیفہ اور عمومی فریضہ ہے اور کسی معین طبقے یا خاص جنس سے مخصوص نہیں ہے۔

۲۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ۔

"گہوارے سے قبر تک (ولادت سے موت تک) علم و دانش کی طلب کرو۔"

اس فرمان میں موسم اور وقت کی قید اُٹھا دی گئی ہے اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ علم و دانش کے حصول کے لیے کوئی موسم یا وقت مقرّر نہیں۔ اس کی ابتدا دُنیا میں آنکھ کھولنے پر ہوتی ہے اور خاتمہ انسانی زندگی کے خاتمے پر ہوتا ہے۔

۳۔ اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ اَيْنَمَا وَجَدَهَا اَخَذَهَا

"حِکمت مومن کا گمشدہ مال ہے اور جس کی چیز گم ہو جائے اُسے وہ جہاں بھی ملے اس کو اُٹھا سکتا ہے۔"

حکمت مستحکم، معقول اور درست باتوں سے عبارت ہے۔

اس حدیث میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کو اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ حکمت اور علم کس جگہ سے دستیاب ہے حتیٰ کہ اگر مشرکوں اور منافقوں سے بھی علم کا حصول ممکن ہو تو اسے حاصل کرنا چاہیے۔

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں لفظ "حکمت" استعمال ہوا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ درست اور معقول بات جو شخص بھی کہے اسے قبول کر لینا چاہیے لیکن شرط یہ ہے کہ اس بات کے درست ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو لہٰذا جو لوگ درست اور غلط باتوں میں تمیز کرنے کی اہلیّت نہ رکھتے ہوں انھیں ہر ایک کی بات سُن کر پلّے نہیں باندھ لینی چاہیے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے اشخاص کا اثر اور تلقین قبول نہ کریں جو انھیں گمراہ کر دیں۔

۴۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ

"علم سیکھو خواہ وہ چین ہی سے حاصل کرو۔"

اس حکم میں جگہ کی قید اُڑا دی گئی ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ علم خواہ دُنیا کے دُور دراز حصّوں میں ہی کیوں نہ دستیاب ہو اور اس کے حصُول کے لیے کتنا ہی وقت کیوں نہ صرف ہو اور کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اُٹھانی پڑے انسان کے لیے لازم ہے کہ اسے حاصل کرے۔

اوپر نقل کیے گئے چار جملوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے زندگی کے ہر دَور میں وہ جہاں کہیں بھی ہو علم و دانش کے حصُول کی جستجو ضروری ہے اور یہ امر ایک دینی فریضہ ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ علم و دانش کے حصُول کے سلسلے میں اسلام کے ارشادات کا نمونہ ہے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا ہمارا مقصد اس موضوع پر اسلام کے احکامات گنوانا نہیں ہے۔ صدرِ اسلام کے مسلمانوں نے صدیوں

تک ان مقدس تعلیمات پر عمل کیا اور نتیجے کے طور پر تمام اقوامِ عالم میں سرفراز رہے۔
مسلمانوں میں بہت بڑے طبیب، گرامی قدر کیمیا داں، جغرافیہ داں، ماہرینِ فلکیات اور علم و فن کے دوسرے شعبوں میں مہارت رکھنے والی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کا ذکر ہم اشارتاً پہلے کرچکے ہیں۔ جو حضرات زیادہ تفصیل کے خواہشمند ہوں انھیں چاہیئے کہ تاریخ تمدن از جرجی زیدان، تاریخ تمدن از وِل ڈیورنٹ، تمدنِ اسلام و عرب از گوسٹاولوبون اور فہرست ابنِ ندیم جیسی کتابوں سے رجوع کریں۔
جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے انھیں مدِّ نظر رکھتے ہوئے کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ گو مسلمانوں کو نجات بخش دینی تعلیمات میسّر ہیں، ان کا تاریخی ماضی بے حد درخشاں ہے اور ان میں عظیم اور قابل علمی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں پھر بھی وہ خوابِ غفلت میں ڈوب جائیں حتیٰ کہ مدارجِ علمی سے قطع نظر ان کی اکثریت لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو اور ہر معاملے میں ان کا دستِ سوال اسلام کے دشمنوں کی جانب دراز رہے! اِس سلسلے میں قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی غفلت اور استعمار پسند عیسائیوں کی تخریب کاری اس بدبختی اور کم نصیبی کے دو بنیادی عوامل ہیں۔

وِل ڈیورنٹ کہتا ہے:

"مسیحی کلیساؤں کے بلند و بالا مینار اور ناقوس گاڑنے کے برج زیادہ تر مساجد کے میناروں کے مرہونِ منّت ہیں۔ اٹلی اور فرانس میں کوزہ گری کا فن بارھویں صدی میں مسلمان کوزہ گروں کے ان دو ممالک میں منتقل ہونے کے باعث نئے سرے سے پھلا پھولا اور یہ اطالوی کوزہ گروں کے اسلامی اندلس میں چلے جانے کا نتیجہ بھی تھا۔ اٹلی کے آہنگروں، شیشہ سازوں، جلد سازوں، ہسپانیہ کے زرہ بافوں اور اسلحہ سازوں نے بھی اپنے ہنر مسلمان کاریگروں سے

حاصل کیے۔

یورپ کے تقریباً تمام خطّوں کے جولاہے، نمونے اور نقشے حاصل کرنے کے لیے مسلمان ممالک سے رجوع کرتے تھے۔ حتّیٰ کہ باغ بھی زیادہ تر ایرانی باغات کے نمونے پر تھے۔

(اسلام اور مسلمانوں کا یورپی ممالک میں) یہ اثر و نفوذ تاجروں، صلیبی جنگوں، ہزاروں کتابوں کے عربی سے لاطینی میں ترجمے اور گربرٹ (Gerbert)، مائیکل اسکاٹ (Micaelscot) اور ایڈیلیڈ باتھ (Adelad Bath) جیسے دانشوروں کے اسلامی اندلس میں سفر کرنے کی بدولت انجام پایا۔ اس کا ایک اور ذریعہ وہ عیسائی جوان بھی تھے جنھیں ان کے ہسپانوی بزرگ تربیت حاصل کرنے اور شہسواری کے طور طریقے سیکھنے کے لیے مسلمان امراء کے درباروں میں بھیجتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض مسلمان امراء شہسوار اور بزرگ خیال کیے جاتے تھے۔

شام، مصر، سسلی اور ہسپانیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین مستقل روابط قائم تھے۔ مسلمانوں کی ہسپانوی قلمرو میں جو عیسائی پیشرفت کرتے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی ادبیات، علوم، فلسفہ اور ہنر کی ایک لہر عیسائی ممالک میں منتقل ہو جاتی تھی۔

نمونے کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۴۷۸ھ ہجری بمطابق ۱۰۸۰ء میلادی میں طلیطلہ پر عیسائیوں کے تسلّط کے نتیجے میں ان کی فلکیات کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا اور زمین کے مدوّر ہونے کے متعلق ان کا اعتقاد پختہ ہو گیا۔

تاہم جو کچھ بھی عیسائیوں نے مسلمانوں سے اخذ کیا اس نے عناد اور کینہ کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کو روٹی کے بعد دینی عقائد سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔ انسان فقط روٹی پر زندہ نہیں رہتا بلکہ زندہ رہنے

کے لیے اسے ایمان کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اُس کے دل میں امّید کی کرن روشن کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جو چیز انسان کی خوراک یا عقیدے کو خطرے میں ڈال دے اس کے خلاف اس کا جی جل اُٹھتا ہے۔ عیسائی تین صدیوں سے مسلمانوں کے مسلسل اور لامتناہی حملوں کا شکار تھے جو یکے بعد دیگرے انھیں اپنی گرفت میں لے رہے تھے اور عیسائی اقوام کو بتدریج اپنی حکومت کے زیر اثر لا رہے تھے۔ مسلمانوں کے مضبوط ہاتھوں نے عیسائیوں کی تجارت پر قبضہ کر لیا تھا اور عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ وہ عیسائیوں کو کافر گردانتے ہیں۔

بالآخر جس معرکے کا انتظار تھا وہ وقوع پذیر ہو گیا اور دو تمدّن، صلیبی جنگوں میں آپس میں متصادم ہو گئے اور مشرق و مغرب کے منتخب افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ متبادل دشمنی قرونِ وسطیٰ کی تمام تر تاریخ میں ایک مؤثر عامل تھی۔ ایک تیسرے دین یعنی دینِ یہود کو بر سرِ پیکار دونوں فریقوں کی ضربات سہنی پڑتی تھیں۔ سرزمینِ مغرب صلیبی جنگیں تو ہار گئی لیکن مذاہب کی کشمکش میں کامیاب رہی۔ تمام مسیحی جنگجوؤں کو ارضِ مقدّس سے نکال دیا گیا لیکن مسلمانوں کے لیے جن کا خون اس دیر سے حاصل ہونے والی فتح نے چُوس لیا تھا اور جن کے ممالک کو منگولوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا تاریکی کا دور شروع ہو گیا اور جہالت اور ناداری ان پر مسلّط ہو گئی۔ اس کے برعکس شکست خوردہ سرزمینِ مغرب نے جسے مسلسل کاوشوں سے کافی تجربہ حاصل ہو گیا تھا شکستوں کو بھلا دیا، دشمنوں سے عِلم کی پیاس اور ترقّی کا شوق سیکھا، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے بلند و بالا گرجے تعمیر کیے اور شاہراہِ علم و دانش پر گامزن ہو گئی۔

درحقیقت ایک عام قاری اسلامی تمدّن کے بارے میں اس طویل گفتگو سے حیران رہ جاتا ہے لیکن ایک محقّق عالِم اس کے بے موقع اختصار پر افسوس کرتا ہے۔

ایک معاشرے کی تاریخ کے فقط سنہری ادوار میں ہی یہ ممکن ہے کہ وہ ایک قلیل مدّت میں سیاست، تعلیم، ادبیات، جغرافیہ، تاریخ، ریاضیات، ہیئت، کیمیا، فلسفہ اور طب وغیرہ کے شعبوں میں ان معروف شخصیّتوں کو جنم دے جو ہارون الرشید سے لے کر ابنِ رشد تک اسلام کی چار صدیوں میں پیدا ہوئی ہیں......"[1]

یہ ہے مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ اور ان کا تمدّن، یہ ہے ان کا انحطاط اور پسماندگی اور یہ ہیں اس کے اسباب اور عوامل۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ فقط یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ کا لکھنا اور پڑھنا اور ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کا پڑھنا اور اس موضوع پر اخبار اور احادیث کا ورد کرنا مشکلات کا حل نہیں بلکہ چاہیے یہ کہ ان مقدّس اقوال پر عملدر آمد کیا جائے اور مسلمانوں میں علم اور کمال حاصل کرنے کے لیے جذب و جوش پیدا ہو تاکہ وہ بھی اسی طرح کامیاب اور کامران ہوں جیسے کہ متمدّن ممالک اپنے دانشمندوں کی اَن تھک کوششوں کی بدولت سربلندی اور ترقّی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

ایڈیسن حیرت انگیز مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے سائنسی مشاغل اور تجربات میں مصروف رہتا تھا۔ وہ بعض اوقات دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے کام میں گزارتا تھا اور اکثر کہتا تھا:

"میرے پاس کام زیادہ ہے اور عمر تھوڑی ہے لہٰذا مجھے جلدی کرنی چاہیے"

تجربات کے سلسلے میں اسے بہت سی تکالیف اور صدمات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بیٹری کا تیزاب اس کے چہرے پر گر گیا اور اس کا نیا لباس اور بدن کی کھال جلادی۔

---

[1] تاریخ تمدّن - ول ڈیورنٹ

کئی دفعہ وہ بجلی کی لپیٹ میں آگیا جس نے اسے جھٹکے دیے اور زخمی کر دیا۔ ایڈیسن روزانہ انیس بیس گھنٹے کام کرتا تھا اور رات کو اس کا آرام فقط ایک مختصر سی جھپکی سے عبارت تھا جو وہ کارخانے کے ایک اسٹول پر لیا کرتا تھا۔

دراصل ایڈیسن کی آدھی صدی پر محیط زندگی سراسر اسی انداز سے گزری۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دن تک کام اور محنت ترک نہیں کی۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں علم سے مراد فقط علمِ دین اور مبدا، اور معاد (قیامت) کی معرفت اور انفرادی اور اجتماعی وظائف اور عبادات وغیرہ ہے حالانکہ کلمہ 'علم' اکثر مواقع پر بطور مطلق استعمال ہوا ہے اور اس پر کوئی شرط عائد نہیں کی گئی۔

علاوہ ازیں اسلامی معاشرے کے بارے میں اسلام کے منتہائے مقصود کو مدِنظر رکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ 'علم' فقط ایک علم تک محدود نہیں ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ تمام مسلمان ارجمند، آزاد اور بے نیاز ہوں۔

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان معاشی اور معاشرتی طور پر آزاد ہوں۔

اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمان تمام مادّی اور رُوحانی معاملات میں دوسری اقوامِ عالم سے برتر ہوں۔

یہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے میں مختلف علوم و فنون پر دسترس رکھنے والے ممتاز دانشمند موجود ہوں اور ہر شعبے میں ماہرینِ خصوصی اپنے فرائض انجام دیں۔

اگر معاشیات، زراعت، طب، صنعت اور دورِ حاضر کے دوسرے علوم و

فنون کے میدان میں ہمارے پاس ماہرین نہ ہوں تو ہم لیقیناً دوسروں کے محتاج رہیں گے اور یہ صورتِ حال اسلام کے مقاصد کے قطعاً خلاف ہے۔

لہٰذا ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہر شخص خواہ اس کی حیثیت اور مقام کچھ ہی کیوں نہ ہو علم و دانش پھیلانے کے لیے کوشش کرے اور وہ جو کچھ جانتا ہو دوسروں کو بھی سکھائے۔ اپنا علم، مقالات اور کتابیں لکھ کر اور مجالسِ مذاکرہ اور کانفرنسیں تشکیل دے کر دوسروں کو منتقل کرے۔ جو مفید کتابیں دوسری زبانوں میں لکھی گئی ہوں انھیں اپنی زبان میں ترجمہ کرے۔ نوجوانوں کو علم و دانش کے حصول کی جانب راغب کرے انھیں اپنی تعلیم جاری رکھنے اور ترقّی کے مدارج طے کرنے کی تلقین کرے۔ لائبریریاں اور علمی مراکز قائم کر کے نوجوانوں کا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچائے اور مفید کتابیں خرید کر بلا معاوضہ طالبانِ علم کو مہیّا کرے وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی ضروری ہے کہ علم کی ترویج اور توسیع کا یہ مقدّس فریضہ ایک اس سے بھی زیادہ مقدّس فریضے یعنی معاشرے میں ایمان کی تقویت اور اچھے اخلاق کی ترویج سے مخلوط ہو۔

یہ لازم ہے کہ علمی ترقّی کے پہلو بہ پہلو روحانی اور اخلاقی اُصول بھی تقویت پکڑیں تاکہ واضح اور مفید نتائج حاصل ہوں اور علم کو معاشرے کی خوشحالی کے لیے استعمال کیا جاسکے ورنہ روحانیّت کے بغیر علم ایسا ہی ہوگا جیسے کہ ایک مست زنگی کے ہاتھ میں تلوار دے دی جائے۔

دانشمندوں کی تعریف

مسجد کے دو کونوں میں دو گروہ حلقے بنائے بیٹھے تھے۔ رسولِ اکرمؐ دروازے سے اندر تشریف لائے۔ ہر جانب نگاہ دوڑائی اور پھر دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کیا کر

رہے ہیں؟

جواب میں عرض کیا گیا کہ ان میں سے ایک گروہ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہے اور اوراد اور دعاؤں کی تلاوت کر رہا ہے اور دوسرا علمی مذاکرات میں مشغول ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ دونوں گروہ نیک اور مبارک کاموں میں مصروف ہیں لیکن ہم اس گروہ میں شامل ہوں گے جو علمی مذاکرات کر رہا ہے کیونکہ ہمیں اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ لوگوں کو علم اور کمال کا شوق دلائیں۔ بعد ازاں آپ اُس گروہ میں شامل ہو گئے اور ان کی محفل میں تشریف فرما ہوئے۔ [1]

امام الصّادق علیہ السّلام نے ایک ایسی مجلس میں جس میں آپ کے بزرگ اور معمّر اصحاب موجود تھے ہشّام بن حکم کی جو کہ سب سے زیادہ نو عمر تھا بہت عزّت افزائی فرمائی اور اسے سب سے بلند تر مقام پر بٹھایا۔ [2] اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک عالمِ جوان، قوی اور با اثر مقرّر اور اسلام کا مخلص اور درد مند خدمت گزار تھا۔

علماء اور دانشوروں کی عزّت افزائی اور احترام دوسروں کو علم و دانش کی طرف مائل کرنے کا ایک بہترین طریقہ ہے اور یہ روش ہمیشہ اسلام کے گرامی قدر پیشواؤں کی توجّہ کا مورد رہی ہے۔

عِلم کے خلاف جنگ

عیسائی استعمار پسندوں نے اپنے کارندوں اور ایجنٹوں کے ذریعے مسلمانوں کے جوان اور روشن خیال طبقوں کے درمیان یہ راگ الاپنا شروع کر دیا ہے کہ مسلمان ممالک کی پسماندگی کی وجہ ان کا مذہب ہے اور اگر وہ اس پسماندگی سے نجات حاصل کرنا چاہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے آپ کو مذہب

[1] منیۃ المرید [2] بحار الانوار جلد چہارم

کی قید سے آزاد کرلیں تاکہ جس طرح عیسائیوں نے دینِ مسیحی سے رہائی حاصل کرکے بے پناہ ترقی کی ہے اسی طرح وہ (یعنی مسلمان) بھی متمدن قوموں کی مانند ترقی کرسکیں۔

ان لوگوں نے یہ مغالطہ اور خلطِ مبحث جان بوجھ کر پیدا کیا ہے تاکہ وہ مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کرکے اسلامی ممالک کا زیادہ وسیع پیمانے پر استحصال کرسکیں اور مسلمانوں کو پسماندہ ہی رکھیں۔

یہ صحیح ہے کہ عیسائیوں نے جو پیشرفت کی وہ کلیسا کے بندھن توڑ کر ہی کی اور پادریوں کے خود ساختہ مذہبی قواعد وضوابط کو ٹھکرا کر ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے لیکن کلیسا کی خرافات کا مقابلہ اسلام کے جاودانی قواعد اور احکامات سے کرنا ایک بہت بڑا مغالطہ اور غیر انسانی ظلم ہے۔

کلیسا نے عیسائی پادریوں کے گھڑے ہوئے بچکانہ قوانین کے ذریعے علم اور فن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردیں اور دانشمندوں اور محققین پر بے پناہ سختیاں کیں۔ اس نے چند برائے نام علمی افکار اور نظریات کے مجموعے پر مقدس آسمانی قوانین کی مُہر لگا کر یورپی معاشرے پر ٹھونس دیا اور جب سائنس نے یہ ثابت کردیا کہ کلیسا کے خیالات غلط ہیں تو لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ وہ کلیسا اور اس کے قوانین سے بیزار اور برگشتہ ہوجائیں اور اپنے آپ کو پادریوں کے جوے سے آزاد کرکے علم و دانش پر ایمان لے آئیں۔ اس دوران میں جو چیز کلیسا اور اس کے دین کے سقوط میں معاون ثابت ہوئی وہ پیشوایانِ کلیسا کا اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور حیثیت کی بحالی پر اصرار تھا۔

ان کا یہ اصرار اس حد تک جا پہنچا کہ وہ اپنے نظریات پر عملدر آمد کرانے کے لیے آمریت اور جبر کی جانب مائل ہوگئے۔ وہ ایک خوفناک عفریت کی طرح لوگوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوگئے اور ان کی آسائش اور آرام سلب کرلیا۔

کلیسا کے پیشواؤں کے احکام کے مطابق تحقیقات کے خطرناک ادارے "ادارۂ تفتیش عقائد" کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ادارہ کلیسا کے نظریات کے مخالفین پر بے حد سختی کرتا تھا اور علماء اور دانشمندوں کو سزائیں دیتا تھا۔ کچھ دانشمندوں کو محض اس جُرم کی پاداش میں آدم سوز بھٹیوں میں ڈال کر جلا دیا گیا کہ وہ زمین کے مدوّر ہونے اور حرکت کرنے کے قائل ہو گئے تھے اور اس طرح ایک حقیقت کا انکشاف کیا تھا۔

یہ تشدّد اس حد تک پہنچ گیا کہ تمام روشن خیال لوگوں نے اس امر کو اپنا فریضہ سمجھ لیا کہ اس ظالم دیو کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اس کی سرکوبی کے لیے اپنی قوّتوں کو کام میں لائیں تاکہ کلیسا ہمیشہ کے لیے مقابلے کے میدان سے خارج ہو جائے اور اس کی قوّت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

روشن خیال لوگوں، محقّقین، دانشمندوں اور دوسرے تمام ترقّی پسند اور وسیع النّظر اشخاص کے ساتھ کلیسا کا یہ سلوک تھا۔

ظاہر ہے کہ یورپ کی ترقّی اور کامیابی کا راز اس ادارے کی قید سے آزادی اور نجات میں پوشیدہ تھا جس نے دین اور آسمانی قوانین کے نام پر علمی ترقّی کا راستہ روک رکھّا تھا۔

تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے ان کے درمیان ایسے غم انگیز حوادث بطور نمونہ بھی دیکھنے میں نہیں آتے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اسلام محض علم و دانش کا موّید ہی نہیں بلکہ لوگوں کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتا ہے اور ان کی پشت پناہی کرتا ہے۔

لہٰذا یہ خیال کہ مذہب قوموں کی ترقّی میں مانع ہے کلیسائی مذہب کے بارے

میں تو درست ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ کہنا ایک بہت بڑی دشمنی ہے جو ہمارے دشمن، مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کر رہے ہیں تاکہ ہمیں لاپروا اور سرکش بنا کر اپنے استعمار پسندانہ مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔

ان حالات میں سب مسلمانوں کا یہ قطعی اور لازمی فریضہ ہے کہ اس پروپیگنڈے کا مقابلہ کریں اور اسلام کے نورانی حقائق کو جو انسانیت، فضیلت، ترقّی اور سربلندی کی رُوح کو پروان چڑھاتے ہیں معاشرے میں رائج کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی ذمّے داری پوری کریں۔

اسلام میں ماں کا مقام

ماں.....

یہ کتنا خوبصورت اور مقدّس کلمہ ہے۔ ایک ایسا کلمہ جس سے مہر و محبّت کی خوشبو آتی ہے اور گرمجوشی اور اخلاص کا احساس ہوتا ہے۔

دنیائے مغرب کو ماں کی قدر و قیمت کا احساس ہوئے زیادہ مدّت نہیں گزری جب کہ مسلمان اسلام کی آسمانی تعلیمات کی روشنی میں صدیوں سے ماں کے لیے بلند مقام کے قائل ہیں۔

اسلام کی نظر میں ماں غیر معمولی عزّت و حرمت کی حقدار ہے اور اس نے گوناگوں عبارات کے ذریعے لوگوں کی توجّہ اس امر کی جانب مبذول کرائی ہے۔

اسلام انسان کے آخری مرحلۂ کمال یعنی بہشت کو ماں کی رضا اور خوشنودی سے وابستہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ:

"بہشت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

متذکرہ بالا جملہ جو رسولِ اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے ایک نمغۂ افتخار ہے

جو ماؤں کو عطا کیا گیا ہے اور اگر ماں کے مقام کے بارے میں دوسرے لوگوں نے جو مقالات، عبارات اور کلمات سپردِ قلم کیے ہیں یا کہے ہیں ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دیے جائیں اور جملہ "اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتُ" دوسرے پلڑے میں ڈال دیا جائے تو یہ یقینی امر ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے ارشاد کا پلڑا زیادہ وزنی ہوگا۔

اسلام نے ماں کی تعظیم و تکریم کے بارے میں فقط تاکید، سفارش اور کچھ کہنے سننے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ قانون وضع کرتے وقت بعض حالات میں ماں کے اوامر و نواہی پر عملدر آمد واجب قرار دیا ہے۔

مثلاً اگر اللہ تعالیٰ کا ایک مستحبی حکم ماں کے انکار سے ٹکرا جائے یعنی ماں اس حکم کو بجا لانے سے منع کرے تو اولاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ماں کا حکم مانے اور اللہ تعالیٰ کے مستحبی حکم پر عمل نہ کرے۔ مثلاً اگر فرزند ثواب اور فضیلت حاصل کرنے کے لیے مستحبی روزہ رکھنا چاہے یا ایک مستحبی سفر پر جانا چاہے اور ماں اسے ایسا کرنے سے منع کرے تو فرزند کے لیے واجب ہے کہ ماں کے حکم پر عمل کرے اور اگر وہ اس کا حکم نہ مانے تو صرف یہی نہیں کہ اسے کوئی ثواب حاصل نہ ہوگا بلکہ وہ گناہ کا مرتکب بھی گردانا جائے گا۔

ایک اور ایسی صورت جس میں ماں کا حکم اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مقابلے میں بھی زیادہ محترم شمار کیا گیا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا واجب حکم ماں کے انکار سے ٹکرا جائے لیکن وہ عمل واجبِ عینی (مثلاً نماز پنجگانہ یا ماہِ رمضان کا روزہ وغیرہ) نہ ہو، ایسے موقع پر ماں کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے واجب فرمان کی اطاعت پر مقدم ہے۔ مثلاً اگر جہاد کا وظیفہ درپیش ہو تو جو اشخاص کفار سے لڑنے کے قابل ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ جنگ میں شرکت کریں لیکن اگر کوئی ایسا شخص ہو جو جہاد کی تمام

شرائط پر پورا اُترتا ہو اور اس کی ماں اسے اجازت نہ دے تو (بشرطیکہ اس شخص کے جہاد میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان نہ اُٹھانا پڑے) اس کے لیے جائز ہے کہ فقط ماں کے منع کرنے کی بنا پر جنگ میں شامل ہونے سے باز رہے اور ماں کے پاس وقت گزارے۔

ایک شخص نے رسولِ اکرمؐ کی خدمت اقدس میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور عرض کیا:

"یا رسول اللہؐ! میں ایک چاق و چوبند اور مستعد جوان ہوں اور چاہتا ہوں کہ میدانِ جنگ میں اسلام کی پیشرفت کے لیے کوشش کروں لیکن میری ماں یہ نہیں چاہتی کہ میں اس سے جُدا ہوں اور جنگ میں شرکت کروں۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"جاؤ اور اپنی ماں کے پاس رہو۔ اُس اللہ کی قسم جس نے مجھے رسالت پر مبعوث فرمایا ہے تم جو ایک رات ماں کی خدمت میں گزارو گے اور وہ تمھیں دیکھ کر خوش ہوگی تمھارے لیے اس کا ثواب ایک سال کے جہاد سے زیادہ ہوگا۔" [1]

اسلام ماں باپ کے احترام اور ان کا حق ادا کرنے کو اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد انسان کا اہم ترین وظیفہ سمجھتا ہے اور قرآن مجید اس بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ [2]

"میری شکر گزاری کرو اور اپنے ماں باپ کا بھی شکریہ ادا کرو۔"

---

[1] الکافی، جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۰ [2] سورۃ لقمان آیت ۱۴

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے حق کا ذکر فرمانے کے بعد بلا فاصلہ ماں باپ کے حقوق کے بارے میں حکم دیتا ہے۔

ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"یا رسول اللہؐ! میری رہنمائی فرمائیے کہ میں کس کے حق میں نیکی کروں تاکہ اپنی نیکوکاری سے مکمّل فائدہ اُٹھا سکوں؟"

حضورؐ نے فرمایا: "اپنی ماں کے ساتھ نیکی کر۔"

اُس نے دریافت کیا: "اس کے بعد؟"

آپؐ نے فرمایا: "اپنی ماں کے ساتھ نیکی کر۔"

اُس نے عرض کیا: "اس کے بعد کس سے نیکی کروں؟"

ارشاد ہوا: "اپنی ماں کے ساتھ نیکی کر۔"

اُس نے پوچھا: "اور کس کے ساتھ نیکی کروں؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "اپنے باپ کے ساتھ۔" [1]

ایک شخص نے امام الصّادق علیہ السّلام سے دریافت کیا:

"اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ماں باپ کے بارے میں جس احسان کا حکم دیا ہے وہ کیا ہے؟"

امام علیہ السّلام نے فرمایا:

"احسان یہ ہے کہ اُن سے ملنے جلنے اور ہم نشینی کے موقع پر تم ان کے بارے میں اچھی اور پسندیدہ روش اختیار کرو اور ایسی صورت پیدا نہ ہونے دو کہ اپنی ضرورت کے وقت وہ تم سے کچھ مانگنے پر مجبور ہو جائیں (بلکہ تمھیں چاہیئے کہ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ان کی ضروریات

---

[1] بحار الانوار: جلد ۴۷

پوری کردو) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز جو تمھاری دلبستگی کا موجب ہو راہِ خدا میں خرچ نہیں کروگے ہرگز سعادت تک نہیں پہنچ سکتے ۔ [1]
اگر ماں باپ تمھیں رنجیدہ بھی کریں تو تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم ان کی دل شکنی کرو، بلکہ تمھیں چاہیے کہ ان کے لیے دعائے خیر کرو اور ان پر محبّت کے علاوہ نگاہ نہ ڈالو۔ ان کی آواز سے اپنی آواز زیادہ بلند نہ کرو اور راستے پر ان کے آگے نہ چلو" [2]

امام علی بن الحسین علیہ السّلام نے فرمایا ہے:
"تمھاری ماں کا حق یہ ہے کہ تم اس بات کو جان لو کہ اس نے کئی مہینے اپنے رحم میں تمھاری نگہداشت کی اور تمھیں اٹھایا اور اپنے دل کے میوے اور رُوح کے رس سے غذا دی۔ اس نے اپنا تمام وجود تمھاری حفاظت اور نگہداشت کے لیے وقف کر دیا۔ اُس نے اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ وہ خود بھوکی رہے اور تم سیر ہو کر کھاؤ۔ وہ خود پیاسی رہے اور تم پانی پیو۔ وہ خود برہنہ رہے اور تم لباس پہنے رہو۔ وہ خود دھوپ میں ہو اور تم سائے میں ہو۔ اس نے تمھاری خاطر اپنی میٹھی نیند کو تج دیا اور بے خوابی کی تکلیف اٹھائی۔ اس نے موسمِ گرما کی گرمی اور جاڑوں کی سردی سے تمھاری حفاظت کی۔ اُس نے یہ سب تکالیف اس لیے برداشت کیں کہ وہ تمھیں اپنائے رکھّے اور تم اس کے ہو۔
تمھیں یہ جان لینا چاہیئے کہ تم ماں کا شکریہ ادا کرنے کی قدرت اور

---

[1] سورۂ آلِ عمران ۔ آیت ۹۲ [2] الکافی جلد۲

قوت نہیں رکھتے ما سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کرے اور تمھیں اس کا (یعنی ماں کا) حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"[1]

اسلام میں جو حقوق ماں کے لیے معیّن کیے گئے ہیں اور جن کے چند نمونے اوپر نقل کیے گئے ہیں ان تکالیف کی بنا پر ہیں جو ماں اپنے فرزند کے جسم اور رُوح کی پرورش کی خاطر برداشت کرتی ہے اور جانکاہ زحمتیں اُٹھا کر ایک انسان کو پالتی پوستی ہے اور پھر معاشرے کے سپُرد کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ صرف وہی ماں یہ تمام حقوق رکھتی ہے جو ماں کی حیثیّت سے اپنے فرائض مکمل طور پر انجام دے اور ہمہ پہلو کوشش اور ریاضت کے ذریعے ایک مفید اور لائق فرد کو وجود میں لائے۔

جو ماں تن آسانی کی خاطر یا رقص کی مجالس، فسق وفجور کے مراکز اور رات کی پارٹیوں وغیرہ میں شرکت کے لیے اپنے بچّے کی تربیّت سے پہلوتہی کرے اور اسے پرورش گاہ (نرسری) یا بُستانِ اطفال (Kinder Garten) کے سپُرد کر دے وہ اپنے فرزند کے حق میں ناقابلِ معافی ظلم کرتی ہے اور ماں کے مقام اور حقوق سے ہرگز بہرہ مند نہیں ہو سکتی۔

کنڈرگارٹن میں بچّوں کی زندگی بظاہر بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ ان کے لباس صاف ستھرے اور خوبصُورت ہوتے ہیں۔ بال ترتیب سے جمے ہوتے ہیں اور ان میں کنگھی کی ہوئی ہوتی ہے۔ اسکول کی عمارت اور کمرے حفظانِ صحّت کے اُصولوں کے مطابق تعمیر کیے جاتے ہیں۔ پلنگوں پر پلنگ پوش بچھے ہوتے ہیں۔ بچّوں کے لیے کھانا صحیح نظام الاوقات کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ بچّے کچھ وقت کھیلتے ہیں اور مناسب وقت پر آرام کرتے ہیں۔ مختصراً بچّوں کی جسمانی اور روحانی خواہشات

---

[1] مکارم الاخلاق طبرسی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۸۶

کے ایک بڑے حصّے کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

تاہم بچّے کے کچھ اور جذبات اور احساسات بھی ہوتے ہیں جن کی تسکین کنڈر گارٹن کے اجتماعی ماحول میں ممکن نہیں۔ وہ مخصوص پیار جو بچّے کے دل میں مسرّت اور شادمانی پیدا کرتا ہے کنڈر گارٹن میں نہیں بلکہ فقط ماں کی آغوش میں ہی میسّر آسکتا ہے۔ جو بچّہ سو بچّوں کے درمیان غیر مستقل زندگی گزارے وہ اس انفرادی شخصیّت اور آزادی کا ادراک نہیں کر سکتا جو کہ انسان کے اہم میلانات میں سے ہے۔

گھر کے ماحول میں ماں باپ بچّے کی تمام حرکات و سکنات مثلاً ہنسی اور کھیل کود میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں اور اس طرح بچے کو جو توجّہ حاصل ہوتی ہے اس سے وہ سبق سیکھتا ہے اور لذّت حاصل کرتا ہے لیکن کنڈر گارٹن کے سو بچّوں پر مشتمل گروہ کے ماحول میں ایک بچّہ جو کچھ کرتا ہے وہ سمندر کی سینکڑوں لہروں میں سے ایک لہر کی طرح غیر محسوس اور پراگندہ ہوتا ہے۔

بچّے کی تعلیم و تربّیت مسلسل توجہ کا تقاضہ کرتی ہے جو ماں باپ کے علاوہ کوئی اور مہیّا نہیں کر سکتا کیونکہ ابتدائے زندگی میں بچّے کی جن بدنی اور روحانی خصوصیّتوں اور صلاحیتوں کو تعلیم و تربّیت کے ذریعے پروان چڑھانا مقصود ہوتا ہے انھیں والدین اور بالخصوص ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔

دورِ حاضر کے معاشرے کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے بچّوں کی چھوٹی عمر سے ہی کنڈر گارٹن اور پرائمری اسکول کو گھر اور ماں کی آغوش کی جگہ دے دی ہے۔ وہ مائیں جو بچّوں کو اس لیے کنڈر گارٹن کے سپرد کر دیتی ہیں کہ اپنے انتظامی مشاغل یا ادبی اور فنّی تفریحات میں حصّہ لے سکیں یا اپنا وقت فقط برج کھیلنے اور سینما دیکھنے میں گزار دیں وہ ان گھروں کی خاموشی کا باعث بنتی ہیں جہاں بچّے بہت سی چیزیں سیکھ سکتے ہیں۔

جو بچّے اپنے گھروں میں رہتے ہیں ان کی نشو ونما ان بچّوں سے بہتر ہوتی ہے جو بورڈنگ اسکولوں میں اپنے ہم عمر بچّوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

بچّہ بہت جلد اپنی بدنی، جذباتی اور روحانی خصوصیّتوں کی بنیاد اپنے گرد و پیش کے حالات کے سانچے پر رکھ دیتا ہے اور جب وہ ایک گمنام شخص کی حیثیت سے اسکول میں اس لیے پیچھے رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے ہم عمر بچّوں سے کمتر چیزیں سیکھ سکتا ہے تو پھر وہ ٹھیک ٹھیک ترقّی نہیں کر پاتا۔

ایسی مائیں صرف اپنے بچّوں کی خوش نصیبی کی راہ میں ہی روڑے نہیں اٹکاتیں بلکہ معاشرے کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہیں اور اس کے علاوہ وہ خود بھی ایسے بچّوں سے کوئی فیض حاصل نہیں کر پاتیں۔

جس بچّے نے ماں سے مہر و محبّت کا سبق نہ سیکھا ہو اور اس کے جذبات و احساسات نے ماں کے دامن میں تقویّت نہ پائی ہو وہ بڑا ہو کر بھی اس سے محبّت اور نیک جذبات کی توقّع نہیں رکھ سکتا۔

اولاد پر ماں کا اثر

دنیا کی عظیم شخصیّتیں اپنی اہم کامیابیوں کے لیے اپنی اُن ماؤں کی مرہونِ منّت ہیں جنھوں نے اپنی مہتم بالشّان ذمّے داریاں نبھائیں اور انھیں پروان چڑھانے میں بہت بڑا اور بنیادی کردار ادا کیا۔

اسلام کے بزرگ عالم مرحوم حاج شیخ مرتضیٰ انصاری اپنی والدۂ ماجدہ کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ ان کی میّت کے پاس دوزانو بیٹھے تھے اور غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ ان کے ایک فاضل شاگرد نے دلجوئی کی خاطر کہا:

"اتنے بلند علمی مقام پر ہوتے ہوئے آپ کو زیب نہیں دیتا کہ ایک ضعیف العمر

عورت کی وفات پر یوں آنسو بہائیں اور بے چینی کا اظہار کریں۔"

ان بزرگوار نے سر اُٹھایا اور کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی ماں کے بلند رُتبے سے واقف نہیں ہو۔ اسی ماں کی صحیح تربیّت اور کثیر تکالیف کی بدولت میں اس رتبے پر پہنچا اور اس کی ابتدائی تربیّت نے میری ترقّی اور اس اعلیٰ علمی اور عملی مقام پر پہنچنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔"

اولاد پر ماں کی شخصیّت کے اثر انداز ہونے کا یہ ایک نمونہ ہے اور بہت سے ایسے دانشمند گزرے ہیں جن کی ترقی کا اہم عامل فقط ان کی ماؤں کی زحمات اور کوششیں رہی ہیں۔

ایڈیسن (Adison) سے نہ صرف یہ کہ بچپن میں کسی صلاحیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ غیر معمولی طور پر احمق نظر آتا تھا۔ چونکہ اس کا سر بے حد بڑا تھا اس لیے اس کے ملنے جلنے والے خیال کرتے تھے کہ وہ ذہنی اختلال کا شکار ہے۔ وہ ان لوگوں سے جو عجیب و غریب سوال کرتا تھا اِن سے ان کے اس گمان کو اور زیادہ تقویت پہنچتی تھی۔ حتیٰ کہ جب اس نے اسکول میں (وہ تین ماہ سے زیادہ اسکول نہیں گیا) استاد سے کئی ایک پیچیدہ سوال کیے تو اس کا لقب "احمق" پڑ گیا۔ اسی بنا پر ایک دن ایڈیسن روتا ہوا اسکول سے واپس گھر پہنچ گیا اور اپنی ماں کو سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ ماں، بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اسکول پہنچی اور ایڈیسن کے اُستاد سے کہا:

"تو نہیں جانتا کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ میرا بیٹا تجھ سے زیادہ عقل رکھتا ہے میں اِسے گھر لے جا رہی ہوں اور خود اس کی تعلیم و تربیّت سنبھالوں گی اور پھر تجھے دکھاؤں گی کہ اس میں کیا صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔"

یہ تھی اس ماں کی عجیب و غریب پیش گوئی۔ اس کے بعد جیسا کہ اس نے کہا تھا

اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔

ایڈیسن کے گھرانے کا ایک دوست اس کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

"جب میں بعض اوقات ایڈیسن کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو مسز[1] ایڈیسن کو ڈیوڑھی کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنے بیٹے کو پڑھاتے دیکھتا وہ ڈیوڑھی، پڑھائی کا کمرہ تھی اور ایڈیسن اس کا واحد شاگرد تھا۔ اس لڑکے کی حرکات و سکنات اپنی ماں کی مانند تھیں۔ وہ اپنی ماں سے بیحد محبّت کرتا تھا۔ جب اس کی ماں کوئی بات کہتی تو وہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتا یوں کہا جا سکتا تھا کہ اس کی ماں علم و دانش کا ایک سمندر ہے....."

اپنی ماں کی کوششوں کی بدولت ایڈیسن نے ۹ سال کی عمر سے پہلے ہی گبن (Gibbon)، ہیوم (Hume) افلاطون (Plato) اور شیکسپیئر (Shakespeare) جیسے مصنفین کی مشکل کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس دانشمند اور زیرک ماں نے ان کے علاوہ اسے جغرافیہ، تاریخ، حساب اور اخلاق کی تعلیم بھی دی۔ ایڈیسن تین ماہ سے زیادہ اسکول نہیں گیا اور اس نے بچپن میں جو کچھ سیکھا وہ اپنی ماں سے سیکھا۔ ایڈیسن کی ماں ہر لحاظ سے اس کی مربّی تھی کیونکہ اس نے فقط اس کی تعلیم و تربیت کی جانب ہی توجہ نہیں دی بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھا کہ اپنے بیٹے کی فطری صلاحیتوں کا پتا چلا کر انھیں پروان چڑھائے۔ بعد میں جب ایڈیسن عظمت کی بلندیوں پر جا پہنچا تو اس نے کہا:

"مجھے بچپن میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ماں کتنی اچھی چیز ہے۔ جب استاد نے مجھے احمق کہا تھا تو اس نے میرا دفاع کیا۔ میں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ میں ثابت کر دوں گا کہ میری ماں نے میرے بارے میں غلط رائے

---

[1] ایڈیسن ان کا خاندانی نام تھا۔

قائم نہیں کی تھی"۔

اس نے یہ بھی کہا:

"میں اپنی ماں کی تعلیم و تربیت کے نیک اثرات سے کبھی بھی دستکش نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ مجھے شوق نہ دلاتی تو شاید میں مُوجد نہ بنتا۔ میری ماں کا یہ عقیدہ تھا کہ بہت سے لوگ جو سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد بُرے ہو جاتے ہیں اگر بچپن میں ان کی تعلیم و تربیت کی جانب زیادہ توجّہ مبذول کی جائے تو وہ معاشرے کے نکمّے اور بیکار افراد نہ بنیں۔ جو تجربات میری ماں نے اپنی معلّمی کے زمانے میں حاصل کیے تھے انھوں نے اُن کو انسان کی طبیعت کے بہت سے اسرار و رموز سے واقف کر دیا تھا۔ میری طبیعت ہمیشہ سے لااُبالی تھی۔ اگر مجھے ماں کی توجّہ حاصل نہ ہوتی تو اس بات کا قوی احتمال تھا کہ میں راہِ راست سے بھٹک جاتا لیکن ان کی مستقل مزاجی اور نیکی ایسی مؤثر قوتیں تھیں جنھوں نے مجھے انحراف اور گمراہی سے باز رکھا"۔

سیموئیل اسمائیلز کہتا ہے:

"بچّے کی اخلاقی تربیت کا اہم ترین عامل مثال اور نمونہ ہے اور اگر کوئی شخص چاہے کہ اس کے فرزند خُلق اور نیک صفات کے مالک ہوں تو ضروری ہے کہ وہ ان کے لیے اچھّے نمونے مہیّا کرے۔ بہر حال وہ نمونہ جو ہمیشہ بچّے کی نگاہ کے سامنے رہتا ہے خود اس کی ماں ہے"۔

باشخصیّت اور ہمدرد مائیں خود تکالیف اُٹھا کر اپنے فرزندوں کی خوش بختانہ زندگی کا سنگِ بنیاد رکھتی ہیں اور انھیں مستقبل کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اس کے برعکس جو مائیں نادان اور خود غرض ہوتی ہیں وہ اپنے غلط اعمال کی وجہ سے اپنی

اولاد کا مستقبل تاریک کر دیتی ہیں۔

ول ڈیورنٹ، ماں باپ کے اعمال کے اولاد پر گہرے اثرات کے بارے میں ایک بحث کے دوران کہتا ہے:

"بہترین گھر، بہترین اسکول اور بہترین ہر دوسری چیز وہ ہے جس میں حکم کم چلایا جائے۔ اس امر کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح ایک بچّے کو تنبیہ کیے یا حکم دیے بغیر خوش اطوار بنایا جاسکتا ہے۔ اگر یہ آزادانہ روش کسی وقت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم والدین جو ہدایات اپنی اولاد کو دیتے ہیں خود ان کی پیروی نہیں کرتے ہم انھیں میانہ روی کا حکم دیتے ہیں لیکن خود خورد و نوش کے معاملے میں فضول خرچی کرتے ہیں۔ ہم مہربانی کی تلقین کرتے ہیں لیکن خود لوگوں کے سامنے لڑتے جھگڑتے ہیں۔

ہم بچّوں کو مٹھائی کھانے اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں دیکھنے سے منع کرتے ہیں لیکن خود ان چیزوں کو چوری چھپے جائز سمجھتے ہیں حتّیٰ کہ ایک دن بچّوں پر بھی بھید کھُل جاتا ہے۔

ہم نرمی کی ہدایت درشتی سے اور ادب کی نصیحت خشونت سے کرتے ہیں ہم بچّے سے تو فروتنی اور انکسار کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو ایک شکست ناپذیر خدا کی مانند ظاہر کرتے ہیں۔

تاہم جو کچھ ہم کہتے ہیں بچّے اس سے نہیں بلکہ ہمارے کردار سے سبق حاصل کرتے ہیں اور ان کی بے اطمینانی اور شورش پسندی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمارے گزشتہ کاموں کی تقلید کرتے ہیں۔

اپنے بچّوں کو لا کر مجھے دکھاؤ تاکہ میں بتا سکوں کہ تم خود کتنے پانی میں ہو۔

اگر تم اپنے فرزند سے ادب چاہتے ہو تو خود مؤدّب بنو۔ اگر تم اس سے پاکیزگی چاہتے ہو تو خود پاکیزہ بنو۔

کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

حتیٰ کہ اگر شدید غصّے کے عالم میں بھی تم جابرانہ رویّہ اختیار کرو گے اور درشت الفاظ کہو گے تو تقلید کے طور پر بچّے کے حافظے پر بھی سخت اور تلخ گفتگو مرتسم ہو جائے گی۔ اچھے طور طریقے مسلسل صبر کے ساتھ نمونہ اور مثال پیش کر کے سکھائے جاتے ہیں۔ یہ مشکل کام ہے اور کسی حد تک اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم خود از سرِ نو اپنی تربیت کریں۔"[1]

اسلام، والدین کی بے راہ روی کو افراد کی بے راہ روی کا ایک بہت بڑا سبب قرار دیتا ہے اور رسولِ اکرمؐ نے واضح طور پر اعلان فرمایا ہے کہ ہر بچّہ دنیا میں ایک پاک، توحید پسند فطرت اور اخلاقی فضائل کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور یہ والدین ہیں جو بُری تربیت دے کر اپنی اولاد کو سرکش اور بُرا بنا دیتے ہیں اور کبھی کبھی کفر اور شرک کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔[2]

اولاد کے اذہان پر والدین کے اسی ناقابل انکار اثر و نفوذ کی بنا پر اسلام کے گرامی قدر پیشواؤں نے والدین کو اولاد کی اچھی تربیت کے بارے میں بے حد تاکید فرمائی ہے اور اس سلسلے میں جو تکالیف وہ اٹھاتے ہیں ان کی غیر معمولی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"اپنی اولاد کی عزّت کرو اور انھیں صحیح آداب سکھاؤ تاکہ تم اللہ کی رحمت اور مغفرت کے حقدار ٹھہرو۔"[3]

---

[1] لذائذِ فلسفہ از ول ڈیورنٹ [2] سفینۃ البحار ص ۳۷۳ [3] مکارم الاخلاق ص ۲۵۵

ایک اور مقام پر آپ فرماتے ہیں:

"اگر تم اپنے فرزند کو اچھی تربیت دو اور نیک آداب سکھاؤ تو یہ ہر روز اپنے مال کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بہتر ہے۔"[1]

ایک اور روایت میں حضور سرورِ کائنات ؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو تین چیزوں کے علاوہ باقی چیزوں کے بارے میں اس کا نامۂ اعمال بند ہوجاتا ہے اور دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہوجاتا ہے:

- ایسے نیک کام جو اس نے اپنی زندگی میں انجام دیے ہوں اور جن سے لوگوں کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا رہے (صدقۂ جاریہ)۔
- کوئی ایسا علم اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہو جس سے لوگ مستفید ہوں۔
- اپنے پیچھے ایسا صالح فرزند چھوڑ گیا ہو جو اس کے حق میں دعا کرے۔"[2]

جب ماں باپ اپنے بچّوں کی صحیح تربیّت کا فریضہ انجام دے دیں تو یہی تربیّت ان کے بہ حیثیت والدین اپنے حقوق سے بہرہ مند ہونے کی ضمانت ہوتی ہے اور وہ صالح اولاد رکھنے کے فوائد اٹھاتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام اولاد کو مخاطب کرکے اسے ماں باپ کے بارے میں سفارش کرتا ہے۔

امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"ماں باپ کے ساتھ نیکی اور احسان کرنا خداشناسی کی دلیل ہے کیونکہ کوئی اور عبادت ماں باپ کے احترام کے مانند اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کرتی۔"[3]

---

[1] مکارم الاخلاق ص ۲۵۵ [2] راہِ تکامل ص ۱۴۴

[3] مصباح الشریعہ ص ۴۸

امام الباقر علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"چار چیزیں ایسی ہیں جو اگر کسی شخص میں ہوں تو اللہ تعالیٰ اسے بہشت میں ایک گھر عطا فرمائے گا:-

- یتیموں کی سرپرستی کرنا اور انھیں پناہ دینا۔
- ناتواں اور درماندہ لوگوں پر رحم کرنا۔
- ماں باپ کے لیے مہربان دل رکھنا اور نیک روش اختیار کرنا۔
- ماتحتوں اور خدمت گزاروں سے اچھّا سلوک کرنا اور نرمی سے پیش آنا۔" [1]

ماں سے نیک سلوک گناہوں کا کفّارہ ہے

اسلام ماں کے ساتھ احسان کو گناہوں کی تلافی کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے اور اس کے حق میں نیکی کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور گناہوں کی معافی کا سبب گردانتا ہے۔ ایک شخص کو آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور اس نے عرض کیا:

"یارسولؐ اللہ! میں نے اپنی زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں اور جس برائی کا بھی موقع ملا ہے اس کا مرتکب ہوا ہوں۔ کیا توبہ کا دروازہ میرے لیے کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے گا؟"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

"کیا تمھارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟"

اس نے عرض کیا:

---

[1] خصالِ صدوق جلد اوّل صفحہ ۱۰۶

"جی ہاں! میرا باپ زندہ ہے۔"
حضورؐ نے فرمایا:
"جا اور اس کے ساتھ نیکی کر۔" (تاکہ تیرے گناہوں کی تلافی ہو جائے)
جب وہ شخص خدا حافظ کہہ کر دروازے سے باہر نکل گیا تو آپؐ نے فرمایا:
"کاش! اس کی ماں زندہ ہوتی۔"
آنحضرتؐ کے ارشاد سے مراد یہ تھی کہ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی اور وہ اس سے نیک سلوک کرتا تو اس کے گناہوں کی تلافی جلد ہو جاتی۔ [1]

ایک اور حدیث میں یوں وارد ہوا ہے:
ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:
"یا رسولؐ اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹی عطا کی۔ میں نے اُسے پالا پوسا حتیٰ کہ وہ بڑی ہو کر سنِ رُشد کو پہنچ گئی۔ ایک دن میں نے اُسے خوب سنوارا اور عمدہ لباس پہنایا اور پھر اسے ساتھ لے جا کر ایک کنویں میں دھکا دے دیا۔ آخری کلمہ جو میں نے کنویں میں سے اس بے گناہ بیٹی کی زبان سے سُنا وہ یہ تھا: "ہائے ابا جان!" اب میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ آپ فرمائیں کہ میرے گناہ کا کفّارہ کیا ہے اور میں کیا کروں تاکہ اس گناہ کی تلافی ہو جائے؟"
آنحضرتؐ نے اس سے دریافت فرمایا: "کیا تیری ماں زندہ ہے؟"
اُس نے عرض کیا: "جی نہیں۔"
پھر آپ نے فرمایا: "کیا تیری خالہ زندہ ہے؟"
اُس نے کہا: "جی ہاں۔"

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۷۴۔ صفحہ ۸۲

حضورؐ نے فرمایا: "وہ بمنزلہ ماں کے ہے۔ جا اس کے ساتھ نیکی کر۔ اس کے حق میں نیکی تیرے گناہ کی تلافی کردے گی۔" [1]

ماں کا غصّہ

اسلام میں فرزند سے ماں کا غصّہ اور ناراضگی فرزند کی ہلاکت اور بدبختی کا سبب گردانی گئی ہے۔

بعض روایات میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ جو لوگ ماں باپ سے بدسلوکی کریں گے وہ جنّت کی خوشبو نہیں سونگھیں گے اور نیک بختی کا منہ نہیں دیکھیں گے۔

رسولِ اکرمؐ کے اصحاب میں سے ایک شخص بیمار تھا اور بستر سے لگ گیا تھا حضورؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کی حالت بڑی نازک تھی اور وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

آنحضرتؐ نے اُس سے فرمایا:

"توحیدِ الٰہی کا اقرار کر اور کہہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللهُ"

اُس شخص کی زبان لڑکھڑا گئی اور وہ اس مقدّس کلمے کو ادا نہ کر سکا۔

حضورؐ نے وہاں موجود ایک عورت سے دریافت فرمایا:

"کیا اس شخص کی ماں زندہ ہے؟"

اس عورت نے عرض کیا:

"جی ہاں! میں اس کی ماں ہوں۔"

حضور نے فرمایا:

"کیا تم اس سے ناراض ہو؟"

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۶۸۷

اُس نے جواب دیا :

"جی ہاں ! اور چھ سال ہو گئے ہیں کہ میں نے اس سے بات تک نہیں کی"

رسولِ اکرمؐ نے اُسے ہدایت فرمائی کہ اپنے بیٹے کی کوتاہیوں سے درگزر کرے اور اسے معاف کر دے۔

اس نے عرض کیا :

"یا رسولؐ اللہ! آپ کی خاطر میں نے اسے معاف کیا اور اب میں اس سے راضی ہوں"

پھر سرورِ کائناتؐ اس شخص کی جانب متوجّہ ہوئے اور فرمایا :

"پڑھ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہ "

اب اس کی زبان کھُل گئی اور بڑی آسانی سے صحیح اعتقادات اس کی زبان پر جاری ہو گئے۔ [1]

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

"جو شخص چاہے کہ جاں کنی کی تکلیف اس پر آسان ہو جائے اسے چاہیئے کہ اپنے خویش و اقارب سے بھلائی کرے اور ماں باپ سے اچھّا سلوک کرے۔ جو شخص اس روش پر کاربند ہو اس کی رُوح آسانی سے نکلے گی اور زندگی میں بھی وہ تہی دستی اور ناداری سے دوچار نہ ہو گا" [2]

ایک شخص نے رسولِ اکرمؐ سے ماں اور باپ سے احسان کے بارے میں دریافت کیا۔ آنحضرتؐ نے اُسے تین بار ماں کے بارے میں اور تین بار باپ کے

---

[1] الامالی ۔ طوسی ، جلد ۱ ، صفحہ ۶۲ [2] الامالی ۔ صدوق ، صفحہ ۲۳۴

بارے میں نیکی کرنے کی سفارش فرمائی اور اس معاملے میں ماں کو باپ پر مقدم رکھا ہے[1]

ایک دفعہ پھر ماں کے بارے میں تاکید

زکریا بن ابراہیم بیان کرتا ہے کہ:
"میں پہلے عیسائی تھا۔ بعد میں مَیں نے اسلام قبول کر لیا اور خانۂ خدا میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ سفرِ حج کے دوران میں امام الصّادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں پہلے عیسائی تھا اور اب مسلمان ہو گیا ہوں۔"

امام علیہ السّلام نے پوچھا:
"تُو نے اسلام میں ایسی کون سی خاص بات دیکھی کہ اسے قبول کر لیا؟"

میں نے عرض کیا:
"قرآن مجید کی اس آیت نے مجھے اسلام کی جانب مائل کیا:

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ"[2]

امام علیہ السّلام نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ نے تجھے اسلام کی جانب ہدایت فرمائی ہے اور تیرے قلب کو اس کے نُور سے منوّر کر دیا ہے۔" پھر آپ نے میرے حق میں دعا فرمائی اور مجھے مسائل کے بارے میں بہت سی ہدایات دیں۔

میں نے عرض کیا:
"میرے ماں باپ اور اقارب عیسائی مذہب پر قائم ہیں اور میری ماں

---

[1] الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۶۲ [2] سورۃ الشوریٰ، آیت ۵۲

نابینا ہے۔ کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں ان کے ساتھ زندگی بسر کروں اور مل جُل کر رہوں؟"

امام علیہ السّلام نے دریافت فرمایا:

"کیا وہ سوٴر کا گوشت کھاتے ہیں؟"

میں نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

اس پر آپ نے فرمایا:

"تیرے ان کے ساتھ مل جُل کر رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اپنی ماں کا خیال رکھ۔ اس کے ساتھ احسان کر اور جب وہ اس دارِ فانی سے کوُچ کرے تو اس کے کفن دفن کا انتظام خود کر۔"

جب میں حج کے سفر سے لوَٹ کر کوفہ پہنچا تو امام علیہ السّلام کے ارشاد کے مطابق اپنی ماں سے بڑے پیار اور محبّت سے پیش آیا۔ میں خود اُسے کھانا کھلاتا۔ اس کا لباس درست کرتا۔ اس کے سر میں کنگھی کرتا اور ہر طرح سے اس کی خدمت کرتا۔

جب ماں نے میرے سلوک میں یہ تبدیلی دیکھی تو کہا:

"بیٹے! جب تو ہمارے مذہب پر تھا تو مجھ سے ایسا سلوک نہیں کرتا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ تو جب سے مسلمان ہوا ہے مجھ سے بڑے پیار اور محبّت سے پیش آتا ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"پیغمبرِ اسلامؐ کے ایک فرزند نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمھارے ساتھ ایسا سلوک کروں۔"

ماں نے کہا:

"کیا وہی تمھارا پیغمبر ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"نہیں، ہمارے پیغمبرؐ کے بعد کوئی اور پیغمبر مبعوث نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے پیغمبرؐ کا فرزند ہے۔"

ماں نے کہا:

"یہ احکام پیغمبروں کے احکام ہیں اور تیرا دین میرے دین سے بہتر ہے۔ تو میری رہنمائی کرتا کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔"

میں نے اُسے اسلام کا طریقہ سکھایا اور وہ مسلمان ہوگئی۔ اس نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور آدھی رات کے وقت اس کی طبیعت ناساز ہوگئی۔

میں اس کے بستر کے پاس تھا اور اس کی خدمت گزاری میں مشغول تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:

"جانِ مادر! ایک دفعہ پھر اسلام کے احکام میرے لیے دُہرا دے۔"

میں نے وہ احکام دہرائے اور اس نے ان سب کا اقرار کیا اور اُسی رات انتقال فرمایا۔

دن چڑھنے پر کچھ مسلمانوں کے وسیلے سے اس کا جنازہ اسلامی رسوم کے مطابق اٹھایا گیا۔ میں نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی اور اپنے ہاتھوں سے اسے سپردِ خاک کیا۔"[1]

اہلبیتِ عصمت علیہم السّلام کی احادیث میں اس طرح کی روایات بہت زیادہ ہیں ان سب میں ماں کے مقام کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اولاد کو ماں

---

[1] الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۶۔ بحار الانوار جلد ۴۷

کا حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

ماؤں کا دن[1]

ایک ایسا نکتہ جس کی طرف یہاں اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ۱۰ مئی کی تاریخ کو جو "ماؤں کا دن" منایا جاتا ہے اور ہر سال اس دن کچھ رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ اخبارات اس دن کی مناسبت سے مضامین چھاپتے ہیں، شعراء قصیدے پڑھتے ہیں اور لوگ اپنی ماؤں کو تحائف پیش کرتے ہیں۔

گو یہ ایک اچھا کام ہے لیکن فقط کچھ رسوم ادا کرنا اور تحائف دینا ماں کا حق ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ کوشش اس امر کی ہونی چاہیئے کہ مائیں اپنی عظیم ذمّے داری سے واقف ہوں اور یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ خانہ داری اور بچّوں کی تربیّت ایک بہت بڑا اور قیمتی شغل ہے اور صالح اولاد کی پرورش سے زیادہ اہم اور اچّھا کوئی اور کام نہیں۔

نپولین (Nepolean) کے قول کے مطابق "ماں ایک ہاتھ سے جھُولے کو اور ایک ہاتھ سے ساری دنیا کو جھُلاتی ہے۔" اور جیسا کہ گزشتہ صفحات کے مندرجات سے واضح ہے یہ ممکن ہے کہ ایک ماں تکالیف اٹھا کر اور عقلمندانہ کوششیں کرکے ایک ایسے فرزند کی پرورش کرے جو دنیائے بشریّت میں ایک انقلاب برپا کردے۔

ماؤں کو چاہیئے کہ تربیّت یافتہ اور باایمان فرزندوں کو معاشرے کے حوالے کریں اور بالخصوص ان کے ایمان اور اعتقادات کے بارے میں پوری پوری احتیاط

---

[1] Mothers' Day

برتیں کیونکہ تجربے سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ایک بے ایمان فرزند نہ صرف یہ کہ ماں باپ کے لیے مفید نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مضر اور خطرناک بھی ہوتا ہے۔

ہم نے اکثر دیکھا ہے اور اخبارات میں پڑھا ہے کہ ایک شخص نے اپنے ماں باپ کو مارا پیٹا اور زخمی کر دیا۔ حتیٰ کہ ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے جرائم کی وجہ بے ایمانی اور روحانی سہارے کے فقدان کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اگر والدین کی یہ خواہش ہو کہ اپنے فرزندوں سے دنیاوی اور اُخروی نتیجہ حاصل کریں تو انھیں چاہیئے کہ جس طرح وہ اپنی اولاد کی صحّت اور تعلیم کی جانب توجّہ دیتے ہیں اسی طرح ان کے دینی اور اعتقادی امور کی جانب بھی پوری پوری توجّہ دیں۔

علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ فرزندوں پر ماں باپ کے بارے میں جو ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں وہ ان سے کماحقّہٗ آگاہ ہوں اور یہ سمجھ لیں کہ اولاد کی حقیقی نیک بختی ماں باپ کے تہہ دل سے راضی ہونے سے وابستہ ہے۔

اگر مصنّفین، مُقرّرین اور گلوکار اس دن سے جسے (Mothers' Day) کا نام دیا جاتا ہے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور ماؤں اور اولاد کو ان کے بنیادی فرائض سے آگاہ کریں تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی خدمت انجام دی ہے اور اپنی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

ماں کی وفات کے بعد

ماں کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی لیکن نظامِ آفرینش کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق اس حقیقت پر رکھّی گئی ہے

کہ ہر جاندار کو ایک نہ ایک دن موت کا مزا چکھنا ہے۔

انسان کے لیے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے اور تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ تاہم ماں باپ کی وفات کے بعد فرزندوں پر چند ایسی ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں جن کی ادائیگی ان کی اپنی خوش نصیبی کا موجب بنتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں موت کے ساتھ ماں اور باپ کا حق منقطع نہیں ہو جاتا اور فرزندوں پر لازم ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہیں۔

امام الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"ممکن ہے کہ ایک فرزند ماں باپ کے حینِ حیات میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا رہا ہو لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے قرضے ادا نہ کرے اور ان کے لیے بخشش کا طالب نہ ہو (اور انھیں بھلادے) اس روش کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اُسے ماں باپ کے ساتھ بُرا سلوک کرنے والوں کے زُمرے میں شمار کرتا ہے"۔ [1]

اس روایت اور دوسری روایات سے پتا چلتا ہے کہ اگر ماں باپ مقروض ہوں تو فرزندوں کو چاہیئے کہ ان کے قرضوں کی ادائیگی کی کوشش کریں اور ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ ان کے نام کا صدقہ دیں اور ان کی روح کی تسکین کے لیے حاجتمندوں کو کھانا کھلائیں۔ یتیموں پر شفقت کریں اور دوسرے نیک کام انجام دیں۔ ایسے اعمال کا نتیجہ اور ثواب ماں باپ کو ملے گا اور اسی کے برابر ثواب خود فرزند کو بھی حاصل ہوگا اور انہی بھلائیوں اور نیکیوں کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اسے خیرِ کثیر عطا فرمائے گا۔ [2]

---

[1] الکافی - جلد ۲ - صفحہ ۱۳۰ [2] الکافی - جلد ۲ - صفحہ ۱۲۷

اِسلام میں نیکوکاری

انسان کی زندگی اس وقت لذّت بخش ہوتی ہے جب اس میں انسانی رنگ موجود ہو اور معاشرے کے ساتھ اس کے روابط احسان اور نیکوکاری کی بنیاد پر استوار ہوں۔

انسان کا پُر افتخار نام اپنانے کا حق وہ لوگ رکھتے ہیں جن کی لوحِ زندگی انسانوں کے ساتھ نیکی سے عبارت ہو اور وہ اللہ کے بندوں سے نیک سلوک کرنے میں لذّت محسوس کرتے ہوں۔

اسلام میں نیکوکاری کے مسئلے کی جانب خاص توجّہ دی گئی ہے اور تاکیدی ارشادات کے ذریعے مسلمانوں کو احسان اور نیکوکاری کی جانب بلایا گیا ہے۔

قُرآن کریم فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ [1]

---

[1] سورۃ النحل۔ آیت ۹۰

"اللہ عدالت اور نیکوکاری اور خویش و اقارب کی مدد کرنے کا حکم دیتا ہے اور بُرے اور ناپسندیدہ کاموں اور ظلم سے منع کرتا ہے اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔"

ایک نکتہ جو اس آیۂ قرآنی سے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ معاشرے کو عدل کی ضرورت بھی ہے اور وہ احسان کا بھی محتاج ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل اور احسان (نیکوکاری) کے قیام کی تاکید ساتھ ساتھ اور ایک ہی جملے میں فرمائی ہے۔ اگر معاشرے میں عدالت نہ ہو تو اس کی بنیاد متزلزل ہو جائے گی اور اگر احسان نہ ہو تو ایک خشک اور بے روح معاشرہ وجود میں آجائے گا۔

احسان اور نیکوکاری، جو احساسات سے جنم لیتے ہیں، معاشرے کو زندگی بخشتے ہیں اور انسانوں کے باہمی تعلّقات میں گرمجوشی پیدا کرتے ہیں۔

دوستی اور رفاقت، محبّت اور مودت، وفا اور خیر خواہی، بیمار پُرسی، غمگین لوگوں سے ہمدردی اور ان کی دلجوئی، یتیموں پر شفقت اور دوسری انسانی صفات ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی زندگی کو پاکیزگی بخشتی ہیں اور اسے خشک مزاجی اور بے دلی سے بچاتی ہیں۔

نہ انسان ایک مشین ہے اور نہ ہی ایک معاشرے کے افراد ایک مشین کے بے روح پہیے ہیں کہ ایک دوسرے سے بے خبر اور لاپرواہ رہ کر گھومتے رہیں اور زندگی بسر کرتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں کچھ ایسے جذبات پیدا کیے ہیں جو دوسرے قدرتی ذخائر کی طرح ایک بہت بڑا اور بیش قیمت سرمایہ سمجھے جاتے ہیں اور اگر وہ ایک موافق ماحول اور مناسب حالات میں پروان چڑھیں تو انسان کی سعادت اور خوش بختی کے لیے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

اسلام کی اعلیٰ تعلیمات میں ایسے احکام دیے گئے ہیں جن کی بجا آوری جذباتی پہلو رکھتی ہے اور انسان کی زندگی میں سود مند نتائج برآمد کرتی ہے اور ان سب احکامات کا خلاصہ "نیکوکاری" کے لفظ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

لوگوں کو حقیقی نیکوکاری کی جانب راغب کرنے کے لیے قرآنِ کریم کی آیات اور اہلِ بیت علیہم السّلام کے اقوال موجود ہیں جن میں سے چند ایک ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

قرآن کریم فرماتا ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ...[1]

"جو شخص نیکی کا کام کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے دس گُنا بدلہ ملے گا اور جو شخص ناروا کام کا مرتکب ہوتا ہے اُسے اس کے جُرم کی مقدار کے مطابق سزا ملے گی۔"

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۖ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ[2]

"اگر تم نیکی کرو تو اپنے ساتھ کرتے ہو اور اگر بدی کرو تو وہ بھی خود اپنے آپ پر روا رکھتے ہو (اور اپنی اچھّائیوں اور برائیوں کا نتیجہ تم خود براہ راست دیکھو گے)۔"

امیر المومنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

اِفْعَلُوا الْخَيْرَ وَلَا تُحَقِّرُوا مِنْهُ شَيْئًا فَاِنَّ

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۱۶۱ [2] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷

صَغِيْرُهٗ كَبِيْرٌ وَ قَلِيْلُهٗ كَثِيْرٌ۔ [1]

"نیک کام کرو اور کسی نیک کام کو چھوٹا مت سمجھو کیونکہ نیکو کاری جتنی بھی چھوٹی ہو بڑی ہے اور جتنی بھی کم ہو زیادہ ہے۔"

رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے:

لَا تَبْسُطْ يَدَكَ اِلَّا اِلَى الْخَيْرِ وَلَا تَقُلْ بِلِسَانِكَ اِلَّا مَعْرُوْفًا۔ [2]

"اپنا ہاتھ نیک کام انجام دینے کے علاوہ کسی چیز کے لیے دراز نہ کرو اور اچھی بات کے علاوہ کوئی بات مت کہو۔"

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

فَمَنْ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلْيَصِلْ بِهِ الْقَرَابَةَ وَ لْيُحْسِنْ مِنْهُ الضِّيَافَةَ وَلْيَفُكَّ بِهِ الْاَسِيْرَ وَالْعَانِيَ وَلْيُعْطِ مِنْهُ الْفَقِيْرَ وَالْغَارِمَ وَلْيَصْبِرْ نَفْسَهٗ عَلَى الْحُقُوْقِ وَالنَّوَائِبِ ابْتِغَاءَ الثَّوَابِ فَاِنَّ فَوْزًا بِهٰذِهِ الْخِصَالِ شَرَفُ مَكَارِمِ الدُّنْيَا وَدَرْكُ فَضَائِلِ الْآخِرَةِ۔ [3]

"جس شخص کو اللہ مال و دولت عطا فرمائے اس کا فرض ہے کہ اس مال سے اپنے قرابتداروں کی مدد کر کے صلۂ رحمی کرے اور بھوکوں کو اپنے دسترخوان پر دعوت دے کر کھانا کھلائے۔ اسیروں اور قیدیوں کو قید و بند سے آزاد کرائے۔ فقراء اور محتاجوں کی مالی امداد کرے مقروض

---

[1] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار [2] سخنانِ حضرت محمدؐ

[3] نہج البلاغہ۔ جلد اوّل

اشخاص کی اعانت کرے۔ اپنے آپ کو حقوق کی ادائیگی اور نیکو کاری کے فرائض انجام دینے پر آمادہ کرے تاکہ اسے اللہ کی جانب سے جزا اور ثواب حاصل ہو کیونکہ جو شخص ایسی عادات اختیار کرسکے اور اپنے مال کے ذریعے ایسے کام کرے وہ دنیا کی سربلندی اور بزرگواری اور آخرت کی نیک بختی اور سعادت حاصل کرے گا۔"

امام الباقر علیہ السّلام فرماتے ہیں:

صَنَائِعُ الْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ تَقِي مَصَارِعَ السُّوْءِ وَكُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ وَاَهْلُ الْمَعْرُوفِ فِي الدُّنْيَا اَهْلُ الْمَعْرُوفِ فِي الْاٰخِرَةِ۔[1]

"نیک کاموں کا انجام دینا نیکو کاروں کو بُرے حوادث میں گرفتار ہونے سے بچاتا ہے اور جو لوگ دنیا میں نیکو کار ہیں وہ آخرت میں نیک بخت ہوں گے۔"

امام الرّضا علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اِصْطَنِعِ الْخَيْرَ اِلٰى مَنْ هُوَ اَهْلُهُ وَاِلٰى مَنْ لَيْسَ هُوَ مِنْ اَهْلِهِ فَاِنْ لَمْ تُصِبْ مَنْ هُوَ اَهْلُهُ فَاَنْتَ اَهْلُهُ۔[2]

"تمام لوگوں کے ساتھ نیکی کر، خواہ وہ اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ اگر وہ اہل نہ ہوں تب بھی تجھ میں نیکو کاری کی اہلیّت ہونی چاہیئے۔"

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

رَأْسُ الْعَقْلِ بَعْدَ الدِّيْنِ التَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ

[1] امالی صدوق صفحہ ۱۵۳ [2] عیون الاخبار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۵

وَاصْطِنَاعُ الْخَيْرِ اِلٰى كُلِّ اَحَدٍ بَرًّا اَوْفَاجِرًا [1]

"دین قبول کرنے کے بعد سب سے بڑا عقلمندی کا کام بنی نوع انسان سے محبّت اور سب افراد سے نیکی سے پیش آنا ہے۔"

ایک اور روایت میں حضور سرورِ کونین ؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ خَلَائِقِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَلْعَفْوُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَتَصِلُ مَنْ قَطَعَكَ وَ الْاِحْسَانُ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ وَاِعْطَاءُ مَنْ حَرَمَكَ [2]

"دنیا اور آخرت کا بہترین اخلاق یہ ہے کہ جس شخص نے تجھ سے زیادتی کی ہو تو اسے معاف کر دے۔ جس شخص نے تجھ سے علیحدگی اختیار کی ہو تو اس سے تعلقات جوڑ لے جس شخص نے تجھ سے بدی کی ہو تو اس سے نیکی کرے اور جس شخص نے تجھے محروم کیا ہو تو اسے اپنے عطیات سے نوازے۔"

اب تک ہم نے جن قرآنی آیات اور خاندانِ نبوّت کی روایات کا مطالعہ کیا ہے ان کا تعلق نیکوکاری کی حقیقت اور لوگوں کو نیک کاموں کی جانب متوجّہ کرنے اور ان کا شوق دلانے سے تھا۔ اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام نے ان تمام چھوٹے اور بڑے کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے جنہیں وہ نیکوکاری قرار دیتا ہے اور ان کی انجام دہی پر دنیا اور آخرت میں اجر اور بدلہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ایک نکتہ جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے یہ ہے کہ اسلامی احکام پر قدرے غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام نے جن نیک کاموں کے انجام دینے کی سفارش کی ہے ان کا مقصد فقط آخرت کا ثواب نہیں ہے بلکہ وہ نیکوکاروں

---

[1] عیونِ اخبار الرضا۔ جلد دوّم [2] الکافی

کی دنیاوی سعادت مندی اور نیک بختی پر بھی بڑے گہرے اور ناقابلِ انکار اثرات چھوڑتے ہیں۔ اس مطلب کی وضاحت کے لیے ہم چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

یتیم نوازی

اسلام میں یتیموں کے لیے بے حد سفارش کی گئی ہے اور ان کے مال کی حفاظت، ان کی سرپرستی اور دلجوئی اور ان سے مہر و محبّت کے اظہار پر بہت زور دیا گیا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ [1]

"یتیم کے مال کے نزدیک نہ جاؤ اور بہترین وجہ کے بغیر اس میں تصرّف نہ کرو۔ اس کی حفاظت اور نگہداشت کرو حتیٰ کہ یتیم سنِ رُشد کو پہنچ جائے اور بالغ ہو جائے اور اپنے مال میں خود تصرّف کر سکے۔"

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا [2]

"جو لوگ ظلم و ستم کے ذریعے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ کھاتے ہیں اور جلد ہی دوزخ کی آگ میں بھی گرفتار ہوں گے۔"

یتیموں کے بارے میں جو دوسری آیات بقرہ، النساء، بنی اسرائیل، فجر اور ماعون کے سوروں میں نازل ہوئی ہیں وہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے یتیموں

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۱۵۳ [2] سورۃ النساء، آیت ۱۰

کے مسئلے کی اہمیت کو بخوبی واضح کرتی ہیں۔

امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّدْخِلَہُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِیْ رَحْمَتِہٖ وَیُسْکِنَہُ جَنَّتَہُ فَلْیُحْسِنْ خُلُقَہُ وَ لْیُعْطِی النَّصَفَۃَ مِنْ نَفْسِہٖ وَلْیَرْحَمِ الْیَتِیْمَ وَلْیُعِنِ الضَّعِیْفَ وَلْیَتَوَاضَعْ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَہُ۔ [1]

"جو شخص خواہش رکھتا ہو کہ اللہ اسے اپنی رحمتوں میں شامل کرے اور اسے بہشت میں جگہ دے اُسے چاہیئے کہ اپنے اخلاق درست کرے، اللہ کی مخلوق سے انصاف برتے، یتیموں پر رحم کرے اور ضعیف و ناتواں لوگوں کی مدد کرنے میں عجلت کرے اور جس خدائے بزرگ و برتر نے اسے پیدا کیا ہے اس کی بارگاہ میں خاکسار اور فروتن ہو۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

مَنْ کَفَلَ یَتِیْمًا وَکَفَلَ نَفَقَتَہُ کُنْتُ اَنَا وَ ھُوَ فِی الْجَنَّۃِ کَھَاتَیْنِ وَقَرَنَ بَیْنَ اِصْبَعَیْہِ الْمُسَبِّحَۃِ وَالْوُسْطٰی۔ [2]

"جو شخص کسی یتیم کی سرپرستی کی ذمّے داری لے اور اس کے اخراجات برداشت کرے وہ بہشت میں میرے نزدیک اور میرا ہم نشین ہوگا۔"

امام علی علیہ السّلام نے اپنے آخری وصیّت نامے میں اپنے فرزندوں اور

---

[1] امالی صدوق۔ صفحہ ۲۳۴ ۔ امالی طوسی۔ صفحہ ۴۶

[2] قرب الاسناد۔ صفحہ ۴۵

پیروؤں کو اہم مسائل کے بارے میں وصیّت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِی الْاَیْتَامِ فَلَا یُغِبُّوْا اَفْوَاھَھُمْ وَلَا یَضِیْعُوْا بِحَضْرَتِکُمْ۔ [1]

"یتیموں کے بارے میں اللہ کو یاد رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کبھی بھوکے رہ جائیں اور ان کا خیال رکھو تاکہ وہ بگڑ نہ جائیں اور نکمّے ثابت نہ ہوں۔"

یتیمی، خواہ وہ ماں کی موت کی وجہ سے ہو یا باپ کی موت کی وجہ سے، فرد کے لیے بھی اور معاشرے کے لیے بھی بڑے دُور رس اثرات رکھتی ہے۔

ماہرینِ نفسیات اور علمائے تربیّت نے اپنی تحقیقات کے دوران عموماً یہ ملاحظہ کیا ہے کہ یتیمی آوارہ گردی، اسکول اور معاشرے میں پسماندگی، گناہ، بے راہ روی اور جرائم کا بہت بڑا سبب بنتی ہے۔

ایک جرمن ماہرِ نفسیات جس نے بچّوں کی اسکول میں کارکردگی پر یتیمی کے اثر کا مطالعہ کیا ہے اپنی تحقیقات کے نتیجے میں کہتا ہے کہ جو بچّے اسکول میں نکمّے ثابت ہوئے ہیں ان میں سے چوالیس فیصد ایسے ہیں جن کے باپ مر چکے ہیں اور تینتیس فی صد ایسے ہیں جن کی مائیں مر چکی ہیں یعنی عموماً ۷۷ فی صد نکمّے طالبِ علم یتیم ہوتے ہیں۔

ایک ایسی ہی تحقیقات سے جو امریکہ میں نیویارک کے ایک اسکول میں تربیّتی مشکلات کی وجوہ کے بارے میں انجام دی گئی پتا چلا کہ جو طالب علم (پڑھائی وغیرہ کے لحاظ سے) ایک مسئلہ بنے ہوئے ان میں سے ۲۵ فی صد تربیّت کے لحاظ سے یتیم تھے۔

اسی طرح مجرمانہ افعال میں ملوّث ہونے والے بچّوں اور نوجوانوں کے بارے میں جرمنی میں کی گئی ایک تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جرائم کے مرتکب ہونے والے ۲۷۰۴ نوجوانوں میں سے ۱۱۷۱ یعنی ۴۳ فی صد سے زیادہ یتیم تھے۔

---

[1] نہج البلاغہ

اسی طرح امریکہ میں قیدیوں کے بارے میں کی گئی چھان بین کے دوران اس امر کی نشاندہی ہوئی ہے کہ جن قیدیوں کے بارے میں تحقیق کی گئی ان میں سے اوسطاً ۶۰ فی صد ایسے تھے جن کا تعلق مصیبت زدہ خاندانوں سے تھا کیونکہ ان کے بچپن ہی میں ان کا باپ یا ماں فوت ہو گئے تھے۔

ایک اور جرمن دانشور جس نے ان بچّوں اور نوجوانوں کی آوارہ گردی اور مجرمانہ روش کے بارے میں تحقیق کی ہے جو قانونی عمر تک نہیں پہنچے، اپنے مطالعے کے دوران اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جو لڑکیاں چوری کی مرتکب ہوئی ہیں ان میں سے ۴۸ فی صد سے زیادہ اور جو اشخاص غیر قانونی جنسی روابط یا ڈاکہ زنی کے مرتکب پائے گئے تھے ان میں سے ۴۰ فیصد سے زیادہ یتیم تھے اور بالآخر امریکہ کی ایک معاشرتی اور نفسیاتی تحقیقات کے ضمن میں پتا چلتا ہے کہ جو لڑکیاں تادیب خانے (ریفارمیٹری) میں زندگی بسر کر رہی ہیں ان میں سے ۷۰ فی صد کے ماں یا باپ یا دونوں فوت ہو چکے ہیں۔

یتیمی ایک شخصی مصیبت ہونے سے بھی زیادہ ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ ہے اور بہت سی محرومیاں، آوارہ گردیاں، ناکامیاں، پسماندگیاں، قتل اور خودکشی کی وارداتیں، خلافِ تہذیب حرکتیں اور نفسیاتی بیماریاں ایسی ہیں جن کا ماخذ اس میں تلاش کرنا چاہیے۔

اس مقصد کے پیشِ نظر کہ بن باپ کے بچّے معاشرے کے مفلوج اور ناکارہ اعضا ثابت نہ ہوں بلکہ شائستہ اور لائق افراد بنیں اور یتیم آوارہ گردی، جرائم اور بدعنوانیوں کی جانب مائل ہو کر معاشرے کے لیے خطرہ نہ بن جائیں اسلام نے تاکیدی احکام اور مفید مشورے دیے ہیں جن پر عمل درآمد سے تمام خطرات دُور ہو جاتے ہیں اور نفسیاتی الجھنوں کی پیدائش کی پیش بندی ہو جاتی ہے۔

ممکن ہے کہ متمدّن ممالک اور ترقی یافتہ معاشروں میں یتیموں کی حالت بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے جاتے ہوں لیکن ان اقدامات سے فقط یتیموں کی جسمانی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں لیکن ان کی جذباتی اور روحانی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھانا ممکن نہیں۔

ممکن ہے کہ ساز وسامان سے آراستہ یتیم خانوں میں مناسب وسائل زندگی، تربیّت یافتہ ملازمین، پاک صاف لباس، مناسب اور عمدہ غذا، ورزش اور تعلیم وغیرہ کے انتظامات موجود ہوں لیکن یہ تمام امکانات اس بچّے کے احساسات اور جذبات کا جواب نہیں ہوسکتے جو اپنے آپ کو یتیم اور بن باپ کے دیکھتا ہے اور دوسرے بچّوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو حقیر اور نادم محسوس کرتا ہے۔

سب سے بڑا دکھ بھی یہی ہے اور خطرہ بھی یہیں سے جنم لیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس دکھ کا کوئی بنیادی علاج بھی نہیں ہوسکتا۔

اسلام کا قانون وضع کرنے والے (یعنی اللہ تعالیٰ) نے جو خود انسان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی تمام جسمانی اور روحانی ضروریات سے واقف ہے اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے یتیموں کی جسمانی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ان کے روحانی اور جذباتی احساسات کو بھی موردِ توجّہ قرار دیا ہے اور اپنے ہمہ پہلو احکام کی تشریح فرمائی ہے۔

اسلامی احکامات میں جہاں یتیم بچّوں کی سرپرستی اور ان کے اخراجات مہیّا کرنے کی سفارش کی گئی ہے وہاں ان سے شفقت اور محبّت برتنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔

اسلام کے گرانقدر پیشوا فرماتے ہیں:

"جو شخص پیار اور محبّت کے اظہار کے طور پر کسی یتیم کے سر پہ ہاتھ

رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ہر اس بال کے لیے اجر دیتا ہے جو اُس کے ہاتھ کے نیچے سے گزرتا ہے اور جو شخص کسی یتیم کو اپنے دستر خوان پر بٹھا کر کھانا کھلاتا ہے وہ قساوتِ قلب سے نجات پاتا ہے اور ایک مہربان دل کا مالک بن جاتا ہے۔" لہ

یتیموں کے بارے میں پیشوایانِ اسلام کی روش ایک بہترین درس ہے اور تمام مسلمانوں کو اس کی جانب توجہ دینی چاہیئے۔

امام علیؑ نے اپنی زندگی کے آخری دم تک ہمیشہ یتیموں سے مہربانی کا برتاؤ کیا آپ انھیں اپنے گھر لے جاتے اور اس امر کی آزادی دے دیتے کہ ان کے اپنے بچّوں کی طرح کھیلیں کودیں اور جو کھانا گھر میں موجود ہو کھائیں۔ لوگ آپ کو یتیموں کا باپ کہا کرتے تھے۔

یہ نیک کام (یتیموں سے شفقت آمیز سلوک اور لاوارث بچّوں کی پرورش) جو اسلام کے نورانی پروگرام کا ایک جزو ہیں معاشرے کی بہبود، سعادت اور خوش بختی کا موجب ہیں اور یتیمی کی ان خرابیوں کو ظاہر کرنے سے روکتے ہیں جن میں غیر اسلامی معاشرے مبتلا ہیں۔

ایک نکتہ جس کی جانب اس بحث کے خاتمے پر اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا اس سے یتیموں کو افسردہ خاطر اور ملول نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یتیمی کے دردناک عارضے یتیموں کو اسی وقت لاحق ہوتے ہیں جب معاشرہ ان کے ساتھ اسلام کے احکام کے مطابق سلوک نہ کرے اور اگر یتیموں کی تربیت اسلامی روش کے مطابق ہو تو ممکن ہے کہ وہ اپنے وقت کے لائق ترین افراد بن جائیں۔ علاوہ ازیں اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق یتیمی کوئی عیب نہیں۔ قرآن مجید واضح

لہ سفینۃ البحار۔ جلد دوم

الفاظ میں بتاتا ہے کہ خود رسولِ اکرمؐ یتیم تھے اور آنحضرتؐ کے علاوہ بھی بہت سی ایسی اسلامی شخصیتیں گزری ہیں جو یتیم تھیں۔

دوسروں کی حاجت برآری کے لیے کوشش

اللہ کے بندوں کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش ان نیک کاموں میں سے ایک کام ہے جن کے لیے اسلامی احکام میں بے حد سفارش اور تاکید کی گئی ہے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السّلام پر وحی فرمائی کہ جب میرا کوئی بندہ ایک نیک کام کرتا ہے تو میں اس کے بدلے میں اسے بہشت عنایت کرتا ہوں۔

حضرت داؤد علیہ السّلام نے پوچھا:

"یا اللہ! وہ نیک کام کون سا ہے؟"

وحی نازل ہوئی:

"میرے کسی باایمان بندے کو مسرور اور خوشحال کرنا خواہ کھجور کا ایک دانہ دے کر ہی کیا جائے۔"

حضرت داؤدؑ نے عرض کیا:

"یا اللہ! جس شخص نے تجھے پہچانا ہو (اور تیرے لطف و کرم کے معیار کو سمجھا ہو) وہ اس بات کا مستحق ہے کہ تیری رحمت سے ناامید نہ ہو۔" [1]

امام محمد الباقر علیہ السّلام نے فرمایا:

"اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام اس کے بندے کو خوش

---

[1] الکافی - جلد دوم

کرنا ہے اور وہ یوں کہ کوئی شخص اسے کھانا کھلائے یا اگر وہ مقروض ہو تو اُس کا قرض ادا کرے"۔ [1]

امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جو لوگوں کی حاجت براری میں کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے بندے قیامت کے دن پریشانی سے محفوظ رہیں گے اور جو شخص کسی مومن بندے کو خوش کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قلب کو خوشی سے سرشار کر دے گا" [2]

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"سب لوگ میرے احسان کے دستر خوان کے ریزہ چین ہیں اور میرے نزدیک ان میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو میرے بندوں پر زیادہ مہربان ہو اور ان کی ضروریات پوری کرنے کی زیادہ کوشش کرے"

صدقہ حلوانی نامی ایک شخص کہتا ہے:

"میرے ایک دوست نے مسجد الحرام میں دو دینار بطور قرض مانگے میں نے اس سے وعدہ کیا کہ طواف ختم کر کے اس بارے میں اقدام کروں گا۔

ابھی میں نے طواف ختم نہیں کیا تھا کہ امام الصّادق علیہ السّلام طواف کے لیے تشریف لائے اور سہارے کے طور پر ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور ہم دونوں طواف کرنے لگے۔

میرا طواف ختم ہو گیا لیکن امام علیہ السّلام کا ساتھ دینے کی خاطر میں

---

[1] [2] الکافی۔ جلد دوم

نے طواف جاری رکھا۔

وہ شخص ایک طرف بیٹھا تھا۔ چونکہ وہ امام علیہ السّلام کو نہیں پہچانتا تھا اس لیے یہ خیال کرتے ہوئے کہ میں اس کے کام سے لاپروائی برت رہا ہوں میں جب بھی اس کے سامنے سے گزرتا وہ مجھے ہاتھ سے اشارہ کرتا اور اپنا مقصد یاد دلاتا۔

امام الصّادق علیہ السّلام نے مجھ سے دریافت کیا: "یہ شخص تمھیں اشارے کیوں کر رہا ہے؟"

میں نے عرض کیا: "میں آپ کے قربان جاؤں۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہے کہ طواف ختم کر کے اس کے پاس جاؤں اور اس کی حاجت پوری کر دوں لیکن چونکہ آپ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھّا ہوا ہے اس لیے میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔"

امامؑ نے ایک لحظہ بھر تامّل کیے بغیر ہاتھ میرے کندھے پر سے اُٹھا لیا اور فرمایا: "ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو اور جا کر اس کی حاجت پوری کرو۔"

میں گیا اور امامؑ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا اور اس شخص کی حاجت پوری کر دی۔ دوسرے دن میں امامؑ کی مجلس میں پہنچا۔ آپ اپنے اصحاب سے گفتگو فرما رہے تھے۔ جونہی مجھے دیکھا آپ نے اپنی بات ختم کی اور فرمایا: "اگر میں اپنے ایک مومن بھائی کی حاجت برآری کی کوشش کروں تو یہ فعل میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں ہزار غلاموں کو آزاد کروں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ایک ہزار افراد کو حرکت میں لے آؤں۔" [1]

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل

ایک اور روایت میں امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"جب کوئی شخص مجھ سے حاجت طلب کرتا ہے تو میں اس کی حاجت برآری کے لیے جلدی کرتا ہوں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ اس نے مجھ سے مانگا ہے وہ اس کے پاس اس وقت پہنچے جب دیر ہو چکی ہو اور اس کے لیے فائدہ مند نہ ہو۔" [1]

امام الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"اگر کوئی شخص اپنے مومن بھائی کو دیکھ کر محبّت آمیز طریقے سے مسکرائے (اور یہ مسکراہٹ اس کا دلی تعلّق ظاہر کرے) تو اس کا یہ فعل نیکو کاری میں شمار ہوتا ہے۔" [2]

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"جس شخص سے اس کا مومن بھائی کوئی حاجت طلب کرے اور وہ توانائی اور قدرت رکھتے ہوئے اس کی حاجت پوری نہ کرے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُسے اس حالت میں اُٹھائے گا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے۔" [3]

امام السّجاد علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"بہشت کے درجاتِ عالیہ کا شعور حاصل کرنے کی کوشش کرو اور یہ جان لو کہ زیادہ عالی درجات اور زیادہ عالی شان محلّات اس شخص کو ملیں گے جو اپنے باایمان بھائیوں کے لیے زیادہ مفید ہوگا اور حاجتمندوں کی زیادہ خدمت کرے گا اور بعض اوقات فقط ایک

---

[1] عیون اخبار الرّضا [2] الکافی ۔ جلد دوّم

[3] بحار الانوار (دنیا ایڈیشن) جلد ۷۴

جملہ کہنا بھی انسان کے قرب اور نجات کا موجب بن جاتا ہے ۔ اپنے دینی بھائیوں کے حق میں نیکوکاری اور احسان کو کبھی بھی چھوٹا نہ سمجھو کیونکہ یہ نیک کام اس دن تمھارے لیے مفید ثابت ہوں گے جس دن اور کوئی چیز تمھارے لیے سود مند نہ ہو گی۔" [1]

جامع الازہر قاہرہ کے رئیس علامۂ فقید استاد الشیخ محمود شلتوت نے اپنی کتاب (من توجیہات الاسلام) میں ایک باب 'اسلام میں نیکوکاری کے بارے میں لکھا ہے جس کے چند اقتباسات ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

"پیغمبر اسلامؐ اہلِ ایمان کے حق میں بے حد مہربان تھے۔ آپ اپنے اعزّہ و اقارب سے رابطہ برقرار رکھتے تھے۔ آپ دوسروں کی مشکلات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتے تھے۔ ضعیفوں کی مدد فرماتے تھے اور آپ کی لامحدود رحمت فقط بنی نوعِ انسان کے شاملِ حال ہی نہیں تھی بلکہ آپ حیوانوں سے بھی اچھا سلوک کرتے تھے حتّٰی کہ بلّی کے سامنے پانی کا برتن اتنی دیر تک رکھتے تھے کہ وہ اچھی طرح پی لے اور سیر ہو جائے۔"

امام الصّادقؑ آنحضرتؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"اللہ ایک عورت کو عذابِ دوزخ میں مبتلا کرے گا کیونکہ اس نے ایک بلّی کو بند کر دیا، اسے اذیّت پہنچائی اور اُسے پانی اور خوراک کے بغیر اتنی مدّت تک بند رکھا کہ وہ بے چاری مر گئی۔"

ایک دن حضورؐ نے اپنے صحابہ کو یہ قصّہ سُنایا:۔

"ایک شخص کو ایک سخت گرم بیابان میں پیاس لگی۔ اس نے ایک کنویں کے پانی سے اپنی پیاس بُجھائی اور جب کنویں سے باہر نکلا تو ایک کتّے

---

[1] بحار الانوار ۔ تفسیر امامؑ

کو دیکھا جو شدید پیاس کی وجہ سے اپنی تھوتھنی زمین پر رگڑ رہا تھا۔ اس شخص نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کتّا بھی میری طرح پیاسا ہے اور پانی نہ مل سکنے کی وجہ سے تکلیف اٹھا رہا ہے۔ پس وہ دوبارہ کنویں میں داخل ہوا اپنے جوتوں میں پانی بھرا اور لاکر کتّے کے سامنے رکھ دیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اسی نیک کام کے بدلے میں بخش دیا۔"

صحابہ نے عرض کیا:

"کیا ہمیں اللہ تعالیٰ سے حیوانات پر احسان کرنے کی جزا بھی ملتی ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا:

"ہاں! اور تم کسی پریشان خاطر جاندار کی جو خدمت انجام دو گے اس کا اجر پاؤ گے۔"

"ایک دن ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھوک سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ آپ نے فوراً ایک شخص کو اپنے گھر بھیجا تاکہ اس کے لیے کھانا لے کر آئے۔ آنحضرتؐ کی زوجہ نے اظہارِ تاسّف کرتے ہوئے کہا کہ گھر میں کھانا موجود نہیں ہے۔ جب آپ کو اپنے گھر کی جانب سے مایوسی ہوئی تو آپ صحابۂ کرام سے مخاطب ہوئے اور دریافت فرمایا کہ آیا تم میں کوئی شخص ایسا ہے جو اس مہمان کو قبول کرے؟

ایک صحابی نے اس شخص کو کھانا کھلانے کی ذمّے داری لی لیکن جب وہ اسے اپنے گھر لے گیا تو پتا چلا کہ بچّوں کے کھانے کے علاوہ گھر میں کوئی غذا موجود نہیں۔ چنانچہ جب اس نے دسترخوان بچھایا تو کسی بہانے چراغ گُل کر دیا۔ مہمان اندھیرے میں کھانا کھاتا رہا اور اس خیال میں رہا کہ

صاحبِ خانہ بھی کھا رہا ہے حالانکہ وہ فقط اپنا ہاتھ دستر خوان تک لے جاتا تھا اور پھر خالی ہٹا لیتا تھا۔ اس طرح مہمان نے سیر ہو کر کھانا کھالیا۔"

موجودہ معاشرے میں آپ کتنے اشخاص کو جانتے ہیں جو ان برگزیدہ انسانی صفات کے حامل ہیں؟

"کچھ لوگ نرم بستروں پر بڑی دلجمعی سے پاؤں پسار کر لیٹتے ہیں اور اپنے اردگرد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ڈھیر لگے دیکھتے ہیں۔ ان کے بچّوں اور بیویوں کے چہرے زندگی کی آسائشوں کی بدولت شاداب اور پھول کی طرح کِھلے ہوتے ہیں۔ اے مسلمان بھائی! اگر تیرے حالات بھی ایسے ہی ہیں تو تجھے مبارک ہوں لیکن یہ بات مت بھول کہ تیرے ہم جنسوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ناداری کی تاریکی اور عین بدبختی اور خواری میں زمین کو اپنا بچھونا اور آسمان کو اوڑھنا بنا رکھا ہے۔ علاوہ ازیں جب تیری نگاہ اپنے خوشحال بچّوں پر پڑے تو اس حقیقت کو فراموش نہ کر کہ کچھ والدین اپنے اُڑی اُڑی رنگت والے اور بھوکے پیاسے بچّوں کے ساتھ اندھیرے میں رات بسر کرتے ہیں۔

تو اپنے بچّوں کے ساتھ خوشی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے لیکن یہ یاد رکھ کہ کچھ چھوٹے چھوٹے بچّے ایسے بھی ہیں جو کسی زمانے میں اپنے باپ کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن اب ان کے سروں اور چہروں پر یتیمی کی گرد جم گئی ہے اور اپنی بے کسی کی وجہ سے خوراک اور پوشاک کے لیے روتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ان کی غم زدہ آنکھوں سے آنسو پونچھے اور ان کی بھوک کے درد کو دُور کرے۔ اس وقت سے

ڈرو جب وقت کا طاقتور پہیہ تمھارے بچّوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کردے۔

اور اے نیک بخت اور خوش و خرّم خاتون جسے اپنے مہربان شوہر کا سایہ میسّر ہے! یہ بات مت بھول کہ تیری بیوہ اور ہم وطن بہن بھی کسی زمانے میں اسی طرح خوش بخت اور خوش حال تھی لیکن اس کا شوہر اچانک لقمۂ اجل بن گیا اور وہ بے چاری مغموم اور پریشان حال ہوگئی۔

اور اے خوش و خرّم اور آرام طلب لوگو! اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کے لیے اس کا شکر ادا کرو کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے جو فرماتا ہے:[1]

"اگر تم شکر کرو تو بلاشبہ میں تمھارے لیے نعمتوں میں اضافہ کردوں گا۔"

شکر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم زبان سے کچھ الفاظ ادا کردیا آہیں بھر کر افسوس کرو اور بیکس لوگوں سے جھوٹ موٹ ہمدردی کا اظہار کرو۔ یہ باتیں کس درد کی دوا ہیں۔ یہ کون سے بھوکے کو سیر کرتی ہیں اور کس بدبخت کے حالات میں اصلاح کا موجب بنتی ہیں؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ عملی طور پر تاسّف اور ہمدردی کا مثبت پہلو ظاہر ہو۔ تم ایسے کام کرو جن کی بدولت تمھاری فطرت میں کریم النفسی، عفو و درگزر، دلاوری اور عدل و انصاف کی رُوح زندہ ہوجائے۔ اپنے والدین، اولاد اور دوسرے افرادِ خانہ کی پرورش بھی اسی ڈھنگ سے کرو۔ کیا تم ایسا ہی کرتے ہو؟

---

[1] سورۃ ابراہیم - آیت ۷

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رنگین میزوں کے کنارے بیٹھ کر اپنی دولت جوئے میں لٹاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے جو شطرنج اور سینکڑوں دوسرے کھیلوں اور گوناگوں گناہوں میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔

اے نادان لوگو! جو یوں کھیل کود اور نفسانی خواہشات میں غرق ہو اور اے غلط اور مجرم قسم کے پاکبازو! معاشرہ افلاس، بیماری، موت، پریشانی اور دوسرے ہزارہا مصائب کے خطرات میں گھرا ہوا ہے، آباد گھرانے برباد ہوتے جارہے ہیں، پاک دل ناپاکی کی طرف مائل ہیں، خاندان محبّت اور اتحاد کے رشتے توڑ رہے ہیں، سڑکوں کے کناروں پر بے آسرا لوگ بیٹھے ہیں لیکن تم ہو کہ اسی طرح پُرجوش اور پُرسُرور محفلوں میں علیش و عشرت اور انسانیّت کے منافی لذّتوں میں مشغول ہو۔ پس ان لوگوں کی کیا ذمّے داری ہے جو کوئی جائے رہائش نہیں رکھتے اور اپنے بیوی بچّوں کے لیے کوئی پناہ گاہ مہیّا نہیں کرسکتے؟ پس جس قدر جلد ہوسکے ان گناہ کی محفلوں کو خالی کردو۔ خواہ ایک لحظہ کے لیے ہی سہی جلدی لوگوں کے درمیان آؤ۔ ایک دل کو خوش کرو، ایک درماندہ شخص کو خوش حال بناؤ، ایک یتیم پر شفقت کرو اور پھر اگر تم اپنی ان نیکیوں کو جاری رکھّو گے تو حقیقی لذّت محسوس کروگے۔ تمھارا ضمیر مطمئن، زندگی پرلطف اور حالت زیادہ اطمینان بخش ہوگی۔ اس صورت میں تم اللہ تعالیٰ کو بھی خوش کروگے، معاشرے کو بھی تباہی کے خطرے سے نجات دلا دوگے اور اپنا انسانی فریضہ بھی بجا لاؤگے۔

حضرات!

میں آپ کو خیر خواہی، عفو و درگزر، رحم اور حاجت مندوں سے بھلائی کی تلقین فقط دین یا انسانیّت کی خاطر نہیں کرتا بلکہ مملکت کی عام خوشحالی اور آپ کی ذاتی بہبود بھی ان امور کی متقاضی ہے۔

نیکوکاری اور بے کسوں کی امداد اور مفید رفاہی کاموں پر عملدرآمد سے آوارہ گردوں کے گروہ میں سے ایک عظیم فوج تشکیل دی جاسکتی ہے اور اسے ملک کی ترقّی اور معاشرے کے دفاع کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

نیکوکاری اختیار کر کے کینہ اور بغض و عناد کا زنگ دلوں سے دھویا جاسکتا ہے اور دوسروں کی رضامندی، اطمینان اور محبّت حاصل کی جاسکتی ہے اور بالآخر معاشرے کے افراد کے مابین تعاون اور اعتماد کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔

جب آپ کسی حاجتمند سے نیکی کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو آپ کا غلام تصوّر کرتا ہے اور آپ سے خاکساری اور تواضع سے پیش آتا ہے۔

اکثر اوقات ایک مختصر سی تخفیف سے سرمائے کی ایک بہت بڑی مقدار کو محفوظ رکھّا جاسکتا ہے اور انسان کے نیک کام اسے خطرناک طوفانوں سے نجات بخشتے ہیں۔

اب سبھی آیئے اور دُکھ دُور کرنے والے دردمند اور خیرخواہ بن جایئے آیئے اور انسانی شعار کو زندہ کیجیے اور مذہب اور مادرِ وطن کے تقاضوں اور شخصی مصلحتوں کے مطابق قدم اُٹھایئے۔

آیئے اور خاک نشینوں پر رحم کیجیے تاکہ آپ آسمانوں اور زمین کے

خدا کے رحم کے حقدار ٹھہریں۔" (من توجیہات الاسلام)

جو کچھ اب تک نقل کیا گیا وہ نیکو کاری کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک مختصر نمونہ تھا اور اس معاملے کا باریک نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے کوشش کی ہے کہ خیر خواہی اور نیکو کاری کی رُوح بچپن سے لوگوں میں پیدا ہو جائے تاکہ وہ بڑے ہو کر خود بخود نیکو کاری کی جانب راغب ہوں، کسی تکلیف اور زحمت کے بغیر اسے انجام دیں اور کسی نیک کام کرنے میں کوئی کوفت محسوس نہ کریں بلکہ ان کی زندگیوں کے سب سے زیادہ لذّت بخش وہ لمحات ہوں جب وہ کسی کی خدمت انجام دیں یا کسی نیکی کے کام کا اقدام کریں۔

اسلام کے گرامی قدر پیشواؤں اور ان کے تربیّت کردہ اشخاص کی تاریخِ حیات اس دعوے کی بہترین گواہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کا مطالعہ کریں اور ان بزرگواروں کے طور طریقوں سے آگاہ ہوں اور نیکو کاری میں ان کے نقشِ قدم پر چلیں تاکہ حقیقی سعادت اور نیک بختی سے بہرہ ور ہوں۔ انشاء اللہ۔

کسے نیک بیند بہر دو سرای
کہ نیکی رساند بخلقِ خدای

(سعدی)

"جو شخص نیکو کار ہو وہ لوگوں کے لیے حقیقی بادشاہ کا رتبہ رکھتا ہے اور دلوں کی مملکت پر حکومت کرتا ہے۔" (جارج ہربرٹ)

"جو شخص دوسروں کی خیر اور نیک بختی کا طالب ہو وہ بالآخر خود نیک بختی حاصل کر لیتا ہے۔" (افلاطون)

"تمھاری نیکی کا اجر تمھارے نیک عمل میں پوشیدہ ہے۔" (سیسرون)

"اگر ہم لاپروا لوگوں کے دلوں کو احسان کے ساتھ جال میں نہ پھنسائیں تو پھر کون سا ایسا اور ذریعہ ہے جس سے ان کے دلوں کو شکار کیا جاسکے؟"

(بہرام گور)

"دو لذتیں ایسی ہیں جن کا نتیجہ ہرگز ناگوار اور پریشانی کا موجب نہیں ہوتا ان میں سے ایک لوگوں سے نیکی کرنا اور دوسری اپنی ذمّے داری سرانجام دینا ہے۔"

(ژان ژاک روسو)

"نیکی ہر چیز پر غالب آجاتی ہے اور خود کبھی مغلوب نہیں ہوتی۔"

(ٹالسٹائی)

نکوئی بہر جا چو آید بکار
نکوئی کن و از بدی شرم دار

(فردوسی)

اسلام میں الکحلی مشروبات کی ممانعت

حالانکہ الکحلی مشروبات کے بارے میں اب تک بے شمار کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ان کا مطالعہ، تجزیہ اور تحلیل کی گئی ہے پھر بھی موضوع کی اہمیّت اور ان مشروبات سے جنم لینے والے خطرات کی خاطر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کے متعلق ایک ہمہ پہلو اور ساتھ ہی ساتھ مختصر مطالعہ عمل میں لایا جائے۔ ممکن ہے کہ اس طرح معاشرے کی ایک خدمت انجام دی جاسکے اور مسلمان نوجوان اس خطرناک مائع کے جال میں گرفتار نہ ہوں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ الکحلی مشروبات کے مُضر ہونے کے بارے میں دانشمندوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس دعوے کے ثبوت کے لیے ہمارے پاس ہزاروں قطعی دلائل موجود ہیں۔

شاید چند سال پہلے تک بعض نادان لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ اگر الکحلی مشروبات کم مقدار میں استعمال کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ بے ضرر ہوتی ہیں بلکہ مفید بھی ہوتی ہیں لیکن حال ہی میں چند امریکی اور یورپی اطبّاء اور دانشمندوں نے جو تحقیقات کی ہیں اس کے نتیجے میں اس بے بنیاد مفروضے کو رد کر دیا گیا ہے اور یہ ثابت ہو گیا

ہے کہ یہ مشروبات خواہ مقدار میں کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں پھر بھی اُسی نسبت سے مُضر اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

مندرجہ ذیل رپورٹ پر توجّہ فرمایئے جو سرکاری ذرائع سے حاصل کی گئی ہے:

"کچھ عرصہ پہلے جب اسپیشلسٹ ڈاکٹر دنیا کی چاروں اطراف سے الکحل اور الکحل ازم (الکحل کے جسمِ انسانی پر اثرات) سے جنگ کی عالمی کانگریس میں شرکت کے لیے واشنگٹن میں دوبارہ جمع ہوئے تو انھوں نے ایک دفعہ پھر خطرے کی گھنٹی بجائی کہ: الکحل دماغ کی بدترین دشمن ہے۔"

ڈاکٹر ملوین کنز لی جنھوں نے سالہا سال الکحل ازم پر تحقیق کی، کانگریس کے پہلے اجلاس میں یوں کہا:

"الکحل کا کم مقدار میں استعمال بھی بہت سے دماغوں کی تباہی کا موجب بنتا ہے۔ جب انسان تھوڑی سی الکحل پی کر لذّت اور سرور محسوس کرتا ہے اس وقت اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ اس نے خود اپنے دماغ کے خلیوں کو تباہ کرنے میں مدد کی ہے۔"

ڈاکٹر کنز لی جو جنوبی کیرولینیا (امریکہ) کے میڈیکل کالج کے شعبۂ تحقیقات کے ڈائرکٹر ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ الکحل کا زیادہ استعمال خون اور رگوں میں اتنی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے کہ دماغ کے خلیوں میں آکسیجن کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور وہ فنا ہو جاتے ہیں یا انھیں اتنا نقصان پہنچتا ہے کہ انسان ذہنی اختلال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ الکحل کی خون میں سرایت بعض اوقات جریانِ خون کو بڑی سختی سے روک دیتی ہے اور بعض اوقات اس کا نتیجہ انجمادِ خون کی شکل میں نکلتا ہے۔

ڈاکٹر کنزلی نے اس کانگریس میں اپنی پہلی تقریر میں کہا:

"بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ الکحل ازم کے خلاف جنگ میں ہماری کوششیں بے نتیجہ رہی ہیں اور الکحل استعمال کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دورِ حاضر میں دنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں افراد الکحل کے عادی ہو چکے ہیں اور ان کے لیے اس سے چھٹکارا پانے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں۔"

موضوع زیرِ بحث یہ ہے کہ بدقسمتی سے سبھی لوگ خیال کرتے ہیں کہ تھوڑی مقدار میں الکحل کا استعمال نہ صرف یہ کہ کسی خطرے کا حامل نہیں بلکہ شاید ضروری بھی ہے۔ بعض کے نزدیک محفلوں میں اصطلاحاً ہونٹ تر کر لینے سے اس کی عادت نہیں پڑ جاتی یا الکحل ان کے دماغوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی حالانکہ اس سلسلے میں جو وسیع تحقیقات ہوئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ الکحلی مشروبات خواہ کتنی ہی قلیل مقدار میں استعمال کیے جائیں دماغ کے خلیوں کی کارگزاری میں خلل کا باعث بنتے ہیں۔

ڈاکٹر ریمنڈ پینگنون بھی جنھوں نے کانگریس کو چار صفحات پر مشتمل رپورٹ پیش کی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ الکحل بلاشبہ انسان کی خطرناک ترین دشمن ہے اور وہ لوگ بھی جو اپنے خیال کے مطابق کبھی کبھی تھوڑا سا الکحلی مشروب پی لیتے ہیں اس دشمن سے جنم لینے والے خطرات کی زد میں ہیں۔

ڈاکٹر پینگنون کے عقیدے کے مطابق الکحل کا عادی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بھلکڑ اور کام کاج سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو تحقیقات ہم نے کی ہیں ان سے پتا چلا ہے کہ جو لوگ الکحل کے عادی ہو جائیں انھیں تھوڑی سی مدت گزرنے کے بعد نسیان کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے اور ان

کی ترقی رُک جاتی ہے۔ اپنے کام میں ان کی دلچسپی ماند پڑ جاتی ہے اور بالآخر کام کاج چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ پہلے سے بھی بیشتر الکحل میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کہتے ہیں :

"بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نوجوان الکحلی مشروبات کا استعمال بہت زیادہ کرنے لگے ہیں اور وہ الکحل کو بے کیف زندگی سے بچنے کے لیے پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ جو تحقیقات ہم نے کی ہیں ان کی بدولت اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آجکل کے ۷۰ فی صد نوجوان الکحلی مشروبات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ان میں سے ۲۰ فی صد سے ۳۰ فی صد تک ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ سرِ راہ کیے جانے والے جرائم میں مسلسل اضافہ الکحلی مواد کے استعمال میں روز افزوں وسعت کی ایک واضح نشانی ہے اور تحفظِ عامّہ کے محکموں میں موجود مسلیں بتاتی ہیں کہ سرِ راہ ہونے والے جرائم کا سبب زیادہ تر وہ لوگ بنتے ہیں جو الکحل کے عادی ہوتے ہیں۔"

الکحل اور الکحل ازم کے خلاف جنگ کی کانگریس میں شرکت کرنے والا فنِ طبابت کا ایک اور ماہر ڈاکٹر ہربرٹ مسکوف کہتا ہے :

"الکحل دماغ کے خلیوں کو کمزور کر دیتی ہے اور انسان کی مسائل کو سمجھنے کی قوّت کو تباہ کر دیتی ہے لیکن زیادہ اہم مسئلہ موروثی اثرات کا ہے۔ جس شخص کو الکحل نے شل کر کے رکھ دیا ہو اس کا فرزند سُست اور احمق ہوتا ہے۔ وہ کچھ سیکھنے کی قابلیّت نہیں رکھتا اور ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے بچّے ناقص پیدا ہوتے ہیں۔"

اس کانگریس اور ماہرین کی تحقیقات سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں ممکن ہے

وہ کچھ لوگوں کے معاملے میں مؤثر ثابت ہوں لیکن یقیناً یہ کوئی قطعی علاج نہیں ہے الکحل انسان کی زندگی میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہے اور اگر اس سے ہمہ پہلو جنگ کا آغاز نہ کیا گیا تو اس کی جڑیں زیادہ سخت ہو جائیں گی اور بہت سے لوگوں کو اپنے ہولناک جال میں دبوچ لیں گی۔

اس سائنسی تحقیقات کا مطالعہ ہمیں بے اختیار مقنّنِ اسلام کی بارگاہ میں تعظیم بجالانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ واضع قانون جس نے تجربہ گاہوں اور لیبارٹریوں کے وجود میں آنے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام سے چودہ سو سال قبل الکحلی مشروبات کو حرام قرار دیا حتّٰی کہ اس کے ایک قطرے کے بھی ممنوع ہونے کا اعلان فرمایا۔

شیعہ مجتہدِ اعظم حضرت آیت اللہ بروجردی قدس سرہٗ کے حینِ حیات میں بین الاقوامی ادارۂ جنگ با الکحل کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر آرشہ تونک نے ایران کا سفر کیا اور اسی سفر کے دوران اس امر کے خواستگار ہوئے کہ شیعیانِ عالم کے رہنما کی خدمت میں شرف یاب ہوں اور ان سے کچھ سوالات کریں۔ انھیں یہ شرفیابی تہران یونیورسٹی کے ایک استاد اور ایران کی "انجمن مبارزہ با تریاک والکحل" کے سکریٹری کے توسّط سے حاصل ہوگئی۔ اس ملاقات کے دوران کیے گئے مذاکرات کا خلاصہ مذکورہ استاد اور انجمن کے سکریٹری کی زبانی سُنیے:

"پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق میں آرشہ تونک سکریٹری جنرل بین الاقوامی ادارۂ جنگ با الکحل کے ہمراہ حضرت آیت اللہ العظمیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے اور جناب آرشہ تونک نے اپنے جوتے کمرے کے باہر اُتار دیے اور کمرے میں داخل ہو کر ہم دونوں حضرت آیت اللہ کی دست بوسی کے لیے آگے بڑھے۔ آپ کی سادہ اور بے ریا وضع غیر معمولی طور پر پُر کشش تھی۔ حضرت آیت اللہ

نے دلکش چہرے، خندہ پیشانی اور تسکین بخش نگاہ سے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا اور احوال پُرسی کی۔ میں نے اس بات پر اظہارِ تشکّر کے بعد کہ حضرت آیت اللہ نے ہمیں شرف باریابی بخشا عرض کیا کہ جناب آرشہ تونک سوئٹزرلینڈ کے باشندے ہیں اور بین الاقوامی ادارۂ جنگ باالکحل کے سکریٹری جنرل ہیں۔ انھیں اپنے مقصد (یعنی الکحل سے جنگ) کی پیشرفت کے سلسلے میں انڈونیشیا اور تہران کا دورہ کرنے کے بعد اس امر کا بے حد اشتیاق پیدا ہوا کہ حضرتِ عالی کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل کریں اور آپ کی دست بوسی کریں اور اب چاہتے ہیں کہ آپ ان کے سوالوں کے جواب مرحمت فرمائیں۔

حضرت آیت اللہ نے سوال کرنے کی اجازت دی تب جناب آرشہ تونک نے پوچھا:

"حضرت آیت اللہ! اسلام میں الکحل اور نشہ آور مواد کے استعمال کی ممانعت کیوں کی گئی ہے؟"

آپ نے جواب میں فرمایا:

"انسان چونکہ عقل رکھتا ہے اس لیے اسے اشرف المخلوقات سمجھا جاتا ہے اور بلاشبہ اس کی تخلیق کا مقصد خداشناسی میں کمال حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شعور اور عقل کی جو گراں بہا نعمت ہمیں بخشی ہے اس کی حفاظت کے لیے اس نے احکام بھی دیے ہیں۔ اسی سلسلے میں رسولِ اکرمؐ نے الکحلی مواد کا استعمال کرنا — جو سستی اور اختلالِ عقل کا موجب ہوتا ہے حرام قرار دیا ہے اور اس تحریم کی ضرورت عقلِ سلیم کے لیے قطعی اور لازمی ہے۔"

جناب تونک نے دوبارہ پوچھا:

"اگر الکحلی مشروبات کا استعمال مستی کی حد تک پہنچ جائے تو عقل اور شعور کو مختل کر دیتا ہے لیکن اگر وہ تھوڑی مقدار میں استعمال کیے جائیں اور ان کا نتیجہ مستی کی صورت میں نہ نکلے تو اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

حضرت آیت اللہ نے فرمایا:

"جب اس بات کا پتا چل گیا کہ انسان کو حیوانات پر عقل و شعور کی بنا پر فضیلت حاصل ہے اور جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ انسان کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ان آسمانی عطیات یعنی انسانی عقل و شعور اور ادراک کی حفاظت کی پوری پوری کوشش کرے تو پھر جو چیز ان قوّتوں کو سست کرے وہ جائز نہیں ہو گی اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ الکحلی مشروبات کا پینا خواہ ان کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو حواس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرا موضوع جو اہمیّت کا حامل ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی طبع کی خصوصیات سے مکمّل طور پر واقف ہے اور جانتا ہے کہ مخلوق کی طبیعت زیادہ کی طلبگار ہوتی ہے لہٰذا اگر وہ ان چیزوں کی کم مقدار کو جائز قرار دیتا تو ان کی حدود کا تعیّن اشکال سے خالی نہ ہوتا۔ پس اس مقصد کے پیشِ نظر کہ انسان مستی کی مصیبت سے نجات پائے جو اس کی ہستی کے ساتھ میل نہیں کھاتی اُس نے ان چیزوں کو خواہ وہ تھوڑی ہوں یا زیادہ، حرام قرار دیا ہے۔"

جناب تونک نے حضرت آیت اللہ کا دوسرا جواب سُن کر عرض کیا:

"دس سال سے زیادہ عرصے سے، دنیا میں الکحل کے خلاف جنگ کے ادارے کا انتظام میرے سپرد ہے اور اس مدّت میں میں نے

مختلف ممالک کی بڑی بڑی مذہبی، سیاسی اور اجتماعی شخصیتوں سے مفصّل مذاکرات کیے ہیں لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ جس جامع اور مدلل طریقے سے آپ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ایسا کسی اور نے نہیں کیا اور دنیا میں الکحلی مواد کے استعمال کے خلاف جنگ میں آپ کے ارشادات ہمارے لیے سب سے بڑی سند ہوں گے۔

فی الحقیقت ہمارے لیے حصولِ مقصد کا سب سے بڑا ذریعہ اسلام کے گرامی قدر پیشواؤں کے احکامات کی پیروی ہے۔ میں اپنی جانب سے اور الکحل کے خلاف جنگ کے تمام بین الاقوامی اداروں کی جانب سے حضرت آیت اللہ کا شکر گزار ہوں اور امّید کرتا ہوں کہ آپ کی رہنمائی کی بدولت ہم اس مقدّس جنگ میں کامیاب ہوں گے۔"

انگریز دانشور بنتھام (Bentham) اپنی کتاب اصولِ شرائع میں کہتا ہے:

"(حضرت) محمد کے آیئن کے بڑے بڑے احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے تمام نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔"

عظیم فرانسیسی سیّاح اور مصنّف پیر لوتی (Pierre Loti) کہتا ہے:

"مجھے اپنے آپ کو مسلمانوں کے زُمرے میں شمار کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی کیونکہ میں نے کبھی بھی شراب یا منشّی اشیاء سے اپنے ہونٹ آلودہ نہیں کیے۔"

قریش کے کچھ لوگ مسجد الحرام میں بیٹھے تھے۔ دریں اثنا پانچویں امام محمّد الباقر علیہ السّلام وارد ہوئے۔ ان میں سے ایک آدمی نے آپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دوسروں سے کہا:

"یہ شخص عراق کے لوگوں کا پیشوا ہے۔"

چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ ایک شخص جائے اور آپ سے کوئی مسئلہ پوچھے۔
ایک جوان اُٹھا اور امامؑ کے پاس جاکر پوچھا:
"کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟"
امام علیہ السّلام نے جواب دیا:
"شراب نوشی"۔
وہ جوان لوٹ گیا اور اپنے ساتھیوں کو اطّلاع دی۔ انھوں نے اس سے کہا کہ دوبارہ آپ کے پاس جائے اور یہی سوال کرے۔ وہ جوان دوبارہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سوال دہرایا۔
امامؑ نے فرمایا:
"میں نے تجھے بتا تو دیا ہے کہ سب سے بڑا گناہ شراب نوشی ہے"۔
وہ جوان اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ انھوں نے تیسری دفعہ اصرار کرکے اسے امامؑ کے پاس بھیجا اور اس نے وہی سوال پھر پوچھا۔
تیسری دفعہ امامؑ نے خندہ پیشانی سے فرمایا:
"شراب نوشی سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ یہ انسان کو زنا، چوری، قتلِ انسانی اور شرک بخدا کی جانب راغب کرتی ہے اور جن گناہوں کا ارتکاب شراب نوشی کی بنا پر کیا جائے وہ تمام گناہوں سے بڑے ہیں"۔[1]
ایک شخص امام جعفر الصّادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو کیوں حرام قرار دیا ہے جب کہ اس کی لذّت تمام دوسری لذّتوں سے بڑھ کر ہے۔
امامؑ نے فرمایا:

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۷ ۔ فروع الکافی۔ جلد ۶

"اللہ نے شراب کو حرام کیا ہے کیونکہ یہ اُمّ الخبائث اور تمام برائیوں اور ناپاکیوں کی جڑ ہے۔ شرابی مستی کی حالت میں عقل کھو بیٹھتا ہے، اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا، ہر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، دوسروں کی توہین کرتا ہے، قطع رحمی کرتا ہے، ناپاکیوں اور آوارہ گردی میں آلودہ ہو جاتا ہے۔ مست شخص پر شیطان کو اختیار حاصل ہے۔ اگر شیطان اسے حکم دے کہ بت کو سجدہ کر تو وہ کرتا ہے اور وہ اسے جدھر کھینچتا ہے اُدھر ہی چلا جاتا ہے۔" [1]

اسلام سے پہلے اور اسی طرح رسولِ اکرمؐ کی بعثت کی ابتدائی مدّت میں شراب کی تیّاری اور خرید و فروخت کا شمار عربوں کے اہم کاروبار میں ہوتا تھا، حتّیٰ کہ تجارت کا لفظ اصطلاحاً صرف شراب کے لین دین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور "تاجر" وہ شخص کہلاتا تھا جو شراب کا کاروبار کرتا تھا۔ [2]

جب اسلام کا سورج طلوع ہوا اور اس کی حیات بخش تعلیمات ایک ایک کر کے لوگوں تک پہنچا دی گئیں تو شراب خواری بھی جو بہت سی بدبختیوں اور مضرتوں کا موجب تھی ممنوع قرار دی گئی۔ اسلام میں الکحلی مشروبات کی تحریم اتنی حقیقی اور قطعی تھی کہ قلیل مدّت میں اس تباہ کن مرض کی جڑیں اسلامی معاشرے سے اُکھاڑ دی گئیں۔

اسلام نے صرف شراب خواری کو ہی نہیں بلکہ شراب سازی، شراب فروشی اور شراب سے مربوط تمام کاموں کو حرام قرار دیا۔

رسولِ اکرمؐ نے کئی ایک ایسے اشخاص پر لعنت بھیجی ہے جن کا الکحلی مشروبات سے کسی قسم کا تعلّق بھی ہو سکتا ہو، مثلاً:

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۷۔ احتجاج طبرسی [2] المنجد، تجر

۱ ۔ جو شخص انگور کی کاشت شراب تیّار کرنے کی غرض سے کرے۔
۲ ۔ جو شخص انگور کو شراب تیار کرنے کے لیے نچوڑے۔
۳ ۔ جو شخص شراب بیچے۔
۴ ۔ جو شخص شراب خریدے۔
۵ ۔ جو شخص شراب پیے۔
۶ ۔ جو شخص شراب کا گلاس کسی کے ہاتھ میں تھمائے۔
۷ ۔ جو شخص شراب کے سودے سے کسی قسم کا کوئی فائدہ حاصل کرے۔[۱]

امام جعفر الصّادق ؑ نے فرمایا ہے:

"شرابیوں کے ساتھ مل کر نہ بیٹھو کیونکہ جب کبھی ان پر لعنت نازل ہو گی تو تمام اہلِ مجلس پر محیط ہو جائے گی"۔

اسلام کے واضع قانون نے جو عامّۃ النّاس اور ان کی اولاد اور معاشرے پر شراب کے بد اثرات سے پوری طرح آگاہ تھے شراب کے پینے، تیّار کرنے، تقسیم کرنے اور خرید و فروخت کو مسلمانوں پر حرام کرنے کے علاوہ انھیں شرابیوں سے شادی بیاہ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ ماں باپ کی شراب خواری نطفے پر اثر انداز ہوتی ہے اور اولاد کو بیمار، فاسد، جرائم پیشہ اور ناقص بناتی ہے۔

امام جعفر الصادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَنْ زَوَّجَ کَرِیْمَتَهُ مِنْ شَارِبِ خَمْرٍ فَقَدْ قَطَعَ رَحِمَهَا[۲]

"جو شخص اپنی بیٹی کا بیاہ کسی شرابی سے کرتا ہے وہ اپنی بیٹی سے قطع رحم کرتا ہے"۔

---

[۱] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۷ ۔ خصال ۔ عقاب الاعمال۔

[۲] وسائل الشیعہ۔ جلد ۵۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ بَعْدَ مَا حَرَّمَهَا اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِيْ فَلَيْسَ بِاَهْلٍ اَنْ يُزَوَّجَ اِذَا خَطَبَ وَلَا يُشَفَّعَ اِذَا شَفِعَ وَلَا يُصَدَّقَ اِذَا حَدَّثَ وَلَا يُؤْتَمَنَ عَلٰى اَمَانَةٍ فَمَنِ ائْتَمَنَهُ بَعْدَ عِلْمِهِ فَلَيْسَ لِلَّذِي ائْتَمَنَهُ عَلَى اللّٰهِ ضَمَانٌ وَلَيْسَ لَهُ اَجْرٌ وَلَا خَلَفٌ۔[1]

"اس کے بعد کہ اللہ نے میرے وسیلے سے شراب خواری کو حرام فرمایا جو شخص شراب پیے اگر وہ کسی عورت سے شادی کا خواستگار ہو تو اُسے لڑکی کا رشتہ دینا مناسب نہیں اور اگر کوئی شخص اس کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہیں کرنی چاہیئے اور اگر وہ کوئی حدیث روایت کرے تو اس کی تصدیق نہیں کرنی چاہیئے اور کسی شخص کے لیے مناسب نہیں کہ اُسے امانت دار سمجھے اور امانت اس کے سپرد کر دے اور اگر کوئی شخص اس کے شراب خوار ہونے کے بارے میں جانتے ہوئے کوئی امانت اس کے سپُرد کر دے تو اللہ اس کی امانت کا ضامن نہیں ہے اور اگر اس کی امانت ضائع ہو جائے تو نہ ہی اللہ کے نزدیک اس کا کوئی اجر ہے اور نہ ہی اللہ اس کی تلافی کرے گا۔"

اس بارے میں رسولِ اکرمؐ اور ائمۂ طاہرین علیہم السّلام سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اور بالخصوص نشے کی حالت میں استقرارِ حمل کی جانب بہت توجّہ دی گئی ہے کیونکہ اس حالت میں نطفے کا ٹھہرنا بڑے خطرے کا موجب ہے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

---

[1] لئالی الاخبار صفحہ ۲۶۷

اَیُّمَا اِمْرَأَۃٍ اَطَاعَتْ زَوْجَهَا وَهُوَ شَارِبُ الْخَمْرِ كَانَ لَهَا مِنَ الْخَطَايَا بِعَدَدِ نُجُوْمِ السَّمَاءِ وَكُلُّ مَوْلُوْدٍ يَلِدُ مِنْهُ فَهُوَ نَجِسٌ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهَا صَرْفًا وَلَا عَدْلًا حَتّٰی يَمُوْتَ زَوْجُهَا اَوْ خَلَعَ عَنْهُ نَفْسَهَا۔

"جو عورت اپنے آپ کو مست شوہر کے سپرد کردے وہ آسمان کے ستاروں کی تعداد جتنے گناہوں اور خطاؤں کی مرتکب ہوتی ہے اور اُس آدمی سے جو فرزند وجود میں آئے وہ ناپاک اور پلید ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس عورت کی کوئی توبہ یا فدیہ قبول نہیں کرتا بجز اس کے کہ اس کا شوہر مرجائے یا وہ اپنے آپ کو اس مرد کے رشتۂ ازدواج سے آزاد کرلے۔"

دورِ حاضر کے دانشمند، نطفے پر الکحل کے منحوس اثرات کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتے اور سائنسی تحقیقات نے اس موضوع کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کیونکہ جو بچے ان حالات میں پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً ناقابلِ علاج اعصابی اور نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مشرق اور مغرب کے دانشمندوں کی سائنسی تحقیقات کے علاوہ تجربے نے بھی یہ بات ثابت کردی ہے کہ الکحل استعمال کرنے والے اشخاص کے بچے دوسرے بچوں کے مقابلے میں ضعیف، ناتواں اور پسماندہ ہوتے ہیں۔

بلاشبہ جنون، حماقت اور شراب خواری بچوں کی بناوٹ پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں اور ان عیوب میں مبتلا والدین کی جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ ناقص اور بدبخت ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے اپنی تعلیمات میں اپنے پیروؤں کو ضروری ہدایات دی ہیں اور انھیں بُرے اور ناپاک رشتوں سے خبردار کیا ہے۔

دورِ حاضر کے دانشمندوں نے بھی اس مسئلے کی جانب کافی توجّہ دی ہے اور اس قسم کی شادیوں سے اجتناب برتنے کی بے حد تاکید کی ہے حتیّٰ کہ امریکہ کے بعض ممالک میں نسل کو پاک رکھنے کے لیے خصوصی قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق جو لڑکے لڑکیاں بے حد وحساب شراب نوشی کی وجہ سے الکحلی جنون میں مبتلا ہو جائیں ان کی نس بندی کر دی جاتی ہے اور انھیں اولاد پیدا کرنے سے عملاً روک دیا جاتا ہے۔

شراب خواری کے نتیجے میں لوگوں کو ایک اور نقصان جو پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دماغوں کے خلیے اور اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں اور وہ گوناگوں امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

تہران یونیورسٹی کا ایک پروفیسر کہتا ہے:

"الکحل ایک مُخدِّر (سُن کر دینے والا) مواد ہے یعنی اعصاب کے سلسلے پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ الکحل دماغ کے خلیوں پر اثر کرتی ہے اور پاگل پن اور اختلالِ حواس کا باعث بنتی ہے۔"

تفسیر المنار میں آیت: یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ...... کے ذیل میں مفسّر ایک جرمن طبیب سے نقل کرتا ہے کہ اس نے حکومت سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"تم آدھے شراب خانوں کے دروازے بند کر دو تاکہ میں اس امر کی ضمانت دے سکوں کہ ملک آدھے ہسپتالوں، پاگل خانوں اور جیلوں سے بے نیاز ہو جائے گا"

اسلامی روایات میں شراب کے انسان کی عقل اور روح پر مُضر اثرات کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا ذکر شراب کی حرمت کی وجوہات کے باب میں آیا ہے۔

امام الرّضا علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ الْخَمْرَ لِمَا فِیْھَا مِنَ الْفَسَادِ وَبُطْلَانِ الْعُقُوْلِ فِی الْحَقَائِقِ وَذِھَابِ الْحَیَاۤءِ مِنَ الْوَجْہِ۔[1]

"اللہ نے الکحلی مشروبات کو ان خرابیوں کی بنا پر جو اس سے پیدا ہوتی ہیں اور اس وجہ سے کہ یہ عقل و خرد کو محو کرتی ہے اور شرم و حیا کو مٹا دیتی ہے حرام قرار دیا ہے۔"

امام السجاد علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

وَالذُّنُوْبُ الَّتِیْ تَھْتِکُ الْعِصَمَ شُرْبُ الْخَمْرِ وَاللَّعْبُ بِالْقِمَارِ۔[2]

"وہ گناہ جو گناہوں سے بچنے کی قوت (یعنی عقل اور عصمت) کو زائل کر دیتے ہیں اور انسان کی حفاظت کرنے والی ڈوری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں، شراب خواری اور قمار بازی سے عبارت ہیں۔"

نفسیات کا ایک ماہر کہتا ہے:

"الکحل شرم و حیا کو مٹا دیتی ہے، پاکدامنی کے پردے کو چاک کر دیتی ہے اور انسان کو معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی رسموں اور پابندیوں سے آزاد کر کے ضمیر کی آواز کو دبا دیتی ہے اور فرشتے کو شیطان میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پہلا قدم جو پاکدامنی کے راستے سے باہر رکھا جاتا ہے عموماً نشے کی حالت میں رکھا جاتا ہے کیونکہ جب نشہ آتا ہے تو عقل اور ضمیر کو نکال باہر پھینکتا ہے اور عقل اور ضمیر کی عدم موجودگی میں پاکدامنی کا کوئی مفہوم نہیں رہتا۔ جو لڑکیاں، عورتیں اور لڑکے گمراہ ہوتے

---

[1] مستدرک۔ جلد سوم [2] بحار الانوار۔ جلد ۱۶

ہیں وہ، وہ اشخاص ہوتے ہیں جو پہلے دخترِ رز (شراب) کا فریب کھاتے ہیں اور اس کی ہمراہی میں بھلائی کے راستے سے بھٹک جانے کے نتیجے کے طور پر زندگی کے وحشتناک بیابان میں سرگرداں پھرتے ہیں اور آخر کار نحوست اور بدبختی کی دلدل میں غرق ہو جاتے ہیں۔"

ٹالسٹائی کہتا ہے:

"لوگ الکحل کی اس خاصیت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ ضمیر کی آواز کو دبا دیتی ہے اور اسی وجہ سے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔"

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عام حالات میں اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ بُرے کام کریں یا ناشائستہ بات کہیں یا ناجائز حرکات کے مرتکب ہوں لیکن مستی کے عالم میں کسی بھی گناہ یا جرم کا ارتکاب کرنے سے نہیں جھجکتے۔

ڈاکٹر آلکسیس کارل کہتا ہے:

"ہوش اور عقلِ سلیم کی قوّت کی عام کمی الکحلی شراب کی تاثیر اور ہر قسم کی افراط کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے اور آخر کار عادات میں ابتری کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بلاشبہ الکحل کے استعمال کی مقدار اور ایک معاشرے کے فکری ضعف میں ایک تعلّق ہوتا ہے اُن تمام قوموں میں سے جو علمی کارنامے انجام دے رہی ہیں فرانسیسی سب سے زیادہ شراب پیتے ہیں اور سب سے کم نوبل انعام حاصل کرتے ہیں۔"

مندرجہ ذیل اعداد و شمار الکحل کے بُرے اثرات پر بہت حد تک روشنی ڈالتے ہیں۔

"بین الاقوامی کانگریس برائے جنگ باالکحل" کے سکریٹری آندرے مینونے

اعلان کیا کہ دیوانگی کے ۸۰ فی صد اور جنسی بیماریوں کے ۴۰ فی صد واقعات الکحل کے استعمال کے نتیجے میں رونما ہوتے ہیں۔ بچّوں میں ۶۰ فی صد احمق اور ۴۰ فی صد مجرم اُن گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں جن میں الکحل استعمال کی جاتی ہے۔

انسانی معاشروں کو شراب خواری کی وجہ سے جو نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں وہ دوسرے تمام نقصانات سے بڑھ کر ہیں اور جو اتلاف اس کے نتیجے میں ہوتا ہے وہ خطرناک ترین بیماریوں کے اتلاف سے زیادہ ہے۔

باصلاحیّت حکماء کے بیان کے مطابق الکحلی مشروبات سرطانِ معدہ، سرطانِ جگر، ورمِ معدہ، سل دق، دماغی امراض، اعصاب کی کمزوری، قوّتِ حافظہ کی کمزوری، نسل میں نامطلوب اثرات اور ہزاروں دوسری وحشتناک بیماریوں میں مبتلا ہونے کا باعث بنتے ہیں۔

شراب خواری کے عظیم سماجی نقصانات میں سے ایک نقصان ڈرائیونگ کے حادثات ہیں جو وادیوں میں تصادمات اور رکاوٹوں سے ٹکراؤ وغیرہ کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ طبّی بحثوں اور کثیر تجربات سے یہ پتا چلا ہے کہ شراب خواری کی وجہ سے ڈرائیوروں کی دیکھنے اور سننے کی قوّتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور توجّہ دینے اور خطرے کو بھانپنے کی قدرت کند پڑ جاتی ہے۔ خطرے کے وقت اس کا مداوا کرنے کی صلاحیّت میں بھی کمی آجاتی ہے اور ایک قسم کا جوش ان پر غلبہ پا لیتا ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جو اندوہناک حادثات کو جنم دیتے ہیں۔

ریاستہائے متّحدہ امریکہ کی سلامتی کونسل کے اعتراف کے مطابق جو اموات ڈرائیونگ کے حادثات کے نتیجے میں ہوتی ہیں ان میں سے ایک چوتھائی کا تعلّق ڈرائیوروں کی مستی سے ہوتا ہے۔

لیوگرین (Leograin) کہتا ہے:

"الکحل استعمال کرنے والوں کے ۷۶۱ بچوں میں سے ۳۲۲ فاسد، ۱۵۵ پاگل اور ۱۳۱ ایسے پیدا ہوتے ہیں جنہیں سکتے کی بیماری ہو سکتی ہے۔ دماغی امراض کے ہسپتالوں کے نفسیاتی مریضوں میں سے ۳۰ سے ۴۰ فی صد تک ایسے ہوتے ہیں جو شراب کے عادی ہوتے ہیں۔"

۱۳۴۴ھ میں ایران میں الکحلی مشروبات کے ذریعے زہر سے متاثر ہونے والے افراد کی تعداد ۱۸۷۵ تھی۔

الکحل جرائم کو جنم دینے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ۵۰ فیصد قتل کی وارداتوں، ۳۸ فی صد مضروب اور زخمی کرنے کی وارداتوں اور ۸۲ فی صد جان بوجھ کر آگ لگانے کی وارداتوں کی وجہ الکحل ازم تھی۔

اسلام نے ان اذیتوں اور مصیبتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس کے منبع کو بڑی احتیاط سے بند کر دیا ہے اور نتیجے کے طور پر ان بدبختیوں کی پیش بندی کر دی ہے۔

دینِ اسلام کہتا ہے:

"اس دسترخوان پر نہ بیٹھو جس کے اِرد گِرد لوگ شراب پی رہے ہوں۔ جن مجالس میں شراب پی جا رہی ہو ان میں خواہ تم شراب نہ بھی پیو تب بھی نہ بیٹھو۔ شرابیوں کی ہم نشینی اختیار نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی بُرائی تمھارے دامن کو بھی اپنی گرفت میں لے لے۔"

عبّاسی خلیفہ منصور کی فوج کے ایک افسر نے اپنے بیٹے کی رسم ختنہ کے سلسلے میں شہر حیرہ (عراق) میں ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس نے سربرآوردہ اشخاص اور بزرگوں کو اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی اور امام جعفر الصّادق علیہ السّلام بھی مدعوئین میں شامل تھے۔ جب مہمان دسترخوان کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے تو مدعوئین میں سے ایک نے پانی طلب کیا۔ مجلس کا خدمتگار پانی کی بجائے شراب سے بھرا ہوا ایک برتن

لے آیا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جونہی شراب دسترخوان پر لائی گئی امامِ عالیمقام اپنی جگہ سے اُٹھے اور دسترخوان کو چھوڑ کر چل دیے۔

صاحبِ خانہ آپ کے پیچھے دَوڑا اور آپ کے اقدام کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَلْعُوْنٌ مَنْ جَلَسَ عَلٰی مَائِدَۃٍ یُشْرَبُ عَلَیْھَا الْخَمْرُ۔

"رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے فرمایا: وہ شخص ملعون ہے جو ایسے دسترخوان پر بیٹھے جس پر دوسرے شراب پی رہے ہوں۔"

جن مطالب کا ذکر اوپر کیا گیا ان کے علاوہ صفحاتِ تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ شراب ایک ملک کی بربادی یا ایک خاندان کی تباہی کا موجب بنی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ خاندانِ برمک اپنی تمام تر عزّت اور اقتدار کے باوجود شراب خواری اور مستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اگر جعفر برمکی شرابی نہ ہوتا اور اگر شراب خواری کے زیر اثر اپنی قوّتِ تشخیص کھو نہ چکا ہوتا تو ہارون الرّشید کی بہن عبّاسہ کا مسئلہ کبھی کھڑا نہ ہوتا اور نہ ہی برمکیوں کا قتلِ عام ہوتا۔

اگرچہ برامکہ بعض گناہوں مثلاً امام الکاظم علیہ السّلام کے قتل میں شرکت کے نتیجے میں اس بدبختی سے دوچار ہوئے لیکن ان کی بدنصیبی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب جعفر نشے کی حالت میں تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جلال الدّین خوارزم شاہ کا دَورِ سلطنت شراب خواری اور عیّاشی کی وجہ سے ختم ہوا اور شراب کی خاطر وہ اپنی زندگی اور تخت و تاج سے ہاتھ

دھو بیٹھا۔

وہ طاقتور اور جنگجو بادشاہ جس نے سالہا سال منگولوں کی خونخوار افواج سے جنگ کی اور چنگیز خان اور اس کے لشکرِ جرّار کو پریشان کر کے رکھ دیا بالآخر شراب کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ان راتوں جب سلطان اپنے خیالات میں مگن عیش و نوش میں مصروف تھا اور شب و روز مستی اور لاپروائی کے عالم میں بسر کر رہا تھا اس کے معتمدِ خاص نورالدّین زیدری نے اس کے لیے یہ رباعی لکھّی:

شاہا زمے گراں چہ برخواہد خواست
وز مستیٔ بیکراں چہ برخواہد خواست
شہ مست وجہاں خراب و دشمن پس و پیش
پیداست کزایں میان چہ برخواہد خواست

"اے بادشاہ! اس تیز شراب کا کیا نتیجہ نکلے گا اور اس لامحدود مستی سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ بادشاہ مست ہے، ملک ویران ہے اور دشمن آگے پیچھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔"

لیکن سلطان اور اس کے ہم نشینوں نے اس کی باتوں کی طرف کوئی توجّہ نہ دی۔ وہ سب نشے میں چُور تھے۔ آدھی رات کے وقت منگول فوج نے ان پر ایک بلائے آسمانی کی مانند شب خون مارا اور سلطان کی فوج اور سراپردہ کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کا ایک درباری جسے حملے کا پتا چل گیا تھا اس کے سرہانے پہنچا اور بڑی کوشش کر کے اسے گہری نیند سے بیدار کیا اور سارا ماجرا کہہ سُنایا۔

سلطان اس قدر مخمور تھا کہ اس میں گھوڑے پر سوار ہونے کی سکت نہ تھی۔ شراب کا نشہ دور کرنے کے لیے اس نے ٹھنڈا پانی سر پر ڈالا لیکن افسوس کہ

دیر ہو چکی تھی اور فرار کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا لیکن ایک نامعلوم شخص نے گھوڑے اور مال کے لالچ میں اُسے کُردستان کی پہاڑیوں میں قتل کر دیا۔[1]

تاریخ بتاتی ہے کہ صفوی سلاطین کا دورِ حکومت شاہ طہماسپ کی شراب خواری کی وجہ سے رُو بہ زوال ہو گیا۔

شراب کی تباہ کاریوں کے بارے میں جو کچھ اب تک بیان کیا گیا وہ اِس جہان سے متعلّق تھا یعنی جسمانی اور رُوحانی نقصانات، انفرادی اور اجتماعی نقصانات، مالی خطرات اور نقصانات وغیرہ۔ تاہم ہم لوگوں کے لیے جو موحّد اور خداشناس ہیں اور مبدا اور معاد پر ایمان رکھتے ہیں الکحلی مشروبات کا مسئلہ ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی قابلِ غور ہے اور وہ ہے شراب کا اثر آخرت پر!

مسئلے کے اس پہلو پر توجّہ دینا بھی ضروری ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ساعت مدہوش رہنے اور ایک لحظہ لذّت اُٹھانے کے لیے شراب کے تمام نقصانات قبول کر لے اور اس کی تمام مضرّتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائے تاہم ایک مسلمان کسی قیمت پر بھی اس بات پر راضی نہیں ہو سکتا کہ ابدی دنیا کی خوش بختی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

امام الباقرؑ نے فرمایا ہے:

مُدْمِنُ الْخَمْرِ يَلْقَى اللّٰهَ كَعَابِدِ وَثَنٍ [2]

"شراب خوار اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عدل میں ایک بُت پرست کی مانند پیش ہوگا۔"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

---

[1] تاریخ کامل ایران صفحہ ۳۱۶ [2] وسائل الشیعہ، جلد ۱۷۔ عقاب الاعمال صفحہ ۲۵

حُرِّمَتِ الْجَنَّةُ عَلٰى ثَلَاثَةٍ ، مُدْمِنِ الْخَمْرِ ......

"اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے لوگوں پر بہشت حرام کر دی ہے۔ شراب خوار..."

رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے:

"اللہ کی قسم! جو شخص نماز کو سُبک سمجھتا ہو اور شراب پیتا ہو وہ میری شفاعت سے بہرہ مند نہ ہوگا اور حوضِ کوثر تک نہ پہنچے گا۔"

اس بحث کے خاتمے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فارسی ادب میں الکحلی مشروبات کی تباہ کاریوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جائیں۔

مندرجہ ذیل اشعار حکیم بزرگوار سنائی کے ہیں:

نکند دانا مستی، نخورد عاقل مے
ننہد مردِ خردمند سوئے پستی پے
چہ خوری چیزے کز خوردن آں چیز تو را
نے، چناں سرو نماید بنظر، سرو چو نے
گر کنی بخشش، گویند کہ مے کرد نہ او
ور کنی عربدہ، گویند کہ او کرد نہ مے

(دانا شخص مستی نہیں کرتا اور عقلمند آدمی شراب نہیں پیتا۔ خردمند انسان پستی کی جانب پاؤں نہیں رکھتا۔ تو وہ چیز کیوں پیتا ہے جس کے پینے سے نَے سرو کی مانند نظر آنے لگتی ہے اور سرو نَے کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ اگر تو بخشش کرے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے نہیں بلکہ شراب نے کی ہے اور اگر نشے کی وجہ سے ہنگامہ کرے تو کہتے ہیں کہ شراب نے نہیں بلکہ اس نے کیا ہے۔)

اسلام میں قمار بازی کی مخالفت

جوا اُن نقصان دہ تفریحات اور خطرناک سرگرمیوں میں سے ہے جو صدیوں سے بہت سے لوگوں میں رائج رہی ہیں اور جنھوں نے بہت سی خرابیوں کو جنم دیا ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی جُوا ایک وسیع تر سطح پر اور زیادہ جدید وسائل کے ساتھ دنیا کے لوگوں کے دل بہلاوے کا ذریعہ ہے اور انسانی معاشرہ پہلے سے بھی زیادہ اس تباہ کن تفریح کی خرابیوں کا شکار ہو گیا ہے۔

اقتصادی لحاظ سے جُوا بعض ممالک کے لیے آلاتِ قمار بازی کی تیّاری اور تجارت کی شکل میں یا بھاری ٹیکسوں کے حصُول کی بنا پر اہمیّت کا حامل ہے۔ بہت سے طبقے اس ذریعے سے اپنی روزی کماتے ہیں اور حکومت کے خزانے پُر ہوتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے کچھ ممالک میں جوئے کے لیے بڑے بڑے ادارے وجود میں آگئے ہیں اور دنیا کے امیر لوگ جُوا کھیلنے کے لیے وہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ یوں ان اداروں کے مالکان کو بے پناہ آمدنی ہوتی ہے اور اس کا کچھ حصّہ ملک کے خزانے

کو بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

جوئے کا اقتصادی پہلو آج سے چودہ سو سال پہلے مقنّنِ اسلام کی نظر میں تھا اور قرآنِ مجید میں اس کی وضاحت کی گئی ہے لیکن چونکہ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہیں اس لیے اسے حرام قرار دیا گیا تاکہ مسلمان مادّی فوائد حاصل کرنے کی خاطر ان سے کہیں عظیم تر مادّی اور روحانی نقصانات کا شکار نہ ہو جائیں۔

قرآنِ مجید میں خداوندِ عالم اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ[1]

"وہ لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ جواب میں کہہ دو کہ یہ دونوں بہت بڑے گناہ اور لوگوں کے لیے منافع کا موجب ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت زیادہ ہے۔"

اگرچہ حکومتیں جوئے سے پیدا ہونے والے خطرات سے بخوبی آگاہ ہیں لیکن اس سے حاصل ہونے والے منافع کی خاطر وہ اس پر تیّار نہیں کہ کوشش کر کے اِس لعنت کو ختم کر دیں۔

انگلستان میں ۱۸۵۳ء میں جوا ممنوع قرار دیا گیا لیکن قانونی پابندی کے بعد بھی اٹھّارہ جوئے خانے بڑے آدمیوں کے جوا کھیلنے کے لیے قائم تھے۔ امریکہ میں ۱۸۵۵ء میں اور جرمنی میں ۱۸۸۲ء میں جوئے پر پابندی لگائی گئی جبکہ اسلامی قانون نے ان متمدّن ممالک سے صدیوں پیشتر جوئے کو حرام قرار دے دیا تھا۔

اب امریکہ اور یورپ میں بہت بڑے بڑے جوئے خانے قائم ہیں جہاں دن رات

---

[1] سورۃ البقرۃ۔ آیت ۲۱۹

ہزاروں جواری دُور اور نزدیک کے مقامات سے ڈالروں کے صندوق بھر کر لاتے ہیں اور جُوا کھیلتے ہیں۔

ایک جریدے نے لاس ویگاس کے بارے میں جو امریکہ میں جوئے کا مرکز ہے یوں تحریر کیا:

"جو جواری یہاں آتے ہیں ان کی صحیح صحیح تعداد معلوم نہیں ہے لیکن اندازاً دن رات میں وہ چالیس ہزار سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس جوئے خانے میں ایک شخص نہیں بلکہ سینکڑوں اشخاص جُوا کھیلتے ہیں۔"

اس شہر کے 'صحرا ہوٹل' نامی ایک بڑے ہوٹل میں ارب پتیوں کا ایک مخصوص جُوا خانہ ہے فقط اس جُوا خانے میں دن رات میں ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ کا جُوا کھیلا جاتا ہے۔ سینکڑوں اشخاص (Stots) نامی برقی آلات کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے کرنسی کے سکے آلے میں ڈالتے جاتے ہیں اور چند سو یا چند ہزار ڈالر حاصل کرنے کی امید پر پُورا زور لگا کر آلے کے ہینڈل کو آگے کی جانب جھکاتے ہیں اور چونکہ عموماً ڈالروں کے گرنے کا پتا نہیں چلتا لہٰذا یہ کام مسلسل جاری رہتا ہے اور ڈالر آلے میں گرتے چلے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان اداروں کے مالکان کو جو بے حساب منافع ہوتا ہے وہ ان فسق و فجور کے مراکز کو بند کرنے میں آڑے آتا ہے۔

یہ جو ہم ان اداروں کو فسق و فجور کے مراکز کہہ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مراکز میں قسم قسم کی خرابیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں اور بڑے بڑے جرائم انجام پاتے ہیں۔

خبر رساں ایجنسیاں اور جرائد ہمیں جُوئے خانوں کی خباثتوں کے ایک پہلو سے روشناس کرتے ہیں:

"مانٹی کارلو (اٹلی) میں ارجنٹائن کا ایک باشندہ ۱۹ گھنٹے جُوا کھیل کر چالیس

لاکھ روپے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جب جُوا خانہ بند ہو گیا تو وہ سیدھا جنگل میں پہنچا اور سر پھوڑ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔"

شماریات کے گیلپ نامی ادارے نے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ جوئے کے نتیجے میں کی جانے والی خودکشی کی وارداتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مذکورہ بالا ادارے کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں سابقہ سالوں کے مقابلے میں زیادہ جواریوں نے اقدامِ خودکشی کیا۔

امریکہ کا شماریات کا ایک ادارہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ایک جواری تقریباً ۳۰ فی صد جرائم میں شریک ہوتا ہے۔

ایک امریکی ڈاکٹر سالہا سال کی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہر سال فقط امریکہ میں دو ہزار سے زائد افراد جوئے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ اس ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ جوا کھیلتے وقت جواریوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور ایک ماہر پوکر باز کا دل ایک منٹ میں عموماً سو سے زیادہ بار دھڑکتا ہے اور دل کی یہی غیر معمولی دھڑکن اس امر کا باعث بنتی ہے کہ یا تو جوئے کی میز کے پاس ہی جواریوں کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے اور یا وہ مقررہ وقت سے دس پندرہ سال پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔

جُوئے بازی کا ایک بہت بڑا نقصان جو سماجی اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور دوسری خرابیاں پیدا ہونے کا موجب بن سکتا ہے وہ دشمنی اور عداوت ہے جو جُوئے کی وجہ سے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

جُوا لوگوں کے دلوں میں قنوطیّت اور کینہ پروری کی حس بیدار کرتا ہے۔ دوستی محبّت اور اخلاص کو زائل کر دیتا ہے اور انتقام اور جذبۂ غضب پر عمل کے لیے میدان ہموار کرتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ [1]

"بس شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی پیدا کر دے اور تمھارے باہمی دوستانہ روابط کو ختم کر دے۔"

ایک مشہور ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

"پوکر کے کھیل میں اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ تخریبی جذبات کوئی تبدیلی پیدا کر دیں۔ پوکر کا کھیل خود جنگ اور مبارزہ پر مبنی ہے۔ اس کھیل میں جس حد تک قواعد وضوابط اجازت دیں ہر کھلاڑی کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کھلاڑی پر اپنا تسلّط قائم کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے فریق کو اپنی قوّت کے بارے میں دھوکے میں رکھّے یا جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے بلف (Bluff) کرے۔ کیونکہ کھیل کا مقصد یا تو دوسرے فریق کو خود اس کی اصلی قوّت کے بارے میں غلط فہمی ہے اور یا یہ کہ اس قوّت کا مظاہرہ کیا جائے۔"

شطرنج کی بازی بھی ہر لحاظ سے انسان کے لطافت اور اپنے تخریبی احساسات کی جانب میلان کا مظہر ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کھیل میں یہ دو ممالک میں جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ارنسٹ جانسن شطرنج کی نفسیات کے ماہرانہ مطالعے کے ضمن میں یوں رقمطراز ہے:

"یہ امر مسلّمہ ہے کہ جیسے کہ دوسرے کھیلوں کا خاصّہ ہے شطرنج کے

---

[1] سورۃ المائدۃ - آیت ۹۱

کھیل میں کھلاڑیوں کا جذبہ فقط مبارزہ طلبی کا نہیں ہوتا بلکہ ایک بدتر اور ناپسندیدہ تر جذبہ ہوتا ہے جو پدرکشی کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ اس کھیل کا مقصد قید کرنا اور مات دینا ہوتا ہے۔

جان ہنس اس بات پر ندامت محسوس کرتا تھا کہ جیل میں قیام کے دوران وہ شطرنج کھیلتا رہا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ایسا کر کے اس نے اپنے ناپسندیدہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔"

جو کچھ مذکورہ بالا ماہر نفسیات نے کہا ہے وہ مسئلے کا ایک پہلو ہے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جواریوں کو جو مادّی نقصانات پہنچتے ہیں ان کی وجہ سے جوئے بازی الجھنوں اور عداوتوں کا موجب بنتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب فریقین میں سے ایک کی دولت اور اثاثہ دوسرے کی جیب میں چلا جاتا ہے اور وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی دولت پر قبضہ جما لیتا ہے تو نقصان اٹھانے والے کے دل میں دشمنی کا بیج بویا جاتا ہے اور آخر کار اس دشمنی کے برے اثرات موافق اور مناسب موقع پر ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ سب کچھ ایک فطری امر ہے۔ ایک انسان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے حریف کے لیے دشمنی کو دل میں جگہ نہ دے جب وہ دیکھ رہا ہو کہ اس نے اس کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر قبضہ کر لیا ہے اور اس پر رتی بھر ترس کھانے کا روادار نہیں۔

مسئلے کا ایک اور پہلو جو دوسرے تمام پہلوؤں سے زیادہ اہم ہے ہار جیت کا موضوع ہے۔ جواری جوئے میں ہار جانے کے بعد شدید نفسیاتی ہیجان میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس شکست کی تلافی کے لیے اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار چھوڑ بیٹھتا ہے اور اس امید پر کھیل میں جٹا رہتا ہے کہ شاید اپنے

حریف پر غلبہ پالے اور اس طرح اپنی پریشان رُوح کو تسکین بخشے۔

ایک کثیرُ الاشاعت روزنامہ لکھتا ہے:

"ایک شہر میں ایک جواری نے چاقو کے تین وار کر کے اپنے حریف کا پہلو چاک کر دیا اور اسے قتل کر دیا جرح کے دوران اس نے کہا کہ مقتول نے مجھ سے بہت سی رقم حاصل کر لی اور پھر نئے سرے سے کھیلنے پر تیار نہ ہوا۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے کھیل جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور بھاگ نکلا۔ میں نے بھی اس کا پیچھا کیا اور..."

اگر کھیل جاری رکھنے پر بھی جواری ہار سے دوچار ہو جائے تو وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ جُوا ترک کرنے پر تیّار نہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ جیتنے کی اُمّید پر وہ مادّی سرمائے کے علاوہ اپنا سرمایۂ شرافت بھی میدان میں لے آئے اور دیوانہ وار جُوئے کی بھٹّی میں جھونک دے۔

ظہورِ اسلام سے قبل دورِ جاہلیّت کے لوگ مختلف طریقوں سے جُوا کھیلتے تھے۔ جُواری پہلے اپنا سرمایہ اور دولت اور پھر اپنا گھر اور جائداد داؤ پر لگا دیتے تھے۔ جب ایک جواری اپنی تمام دولت اور پونجی ہار جاتا تو اپنی بیوی کو داؤ پر لگا دیتا اور اگر بیوی کو بھی ہار جاتا تو بڑی ڈھٹائی سے اُسے جیتنے والے کے سپرد کر دیتا۔

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

كَانَتْ قُرَيْشٌ تُقَامِرُ الرَّجُلَ بِأَهْلِهِ وَمَالِهِ فَنَهَاهُمُ اللّٰهُ عَنْ ذَالِكَ [1]

"قریش اپنی دولت اور بیویوں کو جُوئے اور ہار جیت میں لگا دیتے تھے اور ان پر بازی لگاتے تھے۔ اللہ تعالٰی نے اس بُرے کام کو

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۱۱

حرام قرار دیا اور لوگوں کو جُوا کھیلنے سے منع فرمایا۔"

شاید یہ بات بہت سے لوگوں کو عجیب لگے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اس حد تک پست ہو جائے کہ اپنی عزّت اور ناموس کو بھی داؤ پر لگا دے لیکن دنیا کے اطراف واکناف میں آجکل کے متمدّن ممالک میں جو حوادث رُونما ہو رہے ہیں اُنھیں دیکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ جوُئے بازی میں مبتلا ہونے کے بعد ممکن ہے کہ ہر شخص اس صورتِ حال سے دوچار ہو جائے۔

مندرجہ ذیل رپورٹ ملاحظہ فرمائیے:

"میکسیکو۔ ایجنسی فرانس۔ ۲۵ نومبر۔ میکسیکو ٹیلی ویژن کے جاز آرکسٹرا کے ایک رکن ریکارڈو لیموس نے جو پوکر کے کھیل کا شوقین تھا گزشتہ رات اپنے گھر پر جوُئے کی ایک مجلس تشکیل دی۔ اپنی تمام دولت ہار جانے کے بعد اس نے اپنی واحد باقیماندہ چیز کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کیا اور وہ اس کی بیوی تھی۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کھیل کے خاتمے پر وہ اپنی بیوی کو بھی ہار گیا اور جب اس کی بیوی اس کے اصرار کے باوجود اپنے آپ کو جیتنے والے کے حوالے کرنے پر تیّار نہ ہوئی تو اس نے اُسے اس قدر پیٹا کہ وہ بے حال ہو گئی۔ اب وہ بدنصیب عورت ہسپتال میں داخل ہے اور اس کے اچّھا ہونے کی کوئی اُمّید نہیں ہے۔"

جو فعل انسان کو پستی اور کمینگی کی اس منزل پر پہنچا دے اور مصیبت اور بدبختی کا موجب بن جائے وہ عقل کی منطق کی رُو سے ممنوع ہو گا۔

اسلام نے جو عقل اور منطق کا مذہب ہے۔ قرآن مجید کی تصریحات اور اہلبیت علیہم السّلام کی روایات کے مطابق چودہ سو سال قبل جوئے کی تمام اقسام

کو مسلمانوں پر حرام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جوئے کے آلات تیار کرنے اور ان کی خرید و فروخت کو بھی حرام سمجھا۔ جو آمدنی جوئے اور ہار جیت سے ہوتی ہے اسے غیر قانونی اور غیر مشروع قرار دیا اور مسلمانوں کو ایسا مال استعمال کرنے سے منع کیا۔

امام الرضا علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى نَهٰى عَنْ جَمِيْعِ الْقِمَارِ وَأَمَرَ الْعِبَادَ بِالْاِجْتِنَابِ مِنْهَا وَسَمَّاهَا رِجْسًا فَقَالَ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ مِثْلَ اللَّعْبِ بِالشِّطْرَنْجِ وَالنَّرْدِ وَغَيْرِهِمَا مِنَ الْقِمَارِ وَالنَّرْدُ أَشَدُّ مِنَ الشِّطْرَنْجِ [1]

"اللہ تبارک و تعالیٰ نے جوئے کی تمام اقسام کو حرام قرار دیا ہے اور لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اس سے اجتناب برتیں۔ اللہ نے جوئے کو نجاست کہا ہے اور اسے شیطانی عمل بتایا ہے اور لوگوں کو شطرنج اور چوسر کی طرح اس میں بھی آلودہ ہونے سے خبردار کیا ہے اور جوئے اور چوسر کے کھیل کی تمام اقسام کو شطرنج کے کھیل سے بدتر قرار دیا ہے۔"

امام الباقر علیہ السّلام نے فرمایا:

"جب آیہ شریفہ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ [2]

نازل ہوئی تو لوگوں نے رسولِ اکرمؐ سے پوچھا کہ مَیسر کیا چیز ہے (جسے اللہ تعالیٰ نے نجس اور شیطانی کام کہا ہے) آپ نے فرمایا کہ ہر وہ کام جس میں جوا اور کسی چیز کا جیتنا اور ہارنا ہو حتیٰ کہ انگلیوں کے

---

[1] مستدرک الوسائل، جلد دوم [2] سورۃ المائدۃ - آیت ۹۰

پوُروں کی ہڈیوں اور اخروٹوں سے جُوا کھیلنا بھی"[1]

مشہور ماہرِ نفسیات ک۔ پلاتونف کہتا ہے:

"سوویٹ روس کی تفریح گاہوں میں جوئے اور تاش کے ایسے کھیلوں کی جو شرط لگا کر کھیلے جائیں قطعی ممانعت کر دی گئی ہے...... ۱۶۴۶ء میں روس میں تاش کا رواج ہوا اور اسی سال اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ حرص اور جیتنے کا شوق جواری کو کھیل جاری رکھنے پر زیادہ اُکساتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کی عقل کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے جوش و خروش کی نظیر مختلف اقسام کے جوئے اور کھیلوں میں ملتی ہے مثلاً روسی بچّوں کا ایک مخصوص کھیل ایسا ہے جس میں اگرچہ ان ضربات کی وجہ سے جو وہ ایک دوسرے کو لگاتے ہیں دونوں بچّوں کے ہاتھوں کے پچھلے حصّے سُرخ ہو جاتے ہیں اور ان میں شدید درد ہوتا ہے پھر بھی چونکہ وہ کھیل میں سرگرم ہوتے ہیں اس لیے مارنے سے باز نہیں آتے اور ان میں سے کوئی بھی کھیل ختم کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی مقابلوں کے تماشائیوں کی حالت بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ جو جُواری حرص و ہوس میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ کبھی بھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا کچھ گنوا بیٹھا ہے اور اپنے اعصاب پر قابو پانے میں کس قدر بے بس ہو گیا ہے۔"

امام الباقر علیہ السّلام نے ارشاد فرمایا ہے:

يَدْخُلُ فِي الْمَيْسِرِ اللَّعِبُ بِالشِّطْرَنْجِ وَالنَّرْدِ وَ غَيْرِ ذٰلِكَ مِنْ اَنْوَاعِ الْقِمَارِ۔

"جوئے کی تحریم شطرنج اور چوسر کھیلنے اور جوئے کی دوسری تمام

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ششم، صفحہ ۱۴۴

اقسام پر محیط ہے"۔

اسلامی معاشرہ اسلام کی تعلیماتِ عالیہ کے زیرِ سایہ اس ہلاکت خیز بلا سے اجتناب کرتا رہا ہے اور کرتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ استعمار پرستوں اور اسلام کے دشمنوں نے اسے کسی نہ کسی حد تک نادان لوگوں میں رائج کر دیا ہے اور بدقسمتی سے بعض گھرانوں میں جُوئے کی سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں۔

جوئے بازی سطحی اور ظاہر بین جدت پسندوں میں بالخصوص رائج ہو گئی ہے۔ وہ لوگ محض اس لیے اس ناپسندیدہ عادت میں ملوّث ہو گئے ہیں تاکہ مغرب کی تقلید کریں اور یوں اپنے ملنے جلنے والوں میں متمدّن اور روشن خیال سمجھے جائیں۔ حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں جواری کن مصیبتوں سے دوچار ہوتے ہیں اور جُوا اور جواری کس قدر چاقو زنی، چوری اور خودکشی کی وارداتوں اور برائیوں کا موجب بنتے ہیں۔

ہفت روزہ مجلّہ "اطّلاعات" (تہران) کے شمارہ ۱۵۲۱ میں یورپ کے بارے میں شائع ہونے والی ایک ایسی خبر کا اقتباس ذیل میں دیا جا رہا ہے جو جُوئے کے رسیا لوگوں کے لیے موجبِ عبرت ہونی چاہیے۔

یہ ہے اُس خبر کا متن جس کا عنوان ہے: "جواریوں کے بادشاہ نے خودکشی کر لی"۔

"جرمنی کے مشہور ارب پتی اور اس ملک کے جواریوں کے بادشاہ نے اس ہفتے خودکشی کر لی جب کہ وہ کئی ایک کیسینو (Casino) کا ایک کروڑ مارک کا مقروض تھا۔ یہ ارب پتی جس کا نام رولف لودر تھا کئی سال پہلے جب کہ وہ ابھی اتنا امیر نہیں ہوا تھا کہا کرتا تھا: "یقین رکھیے جب بھی کسی مہینے میری ماہانہ آمدنی دس ہزار مارک سے کم ہو جائے گی

میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔" اور بالآخر اسے ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی۔

جنگِ عظیم کے بعد تک لودر کے پاس جرمنی میں کوئی دولت نہ تھی لیکن جنگ کے بعد اس نے تجارت شروع کر دی اور تھوڑی ہی مدت میں اپنی غیر معمولی استعداد کی بدولت کافی امیر ہو گیا حتیٰ کہ ایک سودے میں اس نے ایک کروڑ مارک نفع کمایا۔ یہ رقم اس نے اسٹاک ایکسچینج میں لگا دی جس سے اسے مزید رقوم حاصل ہوئیں۔

لودر جوئے اور بالخصوص رولت (Roulette) کے کھیل سے بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ ہر رات وہ دنیا کے مشہور قمار خانوں کی جانب رجوع کرتا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رولت میں جیت جاتا۔ اس کے ایک ساتھی کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی دولت کا بہت بڑا حصّہ جوئے اور بالخصوص رولت کے کھیل سے کمایا ہے۔ اس کی جیتی ہوئی رقم بھی بہت بڑی ہوتی اور ہر دفعہ ایک لاکھ مارک سے تجاوز کر جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ قمار خانوں میں اسے جواریوں کے بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ قمار خانے میں جس میز کے قریب جاتا قمار خانے کا مالک اپنے کاروبار کا حساب کتاب کرتا اور سمجھ جاتا کہ اسے کافی رقم ہارنی ہو گی۔

دو سال پہلے تک وہ جتنی مدت جُوا کھیلا صرف چار دفعہ ہارا اور کل جتنی رقم اس نے ہاری وہ پچاس لاکھ مارک سے زیادہ نہیں تھی لیکن گزشتہ دو سال کے دوران میں لودر کا نصیبہ اچانک بگڑ گیا اور وہ جوئے میں مسلسل ہارنے لگا۔

اسٹاک ایکسچینج کے سودوں سے لودر کو ہر روز معقول رقم ہاتھ لگتی تھی لیکن رات کو وہ اس منافع سے دُگنا یا تگنا جُوئے میں ہار جاتا تھا چنانچہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ جرمنی کے قمار خانوں میں قسمت نے اس سے منہ موڑ لیا ہے اس نے اپنے کھیل کا اڈّہ بدل لیا اور ماؤنٹ کارلو (امریکہ) چلا گیا لیکن وہاں بھی تقریباً اسی لاکھ مارک ہار گیا۔

رفتہ رفتہ لودر کی خوشی اور چُستی زائل ہوتی گئی اور چونکہ راتوں کو ہار کر وہ بے حد پریشان اور مضطرب ہو جاتا تھا اس لیے دن کے وقت اسٹاک ایکسچینج میں بھی ٹھیک طور پر کام نہ کر سکتا تھا چنانچہ اس کی آمدنی گھٹتی جا رہی تھی اور وہ اپنی خطیر دولت مسلسل کھو رہا تھا۔

ایک مہینہ قبل تک اربوں کی دولت میں سے لودر کے پاس چند ذاتی وِلا (امیر لوگوں کا دیہاتی مسکن) رہ گئے تھے۔ اس نے وہ بھی بیچ ڈالے اور نقد رقم حاصل کر لی اور اپنے دوستوں سے کہا: ''اس رقم سے میں اپنی ہاری ہوئی دولت واپس لے لوں گا''

لودر پہلے ہمبرگ کے نزدیک تراوہ موند کے قمار خانے میں اور پھر ماؤنٹ کارلو گیا لیکن دونوں جگہ ہار گیا اور اپنی تمام پونجی کھو بیٹھا اس کے علاوہ وہ ایک کروڑ کا مقروض بھی ہو گیا۔ اب اسے کسی چیز کی امّید باقی نہ رہی۔

ان حالات میں وہ 'کلن' میں اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں گیا اور خودکشی کے ارادے سے خواب آور گولیوں کی ایک ٹیوب کھا لی۔ اس کی لاش اس کے مرنے کے ۲۴ گھنٹے بعد اس اپارٹمنٹ سے

برآمد کی گئی۔"

ایک اور عبرت خیز خبر

(ایران میں) "ایک نوجوان نے ایک کیسینو میں چار لاکھ اسّی ہزار تومان ہار کر خودکشی کر لی۔" (مجلۂ فردوسی۔ شمارہ ۹۹۸)

یہ جواریوں کے انجام کے نمونے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ ساری عمر محنت کر کے اور اربوں کی تعداد میں دولت ہوتے ہوئے جب انسان جوئے کی بری عادت میں گرفتار ہوتا ہے تو اپنی جسمانی اور روحانی صحّت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے مفلوک اور پریشان حال ہو جاتا ہے اور ان بدبختیوں سے نجات پانے کے لیے جنھیں وہ خود اپنے لیے پیدا کرتا ہے اس کے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ جوئے سے جنم لینے والے جرائم فقط مغرب اور ارب پتیوں تک ہی محدود ہیں لیکن ملک کے جرائد میں جوئے سے پیدا ہونے والے جن حوادث کی خبریں چھپتی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ جوئے کی جہاں بھی رسائی ہو بدبختی اور جرائم اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور جو شخص جوئے میں آلودہ ہو اُسے اِس سے رُونما ہونے والے دردناک حوادث کا بھی منتظر رہنا چاہیے۔

کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم مقنّنِ اسلام کی بارگاہِ اقدس میں خلوص و عقیدت کے تحفے پیش کریں جس نے چودہ سو سال پیشتر صریحاً فرما دیا تھا کہ:

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ [1]

---

[1] سورۃ المائدۃ، آیت ۹۱

دو شیطان کی تو بس یہی تمنّا ہے کہ شراب اور جُوے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی پیدا کر دے اور تمھارے باہمی روابط کو ختم کر دے۔"

امام الرضا علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اِتَّقِ اللَّعِبَ بِالْخَوَاتِيْمِ وَالْاَرْبَعَةَ عَشَرَ وَكُلَّ قِمَارٍ حَتّٰى لَعِبُ الصِّبْيَانِ بِالْجَوْزِ وَاللَّوْزِ وَالْكِعَابِ [1]

دو خواتیم، اربعہ عشر (جُوئے کے آلات تھے جن سے جُوا کھیلا جاتا تھا)

اور جُوئے کے تمام دوسرے آلات سے پرہیز کرو حتّٰی کہ اخروٹ، بادام اور اُنگلیوں کی پوروں کی ہڈّیوں سے جُوا کھیلنے سے بھی پرہیز کرو جن سے بچّے کھیلا کرتے ہیں۔"

یہاں لازم ہے کہ جوئے کی مختلف صورتوں کے بارے میں اسلام کے احکام کا خلاصہ بیان کر دیا جائے تاکہ اس مسئلے کے متعلّق کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

قرآنِ مجید نے صریح اور مدلّل بیان کے ساتھ جوئے کو حرام قرار دیا ہے۔ قُرآنِ مجید جو استدلال پیش کرتا ہے اس میں جوئے کے فوائد، نقصانات اور اس کی خرابیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی حرمت کی بنیاد اس بات پر رکھّی گئی ہے کہ اس کے فوائد کے مقابلے میں اس کے نقصانات اور خرابیاں زیادہ ہیں۔

چونکہ اکثر لوگ دل بہلاوے اور تفریح کی خاطر یا مادّی آمدنی کے لیے جُوا کھیلتے ہیں اس لیے قُرآنِ مجید اس کے مختصر فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے کہ اس بُری عادت میں مبتلا ہو کر انسان جن خرابیوں اور نقصانات سے دوچار ہوتا ہے وہ اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں اور کلام کے خاتمے پر انسان کی سوچ بچار کی قوّت سے انصاف چاہتا ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۵۹

مسلّمہ طور پر یہ بات قرینِ عقل نہیں کہ کوئی شخص ایک مختصر سے ممکنہ فائدے کے لیے بہت بڑے نقصان کا خطرہ مول لے اور جو لوگ نفع کمانے کی خاطر جُوا کھیلتے ہیں انھیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جُوئے کے مالی، سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔

قرآنِ مجید کی بعض آیات میں جوئے کو ایک شیطانی عمل اور گمراہی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس کے چنگل میں پھنسنے سے بچیں[۱]۔ کچھ اور آیات میں جُوئے کو لوگوں کے مابین کینہ اور عداوت پیدا کرنے، انتقام کی حس کے ظہور اور پست اخلاق کی پیدائش کا عامل قرار دیا گیا ہے اور اسے روحانی سعادت اور کمال اور اللہ سے ارتباط کے راستے میں ایک رکاوٹ گردانا گیا ہے۔[۲]

اسلامی فقہ میں قمار اس قسم کے کھیلوں کو کہا جاتا ہے جن میں جوئے کی مخصوص وسائل جیت یا ہار کے مقصد سے استعمال کیے جائیں اور وہ یوں کہ دو یا زیادہ اشخاص جوئے کے وسائل سے کھیلتے ہوئے شرط لگائیں کہ جو شخص ہار جائے گا وہ دوسرے کو اتنی رقم یا جنس دے گا۔ اس قسم کا جُوا بلا شک وشبہ اسلام میں حرام گردانا گیا ہے اور فقہا کے ایک گروہ نے اس کی حُرمت کو ضروریاتِ اسلام میں داخل سمجھا ہے۔[۳]

جُوئے کی دوسری صورت یہ ہے کہ جوئے کے مخصوص وسائل مثلاً تاش کے پتّوں یا شطرنج کے مہروں وغیرہ سے دل بہلاوے اور تفریح کے لیے کھیلا جائے اور اس میں لینے دینے کی کوئی شرط نہ لگائی جائے۔ اس قسم کا کھیل بھی شیعہ فقہا کے عام فتویٰ کے مطابق حرام ہے۔[۴]

---

[۱] و [۲] سورۃ المائدۃ۔ آیات ۹۰-۹۱ [۳] مصباح الفقاہہ

[۴] جامع المقاصد۔ تذکرۃ علّامہ

تیسری صورت یہ ہے کہ جوئے کے وسائل کے بغیر لیکن لینے دینے کی شرط لگا کر کھیلا جائے۔ یہ صورت بھی شیعہ فقہاء کے نظریے اور مشہور فتویٰ کے مطابق حرام ہے۔

ایک اور قابلِ توجّہ نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں جُوئے کی حُرمت کی دو وجوہ ہیں۔ (اوّل) اس وجہ سے کہ جُوا بجائے خود حرام ہے اور اسلام میں اسے گناہ شمار کیا گیا ہے۔ (دوّم) اس وجہ سے کہ جوئے کے ذریعے جو رقم کسی کے ہاتھ لگتی ہے وہ بھی حرام ہے یعنی جواری شرعاً اس رقم کا مالک نہیں بنتا اور اس میں تصرّف کا حق نہیں رکھتا اور اسے چاہیئے کہ اسے اس کے مالک کو واپس کر دے۔

ایک بنیادی جنگ

اس عظیم مصیبت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے اسلام نے فقط اسے حرام قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جوئے کے آلات کی تیاری، ان کی خرید و فروخت اور انھیں اپنے پاس رکھنے کو بھی حرام گردانا ہے۔

شاید بعض لوگ سوال کریں کہ شطرنج اور اس سے ملتے جلتے کھیل اگر لینے دینے کی شرط کے بغیر انجام دیے جائیں تو ان کے حرام ہونے کی کیا وجہ ہے جب کہ آجکل انھیں دماغی ورزش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اب تو انھوں نے تعلیمی اداروں میں بھی اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔

ان لوگوں کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ :

اوّلاً اس قسم کے کھیلوں کا بے ضرر اور خطرے سے خالی ہونا ثابت نہیں ہوا بلکہ جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں بعض ماہرینِ نفسیات کے اقوال نقل کیے ہیں ان میں خرابی مضمر ہے۔

ثانیاً اسلام نے جُوئے کے خلاف بنیادی جنگ لڑنے اور اسے بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی خاطر جوئے کی تمام اقسام کو خواہ ان میں لین دین کی شرط ہو یا نہ ہو حرام قرار دیا ہے اور جوئے کے آلات تیّار کرنے، ان کی خرید و فروخت اور انھیں اپنے پاس رکھنے سے بھی منع فرمایا ہے تاکہ لوگ کسی وجہ سے اور کسی عنوان کے تحت بھی اس کی جانب مائل نہ ہوں۔

بلا شُبہ اس قسم کے فساد کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے ایسی ہی جنگ کی ضرورت ہے کیونکہ اگر جوئے کے وسائل اور آلات آزادی سے تیّار کیے جا سکیں، خریدے اور بیچے جا سکیں اور انھیں اپنے پاس رکھنے کی بھی اجازت ہو تو شروع شروع میں تو انھیں دل بہلاوے اور تفریح کے طور پہ استعمال کیا جائے گا لیکن بعد میں یہی عمل اس وبا کے پھُوٹ پڑنے کے لیے میدان ہموار کر دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جُوئے کی تمام اقسام اور اس میں استعمال ہونے والے آلات کو حرام قرار دے کر اس فتنے کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا ہے اور جو لوگ اسلام پر واقعی ایمان رکھتے ہیں اور محض نام کے مسلمان نہیں ہیں وہ کسی طرح سے بھی اپنے آپ کو اس عمل سے جس کا شمار کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے آلودہ نہیں کرتے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے کہ:

"جواری کو سلام کرنا گناہ ہے اور جو شخص جُوئے کی بساط کے پاس کھڑا تماشا دیکھ رہا ہو اور اسی طرح جو شخص جُواری کے چہرے پر نگاہ ڈالے وہ اسی طرح گناہگار ہیں جیسے کہ اسے سلام کرنے والا گناہگار ہے اور جوئے کی محفل ان محفلوں میں سے ہے جن میں شریک ہونے والے اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کے سزاوار ہیں جنھیں ہر گھڑی اس کا

(یعنی اللہ کے غضب اور عذاب کا) انتظار کرنا چاہیے۔"

(۴) وَقَدْ بَالَغَ الْإِمَامُ اَبُو الْحَسَنِ مُوسَى بْنُ جَعْفَرٍ فِي النَّهْيِ عَنِ اللَّعْبِ بِالشِّطْرَنْجِ حَتّٰى قَالَ لِرَجُلٍ مِنَ الْبَصْرِيِّيْنَ وَقَدْ سَئَلَهُ قَائِلًا اِنِّيْ مَعَ قَوْمٍ يَلْعَبُوْنَ بِالشِّطْرَنْجِ وَلَسْتُ اَلْعَبُ بِهَا وَلٰكِنْ اَنْظُرُ فَقَالَ مَالَكَ وَالْمَجْلِسَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰى اَهْلِهٖ۔

"امام موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السّلام نے جُوئے اور شطرنج کی مناہی کے بارے میں بڑے بلیغ ارشادات فرمائے اور جب بصرہ کے ایک شخص نے عرض کیا کہ میں ایسے افراد کی محفل میں شریک ہوتا ہوں جو شطرنج کھیلتے ہیں لیکن خود نہیں کھیلتا بلکہ صرف تماشا دیکھتا ہوں تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ تجھے اس محفل سے کیا کام جس پر سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی نگاہ اُٹھالی ہو۔"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"شطرنج کا بیچنا حرام، اس کی کمائی کھانا ناجائز، اسے اپنے پاس رکھنا بے ایمانی، اس کا کھیلنا شرک، شاطر کو سلام کرنا گناہ اور شطرنج کا دوسرے کو سکھانا ہلاک کر ڈالنے والا گناہِ کبیرہ ہے۔"[1]

اہلبیتِ عصمتؑ کی زبانوں سے جُوئے کے بارے میں اس قسم کی روایات کی تعداد کثیر ہے اور یہاں ہم نے ان میں سے چند ایک بطور نمونہ نقل کی ہیں۔

جو حضرات اہلِ تحقیق و مطالعہ ہیں اور مسائل کا صحیح ادراک رکھتے ہیں وہ جُوئے

---

[1] وسائل الشیعہ

کی دُوسری خرابیوں اور جواریوں کی بدبختیوں کو اچھّی طرح جانتے ہیں۔

بعض اوقات تقلید کا مرض بھی جوئے جیسے فتنوں کے جاگ اُٹھنے کا موجب بن جاتا ہے اور فی زمانہ ہم ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جنھوں نے محض مغرب کی تقلید کی خاطر اس مصیبت کو اپنے گلے ڈال لیا ہے۔ چنانچہ جہاں مغرب کے دانشور اپنے معاشرے کی بدحالی پر خون کے آنسو رو رہے ہیں وہاں ان بدبختوں نے اپنے آپ کو جُوئے کی لعنت میں ملوّث کر لیا ہے تاکہ وہ مغرب کے جواریوں کی مانند نظر آئیں اور نام نہاد تہذیب و تمدّن کے قافلے سے پیچھے نہ رہ جائیں۔

یہ لوگ جو نہ اس بات کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی اس کی لیاقت رکھتے ہیں کہ علم اور صنعت و حرفت کے معاملے میں اہلِ مغرب کی نقلید کریں اور اپنی خوشحالی کے لیے قدم اٹھائیں اس بات کے خواہشمند ہیں کہ اس طریقے سے اپنے آپ کو ان جیسا بنا سکیں۔

پہلے صرف مرد ہی تھے جو اس تباہ کن بیماری میں مبتلا ہوتے تھے اور اپنی راتوں کو جُوئے کی میز کے کنارے پریشانی اور اضطراب کے عالم میں صبح تک پہنچاتے تھے اور پھر صبح کو تھکے ہارے اپنے گھروں کو لوٹتے تھے لیکن اب یہ مرض عورتوں کو بھی دامن گیر ہو گیا ہے اور آجکل کی ماڈرن خواتین اس کھیل کی ثابت قدم اور وفادار رسیا شمار کی جاتی ہیں۔ گویا یہ بھی خواتین کی نام نہاد ترقّی کا ایک مظہر ہے اور وہ مَردوں سے اپنی برتری اور مساوات کی آرزو کو صحیح ثابت کرنے کے لیے چاہتی ہیں کہ جُوئے کی میز پر بھی ان کے مساوی اور ہم پلّہ ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غلط راستے پر چل پڑی ہیں۔

جو کچھ اب تک لکھا جا چکا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جُوا لاتعداد خرابیوں اور نقصانات کا موجب ہے جن میں سے کچھ کی جانب ہم نے

گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے اور ذیل میں ان کا خلاصہ درج ہے:

- جُوا اعصاب اور معدے کی بیماریوں اور نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔
- جُوا لوگوں کے تعلّقات میں بگاڑ اور محبّت کے رشتوں کو توڑنے کا باعث بنتا ہے اور بہت سی دشمنیوں کو جنم دیتا ہے۔
- جُوا خاندانوں کی بربادی اور افراد کی گھریلو زندگی میں پریشانی پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے اور ان کے ذاتی امور کی تکمیل، بچّوں کی تربیّت اور دوسرے متعلّقہ امور کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔
- جُوا جرائم کے ارتکاب، چوری، خیانت اور دوسری برائیوں کے لیے میدان ہموار کرتا ہے۔
- جُوا افراد کو تباہی کے دہانے تک لے جاتا ہے اور انھیں خودکشی پر آمادہ کردیتا ہے۔
- جُوا افراد کی عزّت اور شرف کو داغدار کرتا ہے اور ان کی سماجی حیثیّت کو خطرے میں ڈالتا ہے۔
- جُوا افراد کے جسموں کو کھوکھلا، بیمار اور کمزور کردیتا ہے۔
- جُوا لوگوں کا ایمان زائل کردیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب بنتا ہے۔

مختصر یہ کہ جُوا لوگوں کی دنیا اور آخرت، جسم اور روح، آبرو اور مال غرضیکہ ہر چیز کو نیست و نابود کردیتا ہے۔

اب یہ ہر شخص کا فریضہ ہے کہ خود اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس آگ کے پاس پھٹکنے سے بچائے اور دینی احکام پر عمل کرتے ہوئے جواریوں سے دوستی، جُوئے

کی محفلوں میں شرکت اور جو چیز بھی اُسے اِس لعنت میں ملوّث کرنے کا باعث بن سکے اُس سے اپنے آپ کو دُور رکھے۔

بلاشبہ جُوئے کی مصیبت کا مقابلہ وبائی بیماریوں کی طرح کرنا چاہیے اور اس کے خلاف ایک پُرعزم اور ہمہ پہلو لیکن متین اور عاقلانہ جنگ کا آغاز کر دینا چاہیے۔

جب ایک خطرناک بیماری (مثلاً طاعون وغیرہ) کسی ملک میں پھوٹ پڑتی ہے تو حفظانِ صحّت کے ادارے سب لوگوں کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے خطرے سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ صفائی رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ سب کو متعلقہ ٹیکوں کی سہولتیں مہیّا کرتے ہیں اور اگر ضروری ہو تو حکماً لوگوں کو ٹیکے لگاتے ہیں اور قرنطینہ میں رکھتے ہیں۔ جو لوگ بیماری میں مبتلا ہوں لوگوں کو ان سے ملنے جُلنے سے روکتے ہیں۔ کبھی کبھی بیماری میں مبتلا اشخاص کے کپڑے جلا دیتے ہیں اور کبھی جس علاقے میں بیماری پھیلی ہوئی ہو وہاں سے لوگوں کو نکال کر اس علاقے کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں۔

بیماروں کی مخصوص مقامات پر نگہداشت کی جاتی ہے۔ انھیں ان کے گھروں سے نکال لیا جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں سے (بالخصوص بچّوں اور نوجوانوں سے) ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور مختلف طریقوں سے مفت علاج کیا جاتا ہے۔

ضروری ہے کہ اسی قسم کے زیادہ دقیق اور زیادہ بنیادی اقدامات جُواریوں کے بارے میں بھی کیے جائیں جو خطرات جُوئے سے جنم لیتے ہیں وہ عوام کے علم میں لائے جائیں اور اس کی بُرائیاں لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کی جائیں۔ جُوئے کے اڈّے بند کر دیے جائیں۔ جُواری مفید کاموں اور سود مند سرگرمیوں میں مشغول ہو جائیں۔ لوگوں کے ساتھ (اور بالخصوص بچّوں اور نوجوانوں کے ساتھ) جُواریوں

کے میل جول کی روک تھام کی جائے اور جوئے کے بیماروں کے علاج کے لیے ماہرین نفسیات اور پیشوایانِ دین کے ذریعے ضروری اقدامات کیے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور عنایات سے اس موذی مرض کو مسلمانوں کے معاشرے سے اکھاڑ پھینکا جاسکے۔

اسلام میں جھوٹ کے خلاف جہاد

فطرتِ انسانی سچّائی اور درستی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اگر انسان اپنی اسی اصلی فطرت پر باقی رہے اور خارجی کشش اور عوامل اُسے فطرت کی راہ سے منحرف نہ کر دیں تو وہ ہمیشہ پاکیزگی اور فضائل کی جانب مائل رہے اور ناپاکیوں اور برائیوں سے دُور رہے۔

انسان فطرتاً راستگو، نیکوکار، کریم النّفس اور شریف ہے لیکن مختلف عوامل مثلاً تربیّت اور ماحول وغیرہ اس کی ان صفات کو ظاہر ہونے سے روکتے ہیں حتّٰی کہ بُری صفات کو ان کی جگہ متمکّن کر دیتے ہیں۔ انبیاء اور پیغمبروں کی ذمّے داریوں میں سے ایک نازک ترین ذمّے داری خارجی عوامل کے مقابلے میں فطرتِ انسانی کو مدد بہم پہنچانا ہے اور وہ اس معنی میں کہ وہ اپنی نورانی تعلیمات کے ذریعے انسان کی فطری قوّتوں کو تقویّت بخشیں اور اس کی اعلیٰ صفات کے

اظہار کے لیے میدان ہموار کریں۔

جھوٹ انسان کی فطرت کے خلاف ہے اور اسے اچھائی اور نیکوکاری سے بدی اور تباہ کاری کی جانب کھینچتا ہے حتّٰی کہ وہ ایک وبائی مرض کی طرح باپ سے بیٹے میں، اُستاد سے شاگرد میں اور خریدار سے بیچنے والے میں سرایت کرجاتا ہے اور ان کی فطرتوں کو ان کی پہلی سرشت سے منحرف کردیتا ہے۔

شاید بہت سے لوگ جھوٹ کو ایک معمولی اور غیر اہم چیز سمجھیں حالانکہ جھوٹ میں جو نقصانات مضمر ہیں ان کا مقابلہ کسی دوسرے گناہ کے نقصانات سے نہیں کیا جاسکتا اور جھوٹ کی جانب سے جو خطرات انسانی معاشروں کو لاحق ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں وہ حد و حساب سے باہر ہیں۔

اکثر ایسا اتّفاق ہوا ہے کہ ایک مکّار شخص نے اپنے گھٹیا مقاصد حاصل کرنے کے لیے پیغمبری کا جھوٹا دعوٰے کیا ہے اور اس ایک جھوٹ سے ہزاروں افراد کو حقّ و صداقت کی صراطِ مستقیم سے ہٹا کر مکمّل گمراہی اور بدبختی سے دوچار کردیا ہے یا کسی اور فریبی شخص نے غوث یا قطب وغیرہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس جھوٹ کے زیرِ اثر بہت سے لوگ بھٹک گئے ہیں۔

اس قسم کے گناہوں کا کس دوسرے گناہ سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور ان سے ہونے والے نقصانات کو کس دوسرے گناہ کے پیمانے سے ناپا جاسکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام جھوٹ کو بے ایمان لوگوں کی صفت شمار کرتا ہے اور قرآن مجید صاف صاف فرماتا ہے کہ:

اِنَّمَا یَفۡتَرِی الۡکَذِبَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ [1]

امام علی علیہ السّلام جھوٹ کو بدترین فعل شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

---

[1] سورۃ النحل - آیت ۱۰۵

لَا سُوْءَ اَسْوَءُ مِنَ الْكِذْبِ [1]

"جھوٹ سے زیادہ بُرا اور ناپسندیدہ فعل اور کوئی نہیں۔"

امام الباقر علیہ السّلام نے جھوٹ کو ایمان کی بنیاد ڈھا دینے والا قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

اِنَّ الْكِذْبَ هُوَ خَرَابُ الْاِيْمَانِ [2]

"جھوٹ ایمان کی بنیاد کھود ڈالتا ہے۔"

امام علیؑ نے حقیقتِ ایمان کے شعور کو مختلف اقسام کے جھوٹ ترک کرنے سے وابستہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

لَا يَجِدُ عَبْدٌ حَقِيْقَةَ الْاِيْمَانِ حَتّٰى يَدَعَ الْكِذْبَ جِدَّهٗ وَهَزْلَهٗ [3]

"کوئی شخص ایمان کی حقیقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ جھوٹ کو، خواہ سنجیدگی سے بولا جائے یا مذاق میں، ترک نہ کر دے۔"

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص):

يَكُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟ قَالَ: نَعَمْ، قِيْلَ: وَيَكُوْنُ بَخِيْلًا؟ قَالَ: نَعَمْ، قِيْلَ: وَيَكُوْنُ كَذَّابًا؟ قَالَ: لَا [4]

"رسول اکرمؐ سے دریافت کیا گیا: "کیا یہ ممکن ہے کہ باایمان شخص ڈرپوک ہو؟" آپ نے فرمایا: "ہاں۔" پھر پوچھا گیا: "کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بخیل ہو؟" آپ نے فرمایا: "ہاں۔" پھر سوال ہوا: کیا

---

[1] امالی الصدوق۔ صفحہ ۱۹۳ [2] الکافی۔ جلد ۲

[3] محاسن برقی [4] وسائل الشیعہ جلد ۳

یہ ممکن ہے کہ وہ دروغ گو ہو؟" آپ نے فرمایا: "نہیں۔"

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اِعْتِیَادُ الْکِذْبِ یُوْرِثُ الْفَقْرَ [1]

"جھوٹ بولنے کی عادت فقیری اور پریشانی کا موجب بنتی ہے۔"

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ، اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَوْلُ الزُّوْرِ، اَیِ الْکِذْبُ [2]

"میں تمھیں سب سے بڑے کبیرہ گناہوں سے آگاہ کر رہا ہوں اور وہ ان چیزوں سے عبارت ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ سے بدسلوکی کرنا، انھیں دُکھ دینا اور جھوٹی بات کہنا۔"

ایک مشہور ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

"تمام گھٹیا اخلاق اور قابلِ نفرت صفات میں سے جھوٹ سب سے بُری اور مذموم صفت ہے۔ یہ قبیح عادت یا تو اخلاقی گراوٹ اور خرابی سے پیدا ہوتی ہے یا کمزوری اور بُزدلی کا نتیجہ ہوتی ہے اور بڑے تعجّب کی بات ہے کہ عموماً لوگ اسے بڑی لاپروائی اور بے اعتنائی سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اپنے نوکروں اور گماشتوں کو جھوٹ بولنے اور جھوٹ کے ذریعے ڈھونگ رچانے کی تعلیم دیتے ہیں لہٰذا اگر بعد میں یہ بات ان کے مشاہدے میں آئے کہ ان کے نوکر خود ان کے سامنے بھی جھوٹ بولتے ہیں تو نہ تو انھیں متعجّب ہونا چاہیئے اور نہ ہی غصّے میں آنا چاہیئے۔"

---

[1] خصال الصدوق

[2] المکاسب۔ صفحہ ۵۰

امام حسن العسکری علیہ السّلام جھوٹ کو تمام بُرائیوں کی کنجی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں :

حُطَّتِ الخَبَائِثُ فِی بَیتٍ وَجُعِلَ مِفتَاحُهُ الکِذبُ [1]

"تمام بُرائیاں اور گناہ ایک گھر میں جمع ہوجاتے ہیں اور ان کی کُنجی جھوٹ ہے۔"

مراد یہ ہے کہ جھوٹ میں مبتلا ہونے سے تمام ناپاکیوں کے لیے میدان ہموار ہوجاتا ہے۔

اسلام میں جہاں مسلمانوں کو جھوٹ میں آلودہ ہونے سے بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے وہاں جھوٹوں کی رفاقت اور ان سے میل جول رکھنے سے بھی باز رہنے کو کہا گیا ہے۔

امام علی علیہ السّلام اپنے بیٹے امام حسن علیہ السّلام کو وصیّت فرمایا کرتے تھے:

"احمق کے ساتھ دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ وہ تمھیں نفع پہنچانا چاہتا ہے لیکن چونکہ وہ نفع اور نقصان کی تشخیص کرنے سے عاجز ہے اس لیے تمھیں نقصان پہنچاتا ہے اور بخیل کے ساتھ دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ وہ اپنے بُخل کی وجہ سے جس چیز کی تمھیں سخت ضرورت ہو وہ تم سے بچا کر رکھتا ہے اور فاجر اور بدکار کی دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ وہ تمھیں سستی سے سستی قیمت پر بیچ ڈالے گا اور اس شخص کی دوستی سے پرہیز کرو جو جھوٹ کے مرض میں مبتلا ہو کیونکہ وہ سراب کی مانند ہے جو دُور کو تمھارے نزدیک اور نزدیک کو تم سے دُور کر دیتا ہے۔" [2]

یعنی اپنی دروغ گوئی کے ذریعے سخت کاموں کو تمھارے سامنے آسان کر کے

---

[1] مستدرک الوسائل - جلد دوّم [2] نہج البلاغہ - جلد ۶

پیش کرتا ہے اور آسان کاموں کو سخت کر کے پیش کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر انھیں اپنا مقصد حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔

جس طرح جھوٹ انسان کو دوسرے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے اسی طرح جھوٹ کو ترک کرنے اور اس سے توبہ کر لینے سے انسان بہت سے گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

"ایک شخص نے رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور عرض کیا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو نماز پڑھتا ہوں لیکن زنا اور جھوٹ میں بھی ملوّث ہوں۔ (اب میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں گناہوں میں سے ایک سے توبہ کر لوں) آپ فرمائیں کہ میں کون سے گناہ سے توبہ کروں۔ حضورؐ نے اس سے فرمایا: "جھوٹ بولنے سے توبہ کر لو"۔ اس نے رسولِ اکرمؐ کا ارشاد گرہ میں باندھا اور اپنے دل میں عہد کیا کہ اب کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔ اس نے فقط جھوٹ بولنے سے توبہ کی لیکن یہی چیز اس کے تمام گناہوں سے محفوظ رہنے کا موجب بن گئی کیونکہ جب کبھی اس نے زنا کرنا چاہا تو اُسے خیال آیا کہ اگر رسول اللہؐ مجھ سے دریافت کرینگے کہ آیا تو نے جھوٹ سے توبہ کر لینے کے بعد زنا کیا ہے یا نہیں تو اگر میں اس سوال کا جواب نفی میں دوں گا تو جھوٹ بولوں گا اور اپنے کیے ہوئے وعدے کے خلاف عمل کروں گا اور اگر میں تسلیم کر لوں گا کہ میں نے زنا کیا ہے تو سزا کا مستحق ٹھہروں گا اور یہی صورت تمام دوسرے گناہوں کی ہو گی۔ یوں جھوٹ سے توبہ کرنے پر اُسے بہت سے دوسرے گناہوں سے بھی نجات مل گئی"۔ [1]

---

[1] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم

یہاں ایک نکتے کی جانب اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں ذکر کیا گیا ہے جھوٹ انسان کی رُوح سے جنم لیتا ہے اور جھوٹ بولنے والوں کے علاج کے لیے پہلے اس بیماری کی وجہ جاننا ضروری ہے تاکہ بعد میں اس کا مناسب علاج کیا جا سکے کیونکہ جب تک بیماری کی وجہ معلوم نہ ہو اور اسے دُور نہ کیا جائے علاج معالجے کا کوئی فائدہ نہیں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

لَا يَكْذِبُ الْكَاذِبُ اِلَّا مِنْ مَهَانَةِ نَفْسِهٖ [1]

"جھوٹا شخص جھوٹ نہیں بولتا بجز اس وجہ کے کہ وہ اپنے دل میں پست اور حقیر ہونے کا احساس کرتا ہے"

اسی بنا پر ایک جھوٹے شخص کے حالات کا اجمالی مطالعہ کرنے سے پتا چل جاتا ہے کہ اس کے جھوٹ بولنے کی وجہ ضعفِ نفس، خوف، عجز، ناتوانی یا حقیر ہونے کا احساس ہے یا اسی قسم کے کوئی دوسرے نفسیاتی حالات ہیں جن کی وجہ سے وہ اس بُرائی میں ملوّث ہوتا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

اَقَلُّ النَّاسِ مُرُوَّةً مَنْ كَانَ كَاذِبًا [2]

"جو شخص جھوٹ بولتا ہو وہ انسانیّت اور مردانگی کے معاملے میں سب لوگوں سے زیادہ کم نصیب ہے"

جو شخص اخلاقی جرُأت رکھتا ہو وہ ہرگز اپنے آپ کو جھوٹ میں آلودہ نہیں کرتا۔ جھوٹ وہ بولتا ہے جو اپنے دل میں کمزوری اور کمتری محسوس کرتا ہے۔ درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹ بے شخصیّت، ڈرپوک اور کمزور لوگوں کی

---

[1] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم [2] اختصاص۔ صفحہ ۲۳۲

پناہ گاہ ہے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

لَوْ تَمَیَّزَتِ الْاَشْیَاءُ لَکَانَ الصِّدْقُ مَعَ الشَّجَاعَۃِ وَکَانَ الْجُبْنُ مَعَ الْکِذْبِ [1]

"اگر چیزوں کی گروہ بندی ان کے تناسب اور درجوں کے مطابق کی جائے تو سچ شجاعت کے ساتھ اور جھوٹ خوف اور بزدلی کے ساتھ جگہ پائے گا۔"

ایک ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

"جھوٹ کمزور لوگوں کا بہترین حربہ اور وقتی طور پر خطرہ ٹالنے کا سریع ترین ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر رنگین نسلوں کے اُن افراد میں جھوٹ کو فروغ حاصل ہے جو سفید نسل کی قوموں کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں اور ان کی سختیاں سہتے ہیں اور اپنے آپ پر ان کا اثر اور قدرت محسوس کرتے ہیں۔ بعض حالات میں جھوٹ کمزوری اور ناتوانی کے انعکاس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب ہم ایک بچے سے کہتے ہیں کہ کیا تم نے اس مٹھائی کو ہاتھ لگایا ہے یا کیا تم نے یہ گلدان توڑا ہے تو اگر بچے کو معلوم ہو کہ اگر اس نے اقرار کر لیا تو اس کی گوشمالی ہو گی اور اسے سخت سزا ملے گی تو اس کی بچاؤ کی اندرونی حس اسے اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ کہہ دے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔"

کبھی کبھی بچوں میں یہ بیماری دیکھنے میں آتی ہے اور اگر اسی وقت اس کا بنیادی علاج نہ کر لیا جائے اور صحیح تربیت کے ذریعے اس کا تدارک نہ ہو تو اس کے بڑے خطرناک

---

[1] غرر الحکم

نتائج برآمد ہوتے ہیں اور مرض تقریباً لاعلاج ہو جاتا ہے۔

والدین اور بالعموم سرپرستوں کا پہلا اور اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ وہ بچّوں سے جھوٹ نہ بولیں اور ان سے کوئی جھوٹا وعدہ نہ کریں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ اَعَانَ وَلَدَهٗ عَلٰی بِرِّهٖ۔ قَالَ قُلْتُ كَيْفَ يُعِيْنُهٗ عَلٰی بِرِّهٖ؟ قَالَ يَقْبَلُ مَيْسُوْرَهٗ وَ يَتَجَاوَزُ عَنْ مَعْسُوْرِهٖ وَلَا يُرْهِقُهٗ وَلَا يَخْرُقُ بِهٖ [1]

"اللہ اس باپ پر رحمت کرے جو خود اپنے ساتھ نیکی کرنے میں اپنے فرزند کی مدد کرے۔"

راوی نے پوچھا: "وہ اپنے بیٹے کی مدد کس طرح کر سکتا ہے؟"

آنحضرتؐ نے اس کے جواب میں چار احکام دیے:

"اوّل یہ کہ اپنے فرزند کی قدرت اور توانائی کی مقدار کا اندازہ لگائے اور وہ جو کام اپنی قدرت کے مطابق انجام دے اسے قبول کرے۔

دوّم یہ کہ اپنے فرزند کی ہمّت سے بڑھ کر اس پر بوجھ نہ ڈالے۔

سوّم یہ کہ اسے گناہ اور سرکشی پر مجبور نہ کرے۔

چہارم یہ کہ اس سے جھوٹ نہ بولے اور اس کے سامنے احمقانہ کاموں کا اقدام نہ کرے۔"

اولاد کے جھوٹ بولنے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان پر بھاری ذمّے داریاں ڈال دی جاتی ہیں اور ان سے ان کی ہمّت سے بڑھ کر کام کرنے کی توقّعات وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ بچّوں کے سرپرستوں کی سخت گیریاں اور ان سے غلط اور ان کی ہمّت سے

---

[1] الکافی - جلد دوّم

بڑھ کر توقعات وابستہ کرنا بچوں کو جھوٹ بولنے پر اُکساتی ہیں اور ان میں یہ ناپسندیدہ عادت پیدا کر دیتی ہیں۔

برٹرینڈ رسل کہتا ہے:

"چھوٹے بچے کے دل میں پہلی بار جھوٹ بولنے کے امکان کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ بعد میں اسے جھوٹ بولنے کے امکان کا پتا چلتا ہے یعنی وہ اس امکان کو بڑوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ خوف بھی اسے ایسا کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ بچہ دیکھتا ہے کہ اس سے بڑے اور بالغ لوگ اس کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں اور اگر وہ ان سے سچ بولے تو اس کے لیے خطرے کا موجب ہے۔ ان حالات میں وہ جھوٹ بولنے کا آغاز کرتا ہے۔ آپ خود ان محرّکات اور عوامل سے دُور رہیں تو جھوٹ بولنے کا خیال بچّے کے دل میں پیدا نہیں ہوگا۔"

ریمونڈ پیج کہتا ہے:

"میں ایک جوان لڑکی کو جانتا ہوں جو اَب ایک لاعلاج جھوٹی ہے۔ جب وہ سات سال کی تھی تو ایک کلاس میں پڑھنے جاتی تھی جس میں ۲۵ بچّے تعلیم پاتے تھے۔ ایک آیا اسے ہر روز اسکول لے جاتی تھی اور پڑھائی ختم ہونے پر بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتی تھی۔ اس آیا کے ذمّے یہ کام تھا کہ بچی کا خیال رکھے۔ اس کی ضروریات پوری کرے اور اسے سبق یاد کرائے۔ مختصر یہ عورت اس بچّی کی تربیّت کی ذمّے دار تھی۔

اُس زمانے میں رائج طرز کے مطابق جسے آجکل طریقۂ تعلیم بے مصرف اور لاحاصل سمجھتا ہے ہر روز بچّوں کا تحریری امتحان لیا جاتا تھا اور

جو نمبر وہ حاصل کرتے ان کے مطابق ان کی درجہ بندی (یعنی اوّل۔ دوّم۔ سوّم وغیرہ) کی جاتی تھی۔ وہ بچّی جونہی بستہ لیے کمرۂ جماعت سے باہر آتی تو اس کی آیا فوراً چلّا کر پوچھتی: "کہو آج تم کس نمبر پر آئیں؟" جواب میں جب بھی وہ اوّل یا دوّم کہتی تو آیا مطمئن ہو جاتی۔

تاہم ایک دفعہ یوں اتّفاق ہوا کہ یہ بچّی تین بار پے در پے تیسرے نمبر پر آئی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچّیس نو آموز بچّوں میں تیسرے نمبر پر آنا بھی واقعی قابلِ تحسین بات ہے لیکن اس کی آیا اس کے باوجود اس حقیقت کو سمجھنے والے لوگوں میں سے نہ تھی۔ اس نے دو دفعہ تو اس بات کو برداشت کیا لیکن تیسری بار نہ رہ سکی اور اس عالم میں جب کہ بچّی خوف کے مارے کانپ رہی تھی چلّا کر کہنے لگی:

"تو کیا تم تیسرے نمبر پر ہی آتی رہو گی؟ کل تمھیں اوّل آنا ہوگا۔ سن لیا!"

یہ سخت اور قطعی حکم سارا دن اس بچّی کے دماغ پر مسلّط رہا اور دُوسرے دن اسکول میں بھی اس پر یہی وحشت طاری رہی۔ اس نے پڑھائی کے کام میں جہاں تک ممکن ہو سکا پوری پوری توجّہ دی۔ اس کے تفریق کے سب سوال صحیح تھے، جمع کے سوال بھی سارے درست تھے۔ اس نے تمام سبق ٹھیک ٹھیک سُنائے اور جب ظہر کا وقت ہونے کو آیا اور نوبت اِملا تک پہنچی اس وقت تک اس کا تمام کام تسلّی بخش تھا لیکن اِملا کے امتحان میں اس کی چار غلطیاں ہو گئیں اور انجام کار اس دن بھی وہ تیسرے نمبر پر آئی۔ اس دن تیسرے نمبر پر آنا اس کے لیے ایک بڑی مصیبت سے کم نہ تھا۔

جب آخری گھنٹی بجی تو آیا اس کے انتظار میں کمرۂ جماعت کے دروازے

پر بیٹھی تھی۔ جونہی اس کی نظر بچّی پر پڑی اس نے پوچھا: ''کیا خبر ہے؟''
بچّی کی ہمّت نہ ہوئی کہ اُسے صحیح بات بتاسکے چنانچہ اس نے جواب دیا
کہ میں اوّل آئی ہوں اور یوں اس کی دروغ گوئی کا آغاز ہوگیا۔
کئی والدین ایسے ہیں جو یہی روش اختیار کرتے ہیں اور یوں اولاد کی
گنہگاری اور جھوٹ کے لیے جوابدہی کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں
پر اُٹھا لیتے ہیں۔''

برٹرینڈ رسل کہتا ہے:
''اگر کوئی بچہ جھوٹ بولنے لگے تو ماں باپ کو چاہیئے کہ اس سلسلے میں
ضروری اقدام کو بچے کی نہیں بلکہ اپنی ذمّے داری سمجھیں اور یہ ان کا فرض
ہے کہ اس کا علاج کریں یعنی اس کے جھوٹ بولنے کے اسباب رفع
کریں اور نرمی اور عقل سے اور دلائل دے کر اسے سمجھائیں کہ جھوٹ
نہ بولنا کیوں بہتر ہے۔ انھیں چاہیئے کہ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کی
جانب ہرگز رجوع نہ کریں کیونکہ ایسا کرنے سے بچے کا خوف بڑھتا ہے جو
دروغ گوئی کا محرّک ہے۔

البتہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے جھوٹ بولنا نہ سیکھیں تو اس کا سب سے
بہتر علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ بڑے بھی بچّوں کے ساتھ سچائی
کی روش اختیار کریں۔

جب والدین اپنے بچّوں کو تعلیم دیں کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے اور ساتھ
ہی ساتھ بچے دیکھتے ہوں کہ وہ (یعنی والدین) خود جھوٹ بولتے ہیں
تو قدرتی طور پر وہ بچّوں پر اپنا اخلاقی اثر و اقتدار کھو بیٹھتے ہیں۔

جھوٹ کی ایک اور قسم جو بچّوں کے لیے بے حد نقصان دہ ہے یہ ہے

کہ انھیں کسی مخصوص سزا کی دھمکی دی جائے جب کہ اس پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ ڈاکٹر بلارڈ نے اپنی دلچسپ کتاب "مدرسۂ متغیّر" میں یہ اصول بڑے تاکیدی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۱۲ پر وہ کہتا ہے:

"دھمکی نہ دو لیکن اگر دھمکی دو تو پھر کسی چیز کو اس دھمکی پر عمل کرنے میں رکاوٹ نہ بننے دو"

ماں باپ اور سرپرستوں کی بیداری اور ہوشیاری بچّوں کو جھوٹ کے مرض میں مبتلا ہونے سے بچا سکتی ہے۔

اگر بچّے کو حقیر نہ سمجھا جائے، اس کی شخصیّت کو مجروح نہ کیا جائے، اگر بزرگ خود جھوٹ بول کر اسے دروغ گوئی نہ سکھائیں، اگر دروغ گوئی کے عوامل مثلاً خوف اور دھمکی کو دُور کر دیا جائے۔ اگر ماں باپ بچّے پر بلاوجہ سختی نہ کریں اور آمرانہ رویّہ اختیار نہ کریں اور مختصراً اگر وہ اس کے ساتھ مہربانی اور ملائمت کے ساتھ عاقلانہ اور آگاہانہ رویّہ اختیار کریں تو بچّہ قطعاً جھوٹ کی مصیبت بار بیماری میں مبتلا نہ ہوگا۔

والدین بچّوں کے جھوٹ بولنے پر غیر معمولی خفگی کا اظہار کرتے ہیں بالخصوص جب جھوٹ ڈھٹائی سے بولا جائے اور جھوٹ بولنے والا نوجوان ہو۔

بچّہ جھوٹ کیوں بولتا ہے؟ بعض اوقات بچّے اس لیے جھوٹ بولتے ہیں کہ انھیں حرفِ حقیقت زبان پر لانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بچّہ ماں سے کہے کہ مجھے اپنے بھائی سے نفرت ہے تو ممکن ہے کہ ماں بلا تامّل سچ بولنے پر اس کے منہ پر ایک تھپّڑ جڑ دے لیکن جب وہ بچّہ تھوڑی دیر بعد کمال ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ موٹ یہ کہے کہ اب مجھے بھائی سے محبّت ہوگئی ہے تو ممکن ہے کہ ماں بے اختیار

اس کا منہ چومنے لگے اور اس کے جذبات کے بدلے اُسے کوئی چیز بھی دے دے۔ ایک بچّہ اس آزمائش سے گزرنے کے بعد کیا نتیجہ اخذ کرے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سچ بولنا پریشانی اور آزردگی کا اور دروغ گوئی خوشنودی کا موجب ہے اور ماں نوعمر جھوٹوں کو انعام بھی دیتی ہے۔

لہٰذا جب ہم بچوں کو سچائی اور راستگوئی سکھانا چاہیں تو ہمیں چاہیے کہ جس طرح ہم ان کے شیریں حقائق آرام اور تحمّل سے سُنتے ہیں اسی طرح ان کے تلخ حقائق پر بھی کان دھریں۔ جب کسی بچّے کو سچ بولنے پر سزا ملتی ہے تو وہ اپنا بچاؤ کرنے کے لیے خواہ مخواہ جھوٹ بولتا ہے۔

والدین کو چاہیے کہ بچّوں سے ایسے سوالات نہ کریں جن کا جواب دینے کے لیے انھیں اپنے بچاؤ کی خاطر مجبوراً جھُوٹ بولنا پڑے۔ بچّے اس بات سے نفرت کرتے ہیں کہ ماں باپ ان سے باز پرس کریں خصوصاً جب وہ جانتے ہوں کہ سوالات کے جواب پہلے سے معلوم ہیں۔

ہمارا واحد مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچّے کو سمجھائیں کہ ہم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سب مسائل سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچّوں کو مذہبی اور دینی فریضے کی جانب متوجّہ کیا جائے اور انھیں سمجھایا جائے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ جھوٹوں کو ناپسند کرتا ہے۔

اگر بچّوں کی تربیّت کی بنیاد ایمان اور مذہب کے اصولوں پر رکھّی جائے اور ان کے اخلاق آسمانی تعلیمات سے ہم آہنگ ہوں تو ان میں کبھی بھی کوئی انحراف پیدا نہیں ہوگا کیونکہ مذہب پر ایمان سے زیادہ کوئی اصول قوانین اور ضوابط پر عملدرآمد کا ضامن نہیں ہے۔

یہی وہ اصول ہے جو با ایمان لوگوں کو جھوٹ اور دوسرے گناہوں میں ملوّث ہونے سے باز رکھتا ہے اور انھیں ایک قسم کا روحانی اور معنوی تحفّظ فراہم کرتا ہے۔

لوگوں کو جھوٹ میں مبتلا ہونے سے باز رکھنے کے لیے اس کے نقصانات کی تشریح کرنے اور انھیں تاریخی مثالوں سے مربوط کرنے کا بڑا نمایاں اثر ہوتا ہے۔

علاّمۂ فقید، مرحوم نراقی فرماتے ہیں:

"جھوٹ کی بیماری کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ان آیات اور روایات کی جانب توجّہ دے جو جھوٹ کی مذمّت میں وارد ہوئی ہیں تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ جھوٹ میں مبتلا ہونے کا نتیجہ ابدی ہلاکت ہوگا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بات بھی ذہن میں رکھے کہ آخرت میں ہلاکت کے علاوہ اِس دُنیا میں بھی وہ معاشرے کے احترام اور محبّت سے محروم ہو جائے گا اور اس کا جھوٹ ظاہر ہونے کی بنا پر وہ خواہی نخواہی لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور رُسوا ہوگا"۔ [1]

ڈاکٹر الیکسیس کارل کہتا ہے:

"تمام عادات میں سے روحانی ترقّی کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ جھوٹ بولنا، اپنے ہم جنسوں کو ورغلانا، ان پر بہتان باندھنا، ان کی خیانت کرنا، چوری کرنا اور ہر چیز کو اپنے ذاتی فائدے کے لیے چاہنا ہے۔ فساد اور جھوٹ کے درمیان انسان کی رُوح کبھی ترقّی نہیں کرسکتی"۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اَلَا فَاصْدِقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّادِقِیْنَ وَجَانِبُوا الْکِذْبَ فَاِنَّ الْکِذْبَ مُجَانِبُ الْاِیْمَانِ۔

---

[1] جامع السعادات - جلد دوّم - صفحہ ۲۵۶

اَلَا وَ اِنَّ الصَّادِقَ عَلٰی شَفَا مَنْجَاۃٍ وَکَرَامَۃٍ اَلَا وَاِنَّ الْکَاذِبَ عَلٰی شَفَا مَخْزَاۃٍ وَھَلَکَۃٍ [1]

"سچ بولو، کیونکہ اللہ سچ بولنے والوں کے ساتھ ہے۔ جھوٹ سے دُور رہو کیونکہ یہ ایمان کو دُور کرتا ہے۔ سچ بولنے والا نجات اور اقبال مندی کی دہلیز پر ہے اور جھوٹ بولنے والا خواری اور تباہی کی ڈھلوان کے کنارے پر۔"

مرد باید کہ راست گو باشد
ور ببارد براو بلا چو تگرگ

(انسان کو چاہیئے کہ راستگو ہو۔ خواہ اس پر مصیبت اولوں کی طرح ہی کیوں نہ برسے)

سخن راست گو مترس کہ راست
نبرد روزی و نیارد مرگ

(سچّی بات کہہ اور خوفزدہ نہ ہو۔ کیونکہ سچّائی نہ روزی چھینتی ہے نہ موت وارد کرتی ہے)

جھوٹ بولنے والوں کے حالات پر تھوڑے سے غور اور ان کے مطالعے سے جھوٹ کے گوناگوں نقصانات واضح ہوجاتے ہیں۔

جھوٹ معاشرتی نقطۂ نگاہ سے ایسی خرابیوں کو جنم دیتا ہے جو ناقابلِ برداشت ہیں۔ جھوٹ بولنے والے کی آبرو معاشرے میں خطرے میں رہتی ہے اور وہ ہمیشہ رسوائی کی ڈھلوان کے کنارے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا رسوائی ہوسکتی ہے کہ اس کا جھوٹ لوگوں میں کھل جائے اور اس کی سماجی آبرو جاتی رہے!

عقلمند لوگ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ معاشرے میں آبرو سے رہیں۔ اس

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۷۲۔ صفحہ ۲۶۰

مقصد کے حصول کے لیے وہ دولت خرچ کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ آبرو کا سرمایہ سب سے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے لیکن جھوٹ بولنے والا شخص اس قیمتی شے کو خود اپنے ہاتھوں اور اپنے خراب عمل سے کھو بیٹھتا ہے۔

"فرقہ شیخیہ کا ایک پیشوا تبریز میں منبر پر بیٹھ کر تقریر کر رہا تھا۔ تقریر کے دوران اس نے جنوں کے بادشاہوں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور بتایا کہ ان میں سے کس نے پہلے حکومت کی اور کس نے بعد میں۔ اس کی تقریر کا انداز کچھ یوں تھا:

اس سلسلے کا پہلا بادشاہ جو تختِ حکومت پر بیٹھا تھتامشاہ تھا، اس کے بعد قہقامشاہ اور پھر جھجامشاہ وغیرہ۔ مقرّر نے اپنی تقریر جاری رکھی حتّٰی کہ دسویں یا گیارھویں بادشاہ تک پہنچا جس کا نام سابقہ ناموں سے ملتا جلتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک آزادہ رَو شخص منبر کے پاس سے بول اٹھا کہ جناب ذرا پانچویں بادشاہ کا نام تو دوبارہ بتا دیجیے۔ محترم مقرّر جواب نہ دے سکا کیونکہ اسے یہ یاد نہ تھا کہ ان بہت سے مشابہ ناموں میں سے اس نے پانچویں فرضی بادشاہ کو کون سا نام دیا تھا۔

اب معزّز قارئین خود اندازہ لگالیں کہ ان حالات میں مذکورہ نادان اور جھوٹے مقرّر کو کتنی ذلّت اور رسوائی اٹھانی پڑی ہوگی۔"

جارج ہربرٹ کہتا ہے:

"جھوٹ خواہ کسی لباس یا غلاف میں ہی کیوں نہ ہو اس کی حقیقت بالآخر ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔"

علاوہ اس بات کے کہ جھوٹا شخص معاشرے میں اپنی عزّت کھو بیٹھتا ہے اس پر لوگوں کا اعتماد بھی (جو کہ ہر شخص کی معاشرتی زندگی کے اہم ترین ارکان میں سے

ہے، زائل ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کی بات پر اعتبار نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر وہ کسی وقت سچ بھی بولے تو کسی کو یقین نہیں آتا۔

ارسطو کہتا ہے :

"جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں انھیں اس کی سزا اس شکل میں ملتی ہے کہ جب وہ سچی بات بھی کہتے ہیں تو کوئی باور نہیں کرتا۔"

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں :

کسے را کہ عادت بود راستی
خطا گر کند در گزارند ازو

(جس کسی کی عادت سچائی کی ہو اگر وہ غلطی بھی کرے تو لوگ درگزر کرتے ہیں)

وگر نامور شد بنا راستی
دگر راست باور ندارند ازو

(اور اگر اس کی شہرت بطور جھوٹے کے ہو جائے تو پھر لوگ اس کی سچی بات پر بھی یقین نہیں کرتے)

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے :

اِيَّاكَ وَالْكِذْبَ فَاِنَّهٗ يُسَوِّدُ الْوَجْهَ

"جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو کیونکہ جھوٹ رُوسیاہی لاتا ہے۔"

اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھی جھوٹ کے بہت سے نقصانات ہیں کیونکہ دولت کمانے کے لیے عموماً لوگوں سے لین دین اور معاملات انجام دینا ضروری ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں لوگوں کے اکثر معاملات اور بالخصوص بڑے معاملات بطور اُدھار انجام پاتے ہیں اور ان معاملات کی پشت پناہ لوگوں کا ایک دوسرے پر حُسنِ اعتماد ہی ہوتا ہے۔

جھوٹ کی وجہ سے انسان کا اعتماد سلب ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ دروغ گو کے کاروبار کے ماند پڑنے اور اس کے پریشانی اور ناداری میں مبتلا ہونے کی صورت میں نکلتا ہے۔

جھوٹ کا ایک اور نقصان اس روحانی اضطراب اور پریشانی کا وجود میں آنا ہے جو اکثر جھوٹ بولنے والوں کو دامنگیر ہو جاتی ہے اور انھیں بہت بڑے نفسیاتی دکھوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ایک مشہور مصنّف اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہے:

"میں نے غفلت کی بنا پر ایک جھوٹ بولا اور تیس سال روحانی کرب میں مبتلا رہا۔ ماجرا کچھ یوں تھا:

ایک رات ایک مجلس میں جس میں میرے کئی دوست اور رفیق موجود تھے بیرونی ممالک کی سیاحت کے بارے میں بات چل نکلی حاضرین میں سے ہر ایک نے یورپ، امریکہ، مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید میں اپنی مسافرتوں کے حالات بیان کیے۔ میں بھی اس خیال کے تحت کہ دوسروں سے پیچھے نہ رہ جاؤں گفتگو میں شامل ہو گیا اور گو میں کبھی فرانس نہیں گیا تھا پھر بھی اپنے فرانس کے فرضی سفر کے بارے میں باتیں کیں لیکن پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو حضرات فرانس ہو آئے ہیں ان میں سے کوئی مجھ سے اس ملک کے بارے میں سوال کرے اور یہ بات میرے لیے رسوائی کا موجب بن جائے۔ میں نے اس صورتِ حال سے بچے رہنے کی پوری کوشش کی اور بڑی پریشانی کے عالم میں اس مجلس کو اختتام تک پہنچایا لیکن اس رات سے بے عزّتی کے خطرے کا عفریت میری نگاہوں کے سامنے رہنے لگا اور مجھے ہر وقت خوف لاحق

رہتا کہ مُبادا اس مجلس کے شرکا میں سے کوئی کسی جگہ موجود ہو اور میں بے خیالی کے عالم میں اپنے جھوٹے دعوے کے برعکس کوئی بات کہہ دوں اور ذلّت اُٹھاؤں۔ یہ پریشانی میرے لیے اس قدر سوہانِ رُوح بن گئی کہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس صورتِ حال سے چھٹکارا پانے کے لیے میں ہر قیمت پر فرانس جاؤں گا۔ تاہم بدقسمتی سے اس سفر کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا اور اس سلسلے میں میری تمام کوششیں بے نتیجہ رہیں حتّٰی کہ تیس سال بعد میں اس قابل ہو سکا کہ فرانس کا سفر کروں اور اس ذہنی اذیّت سے نجات پاؤں۔

جی ہاں! میں نے ایک جھوٹ بولا اور تیس سال پریشانی اُٹھائی لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اسی رات میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور اس عظیم بلا کے چُنگل میں نہ پھنسوں گا۔"

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ خراسان اور زابلستان کے بادشاہ سلطان حسین بایقرا اور عراق اور آذربائیجان کے بادشاہ سلطان یعقوب کے مابین بڑے خوشگوار تعلّقات قائم تھے اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے تھے۔

ایران کے بادشاہ نے سلطان یعقوب کو قیمتی تحائف بھیجنے کا ارادہ کیا۔ جب تحائف تیّار ہو گئے تو اُس نے حکم دیا کہ کلّیات دیوانِ جاؔمی بھی جو اس زمانے میں بڑی قیمتی کتاب تصوّر کی جاتی تھی شاہی کتب خانے سے لا کر تحائف میں شامل کر دی جائے۔

کتب خانے کے مہتمم ملّا عبدالکریم نے کتاب اُٹھاتے وقت غلطی سے کلّیاتِ جاؔمی کی بجائے 'فتوحاتِ مکّی'، جو جلد و ضخامت اور شکل و صورت کے لحاظ سے

کلیاتِ جامی سے بے حد مشابہ تھی تحائف میں رکھ دی۔

امیر حسین ابیوردی جو دربار کی سربرآوردہ شخصیتوں میں سے تھا اس امر پر مامور ہوا کہ دیوانِ جامی سمیت سارے تحائف لے جاکر سلطان یعقوب کو پیش کرے۔ اس نے بھی ایک نظر ڈالے بغیر کتاب لے لی اور روانہ ہوگیا۔

جب امیر حسین تبریز پہنچا اور دربارِ شاہی میں باریاب ہوا تو سلطان اُس سے بڑی مہربانی سے پیش آیا اور کہا:

"اس دور دراز سفر میں تمھیں یقیناً بہت تکلیف ہوئی ہوگی اور تم تھک گئے ہوگے۔"

امیر حسین چونکہ جانتا تھا کہ سلطان کو جامی کی کتاب کا کتنا شوق ہے اور وہ اسے بہت پسند کرتا ہے اِس لیے اُس نے سلطان کی نظر میں اپنی وقعت بڑھانے کی خاطر مبالغہ آمیز جواب دیا:

"چونکہ سفر کے دوران مجھے ایک بے حد شفیق ساتھی میسّر تھا اس لیے میں نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی۔"

سلطان نے پوچھا: "تمھارا ہم سفر کون تھا؟"

اس نے جواب دیا: "دیوانِ جامی۔"

سلطان جامی کی کتاب کا نام سُن کر بے حد خوش ہوا اور حکم دیا کہ کتاب پیش کی جائے۔

امیر نے آدمی بھیجا جو کتاب لے آیا لیکن جب اسے کھولا گیا تو وہ بجائے کلیاتِ جامی کے "فتوحاتِ مکیّ" نکلی۔ کیونکہ امیر حسین نے دورانِ سفر کتاب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور جھوٹ بولا تھا جس کی وجہ سے اُسکی حالت متغیّر ہوگئی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب اس حادثے کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی تھی۔

اس منجھے ہوئے سیاست داں اور سفارت کار کی آبرو خاک میں مل گئی۔ وہ دونوں بادشاہوں کے نزدیک مردود ٹھہرا بلکہ دونوں ممالک میں لوگوں کا اعتماد اس پر سے اُٹھ گیا۔

تاریخ کی کتابوں میں بہت سے ایسے واقعات درج ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ جھوٹ کی وجہ سے بنی نوعِ انسان کو کتنے زبردست نقصانات پہنچے ہیں۔
معاصرین کے حالات کے مطالعے سے بھی جھوٹ کی فتنہ انگیزیوں کا بخوبی پتا چلتا ہے۔

یہ جھوٹ کی مضرّتوں کی بنا پر ہی ہے کہ اسلام نے اس کے خلاف بڑی شدّومد سے جنگ کی اور اسے بے ایمان اور بے شخصیّت لوگوں کی صفت قرار دیا اور جھوٹے شخص کو لعنت اور نفرین کا سزاوار گردانا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جو شخص کسی عُذر کے بغیر جھوٹ بولے فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔"[1]

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"جھوٹے شخص کا جوانمردی میں کوئی حصّہ نہیں۔"[2]

امام الصّادق علیہ السّلام راستگوئی اور امانتوں کی ادائیگی کو لوگوں کے ایمان اور قدر و قیمت کا معیار قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لوگوں کی آزمائش دو چیزوں سے کرو! ایک بات کرتے وقت سچ بولنے سے اور دوسرے، دوسروں کی امانتوں کے بارے میں امین ہونے سے۔"[3]

۱؎ جامع السعادات، جلد دوّم ۲؎ خصال۔ صدوق۔ جلد اوّل

۳؎ غرر الحکم

دروغ مصلحت آمیز

پچھلے صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ جھوٹ کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اب موقع ہے کہ دروغ مصلحت آمیز کے بارے میں بھی وضاحت کردی جائے۔

اسلام میں جو گناہ حرام اور ناروا سمجھے گئے ہیں اصولاً ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم گناہوں کی وہ ہے جن میں فی نفسہٖ قباحت ہو اور وہ خود بخود بُرے اور ناپسندیدہ کام شمار ہوتے ہوں مثلاً قتلِ انسانی، ظلم، دوسروں کے حقوق غصب کرنا، چوری کرنا وغیرہ۔

دوسری قسم گناہوں کی وہ ہے جو فتنہ وفساد کا پیش خیمہ ہوں اور دوسرے جرائم کے لیے میدان ہموار کرتے ہوں۔

جھوٹ کا تعلق دوسری قسم کے گناہوں سے ہے اور گزشتہ روایات میں نقل کیا جاچکا ہے کہ جھوٹ گناہوں اور برائیوں کی کنجی ہے۔

لہٰذا اگر کوئی ایسی صورت پیش آئے کہ جھوٹ گناہ کا سدّباب کرنے کا موجب بن جائے یا اس کی حیثیت ایک مظلوم کو ظلم سے بچانے والی کنجی کی ہوجائے تو پھر یہ ناجائز نہیں رہتا اور بنیادی طور پر گناہ کے زمرے سے خارج ہوجاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئی ذاتی قباحت نہیں اور پیشِ نظر مصلحتوں کی بنا پر اس کی اتفاقی قباحت بھی زائل ہوجاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں نہ صرف یہ کہ جھوٹ حرام نہیں ہے بلکہ اگر اس کے ذریعے کسی مسلمان کی جان بچتی ہو یا اس کی آبرو کی حفاظت ہوتی ہو تو واجب ہے۔

امام الصادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اَيُّمَا مُسْلِمٍ سُئِلَ عَنْ مُسْلِمٍ فَصَدَقَ وَ اُدْخِلَ

عَلیٰ ذَالِکَ الْمُسْلِمِ مَضَرَّۃٌ کُتِبَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ وَمَنْ سُئِلَ عَنْ مُسْلِمٍ فَکَذَبَ وَاُدْخِلَ عَلیٰ ذَالِکَ الْمُسْلِمِ مَنْفَعَۃٌ کُتِبَ عِنْدَ اللّٰہِ مِنَ الصَّادِقِیْنَ۔

"اگر کسی مسلمان سے کسی دوسرے مسلمان کا پتا چلایا جائے اور وہ سچ بتا دے اور اس کے سچ کہنے کے نتیجے میں اس مسلمان کو نقصان پہنچے تو اس کا (یعنی سچ بتانے والے کا) نام جھوٹوں کے زمرے میں لکھا جائے گا اور اگر کسی مسلمان سے کسی دوسرے مسلمان کا پتا چلایا جائے اور وہ جھوٹ کہہ دے اور اس جھوٹ کے نتیجے میں اس مسلمان کو فائدہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شخص کا شمار سچ بولنے والوں میں ہوگا۔"

شیخ سعدیؒ گلستان' میں بیان کرتے ہیں :

"ایک بادشاہ کے بارے میں' میں نے سُنا کہ اس نے ایک قیدی کو قتل کر دینے کا اشارہ کیا۔ وہ بے چارا ناامیدی کی حالت میں بادشاہ کو گالیاں بکنے اور سخت سُست کہنے لگا۔ کیونکہ (دانشمندوں نے کہا ہے کہ) جو شخص جان سے ہاتھ دھو لیتا ہے وہ جو اس کے جی میں آئے کہتا ہے۔

وقتِ ضرورت چو نماند گریز
دست بگیرد سرِ شمشیرِ تیز

(ضرورت کے وقت جب کوئی چارہ نہیں رہتا تو انسان تیز تلوار کی نوک بھی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے)

بادشاہ نے پوچھا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ ایک نیک دل وزیر نے کہا:
"حضور! یہ کہہ رہا ہے کہ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ"

بادشاہ کو رحم آگیا اور اسے قتل کرنے سے باز رہا۔

ایک دوسرے وزیر نے جو اس کے خلاف تھا کہا: ہمارے ابنائے جنس کے لیے یہ مناسب نہیں کہ بادشاہوں کے حضور میں سچی بات کے علاوہ کچھ کہیں۔ اس شخص نے بادشاہ کو گالیاں دی ہیں اور بُرا بھلا کہا ہے" بادشاہ نے اس کی بات سے مُنہ پھیر لیا اور کہا: "جو سچی بات تو نے کہی ہے اس کے مقابلے میں مجھے اس کا جھوٹ زیادہ پسند آیا کیونکہ اُس کی وجہ مصلحت تھی اور اس کی بنیاد خباثت پر ہے اور دانشمندوں نے کہا ہے:

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز"

(مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ پیدا کرنے والے سچ سے بہتر ہے)

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"تین چیزیں ایسی ہیں جن میں جھوٹ مناسب ہے:
جنگی چال چلنا، شوہر کا بیوی سے وعدہ کرنا اور لوگوں کی اصلاح کرنا"

(وضاحت) جہاں تک جنگی چال چلنے کا تعلق ہے محترم قارئین کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام علاقے فتح کرنے کی خاطر جنگ کو ممنوع سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک جنگ کا مقصد حق اور باطل کے مابین مقابلہ ہے۔ ان لڑائیوں میں دشمن کو دھوکے میں رکھنا حق کی تقویت اور باطل کی کمزوری کا موجب ہوتا ہے اور اسی لیے پسندیدہ فعل ہے۔

جہاں تک شوہر کے بیوی سے وعدہ کرنے کا تعلّق ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اسلام میاں بیوی کی خوشحالی اور نیک بختی کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ پیار اور محبّت سے زندگی بسر کریں لہٰذا اس نے (شوہر کو بیوی سے) جھوٹا وعدہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ اگر شوہر بیوی کا تقاضا پورا کر دے اور اپنا وعدہ وفا کر دے تو بہت ہی اچھا ہے لیکن اگر وہ وعدہ پورا نہ کر سکتا ہو یا اس کا پورا کرنا مناسب نہ سمجھتا ہو تب بھی وعدہ کر کے وہ اپنی بیوی کو خوش رکھ سکتا ہے اور اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچاتا۔

اب رہا سوال لوگوں کی اصلاح کا۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ دوستانہ روابط قائم رہیں اور اگر دو اشخاص یا دو گروہوں کے مابین اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اختلاف کا رفع ہونا فریقین اور معاشرے کے لیے یقیناً سود مند ہے اور اسی لیے لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کی خاطر جھوٹ بولنا مستحسن سمجھا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَا كِذْبَ عَلٰى مُصْلِحٍ

"جو شخص لوگوں کے مابین صلح صفائی کرانا چاہتا ہو وہ جھوٹ سے بَری ہے۔"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"جھوٹ بُری اور ناپسندیدہ چیز ہے بجز دو حالتوں کے۔ ظالموں کا شر رفع کرنا اور لوگوں کے مابین صلح صفائی کرانا۔"

بالعموم جب بھی جھوٹ بولا جائے اور اس کا مقصد مسلمان کو شر اور نقصان سے بچانا یا لوگوں کے مابین صلح صفائی کرانا ہو تو وہ مستحسن اور پسندیدہ ہے کیونکہ ایسا

جھوٹ گناہوں کی کنجی نہیں بلکہ لوگوں سے نیکی اور احسان کی کنجی ہوتا ہے۔ البتہ ایسا جھوٹ بھی صرف اسُی وقت جائز اور پسندیدہ ہے جب سچ کہنا ممکن نہ ہو اور یہی صورت ہے جس میں جھوٹ بولنا جائز یا واجب ہو جاتا ہے اور سچی بات کہنا ممنوع یا حرام متصوّر ہوتا ہے۔

اس موضوع پر بحث کے خاتمے سے پہلے یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مصلحت آمیز جھوٹ بھی صرف ان حالات میں جائز ہے جن میں اسلام نے اسے جائز قرار دیا ہے اور جب اسے ترک کرنا خطرے اور نقصان کا موجب ہو۔ تاہم مالی فوائد یا شخصی منافع حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولنا مصلحت آمیز جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔ ایسا جھوٹ قطعاً حرام ہے جس پر جھوٹ کی حرمت کے بارے میں آیات اور روایات کا مکمّل اطلاق ہوتا ہے اور جو دنیا اور آخرت میں ذلّت اور بدبختی کا موجب ہے۔

اسلام میں اجتماعی روابط

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے اور یہ ضروری ہے کہ وہ اجتماعی اور گروہی شکل میں زندگی گزارے کیونکہ اس کی ضرورتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ انھیں پورا کرنے کے لیے اپنے ہم جنسوں کی معاونت سے اقدام کرے۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام کے لیے ذمّے دار ہو اور ہر گروہ کسی نہ کسی مشکل کو حل کرے تاکہ ہر ایک کی زندگی دلکش اور خوشحال ہو جائے۔

یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اور گروہی شکل میں زندگی بسر کرنا اسی وقت سعادت اور نیک بختی کا موجب بن سکتا ہے جب افراد اپنی ذمّے داریوں سے آگاہ اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کے پابند ہوں اور اس کے علاوہ افراد کے باہمی تعلّقات انسانیّت کے معیار پر پورے اُتریں اور اعلیٰ جذبات اور خصوصیات سے مرکّب ہوں۔

اگر ایک معاشرے کے افراد کے روابط میں انسان دوستی، غریب پروری، کریم النّفسی، خیر خواہی، احسان، خدمتِ خلق اور تعاون وغیرہ جیسی خوبیاں موجود نہ ہوں تو اس معاشرے کو خوش بخت ہرگز تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام نے جو ایک آسمانی آئین ہے اجتماعی روابط کو بڑی اہمیّت دی ہے اور لوگوں کے باہمی برادرانہ اور دوستانہ رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے مکمّل اور جامع احکام دیے ہیں۔

اگر اس بارے میں ہم بالکل درست بات کہنا چاہیں تو ہمیں کہنا چاہیئے کہ جو چیزیں معاشرے کے روابط کو بہتر بنانے اور اس کے رشتوں کو استحکام بخشنے کے لیے ضروری اور مفید ہیں اسلام نے ان کا حکم دیا ہے اور جو چیزیں ان روابط کو رتّی بھر ٹھیس پہنچائیں یا ان کے ٹوٹنے یا کمزور پڑنے کا موجب ہوں ان سے منع فرمایا ہے۔

جن لوگوں کا اسلامی مسائل کا مطالعہ وسیع ہے انھیں مذکورہ بالا دعوے کی صحت کے بارے میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور مقنّنِ اسلام نے اِجتماعی روابط کی حفاظت، بہبود اور تقویّت کے لیے جو جامع احکام دیے ہیں ان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے دوسرے لوگ بھی اس ناقابلِ تردید حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ معاشرتی لائحہ ہائے عمل میں اسلام نے جن مسائل کی جانب توجّہ دی ہے اکثر لوگ ان کی جانب توجّہ نہیں دیتے اور ان کی اہمیّت کے ہرگز قائل نہیں حالانکہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے بڑی بڑی روایات جنم لیتی ہیں۔

مثلاً لوگوں کے باہمی روابط میں سب سے زیادہ بے تکلف وہ ملاقاتیں ہیں جو راہ چلتے، گلی میں اور سڑک پر، بس کے اندر، مسجد میں یا اسکول وغیرہ میں ہوتی ہیں۔ ان ملاقاتوں کو اکثر لوگ قطعاً غیر اہم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کے نظریے کے مطابق یہ ملاقاتیں خاص حالات میں وقوع پذیر ہونی چاہئیں تاکہ باہمی تعلقات اور پیار محبّت کا موجب بن سکیں۔

اسلام ہدایت کرتا ہے کہ یہ بے تکلفانہ ملاقاتیں خندہ پیشانی اور سلام دُعا کے ساتھ انجام دی جایئں اور جب ممکن ہو تو ایک دوسرے کا ہاتھ دبا کر مصافحہ بھی کیا جائے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

أَوْلَى النَّاسِ بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ مَنْ بَدَءَ بِالسَّلَامِ[1]

"اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک شائستہ ترین شخص وہ ہے جو ابتداء اسلام سے کرے۔"

امام محمد الباقرؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُحِبُّ اِفْشَاءَ السَّلَامِ[2]

"اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دوست رکھتا ہے جو ایک دوسرے کو علانیہ اور برملا سلام کہیں۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

لَا تَغْضَبُوْا وَلَا تُغْضِبُوْا اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطِيْبُوا الْكَلَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ[3]

"غصہ نہ کرو اور دوسروں کو بھی غصہ نہ دلاؤ۔ ایک دوسرے کو علانیہ سلام کہو، خوش خلقی سے گفتگو کرو اور نمازِ شب پڑھو تاکہ بہشت اور جاودانی نیک بختی حاصل کر سکو۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى

---

[1]، [2]، [3] الکافی۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۷۱

تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی تَحَابُّوْا اَفَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ ؟ قَالُوْا بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ. قَالَ : اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ [1]

"مجھے اس پروردگار کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمھیں بہشت اور سعادتِ ابدی بغیر اس کے حاصل نہیں ہوسکتی کہ تم باایمان ہوجاؤ اور جب تک تم ایک دوسرے کو دوست نہیں رکھوگے باایمان نہیں ہوگے۔ کیا میں تمھاری رہنمائی ایک ایسے کام کی جانب نہ کروں جس کے نتیجے میں تمھارے درمیان دوستی اور محبّت پیدا ہو جائے؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں! یارسول اللہؐ! (یعنی ضرور ہماری اس جانب رہنمائی کیجیے) آنحضرتؐ نے فرمایا: "ایک دوسرے کو علانیہ سلام کیا کرو۔"

سلام کا معاملہ اگرچہ ایک معمولی اور غیر اہم چیز سمجھا جاتا ہے لیکن لوگوں کے مابین دوستی اور محبّت پیدا کرنے میں اتنا گہرا اثر رکھتا ہے جس کی تعریف کرنا ممکن نہیں۔

ڈیل کارنیگی نے ایک معروف شخصیّت کا مطالعہ کیا جو لوگوں میں کافی ہردلعزیز تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس شخص کی غیر معمولی مقبولیّت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ سب کو سلام کیا کرتا تھا۔ [2]

شاید ہر شخص کو اپنی زندگی میں اس چیز کا تجربہ ہوا ہو کہ بہت سی قیمتی دوستیاں ایک یا کئی مرتبہ سلام کرنے سے شروع ہوجاتی ہیں اور کئی ایک دشمنیاں سلام دعا کے

---

[1] حقوق اسلامی۔ صفحہ ۱۴۱، ۳۴

[2] (How to win friends and influence people)

نتیجے میں رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہیں۔

سلام کے بارے میں سفارش اور تاکید کرنے کے علاوہ اس مقصد کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہ کہیں یہ پسندیدہ کام متروک نہ ہو جائے اسلام نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی شخص سلام کرنے سے پہلے گفتگو شروع کر دے تو اس کا جواب نہ دیا جائے۔

رسولِ اکرم ؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ بَدَءَ بِالْکَلَامِ قَبْلَ السَّلَامِ فَلَا تُجِیْبُوْہُ

"جو شخص سلام کرنے سے پہلے بات کرنے لگے اُسے جواب نہ دو"

اور اس سے بڑھ کر رہبرِ اسلام نے سلام ترک کرنے والے کو سب سے زیادہ بخیل شخص قرار دیا ہے۔

آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے:

اَبْخَلُ النَّاسِ مَنْ بَخِلَ بِالسَّلَامِ۔

"لوگوں میں سب سے زیادہ بخیل وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں بُخل کرے"

ایک اور فریضہ جو مسلمانوں کو ملاقات کے وقت انجام دینا چاہیئے یہ ہے کہ جب وہ ایک دوسرے سے ملیں تو ان کے چہرے کِھلے ہوئے ہوں اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو۔

امام محمد الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

تَبَسُّمُ الرَّجُلِ فِیْ وَجْہِ اَخِیْہِ حَسَنَۃٌ۔

"اپنے مسلمان بھائی کے سامنے مسکرانا نیکوکاری میں شمار ہوتا ہے"

امام علی الرّضا علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَنْ تَبَسَّمَ فِیْ وَجْہِ اَخِیْہِ الْمُؤْمِنِ کَتَبَ اللّٰہُ

لَـهٗ حَسَنَۃٌ ۔

"اگر کوئی شخص اپنے مومن بھائیوں سے ملاقات کے وقت مُسکرائے تو اللہ تعالیٰ اُسے اِس کام کا نیک بدلہ دے گا۔"

اس اسلامی اصُول کو آجکل کے ماہرینِ نفسیات انسان کی کامیاب زندگی کی علامت سمجھتے ہیں۔

البرٹ ہوبارڈ کہتا ہے:

"جب بھی تم گھر سے باہر نکلو سر بلند رکھّو اور گہری سانسیں لو اور سورج کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کرو اور دوستوں اور آشناؤں سے مسکرا کر ملو اور جب ہاتھ ملاؤ تو اس میں روح پھونک دو۔"

ڈیل کارنیگی کہتا ہے:

"انسان کے اعمال کی تاثیر اس کے الفاظ سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ ایک مسکراہٹ کہتی ہے کہ میں تجھے عزیز رکھتی ہوں۔ تو مجھے خوش کرتا ہے میں تیری ملاقات سے خوش ہوں۔"

ایک چینی کہاوت ہے:

"جس شخص کے چہرے پر مسکراہٹ نہ ہو اُسے دکان نہیں کھولنی چاہئیے۔"

ایک اور اہم بات جس کی رہبرانِ اسلام نے لوگوں کی ملاقاتوں کے سلسلے میں تاکید اور سفارش کی ہے مصافحہ کرنا اور ایک دوسرے کے ہاتھ کو گرمجوشی سے دبانا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اِذَا الْتَقٰی اَحَدُکُمْ اَخَاہُ فَلْیُسَلِّمْ وَلْیُصَافِحْہُ[1]

---

[1] حقوقِ اسلامی ۔ صفحہ ۳۴۷

"جب تم میں سے کسی شخص کی ملاقات اپنے مسلمان بھائی سے ہو تو اُسے چاہیئے کہ اُسے سلام کہے اور اس کے ساتھ مصافحہ کرے۔"

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

تَمَامُ تَحِيَّاتِكُمْ بَيْنَكُمُ الْمُصَافَحَةُ [1]

"جب تم ایک دوسرے سے ملاقات کرو تو تمھارا سلام کہنا اس وقت کامل ہوگا جب اس کے ساتھ ہاتھ ملانا اور مصافحہ کرنا بھی شامل ہو۔"

مسلمانوں کے معاشرے میں اچھے روابط قائم کرنے کے لیے اوّلین قدم یہ ہے کہ جب عام طور پر آمنا سامنا ہو تو ایک دوسرے سے دوستانہ اور محبّت آمیز طریقے سے ملاقات کی جائے اور اپنے تعلّقات کی بنیاد پیار اور خلوص پر استوار کی جائے۔

اس مرحلے سے گزر کر ہم اسلام کے دوسرے احکام تک پہنچتے ہیں یعنی یہ کہ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اپنے دینی بھائیوں کو دل سے دوست رکھیں۔

دوسروں کو دوست رکھنا انسان کی مخصوص صفات اور غیر معمولی میلانات میں سے ہے اور یہی روحانی التفات ہے جو انسان کو دوسرے کی جانب متوجّہ کرتا ہے، افراد کو ایک دوسرے پر مہربان کرتا ہے، اعتدال کی حس کو مصروفِ عمل کرتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک کرتا ہے۔

دوسروں سے دوستی کا میلان انسان کے دوسرے عالی میلانات کی طرح کمزور اور دھندلا ہوتا ہے اور تربیت اور توجّہ کے بغیر طاقتور نہیں ہوتا۔ اگر والدین اور اتالیق بچپن کے زمانے سے ہی اپنے بچّوں کی جانب متوجّہ ہوں اور اپنی ذمّے داریاں بطورِ احسن انجام دیں تو وہ اس انسانی خُو کو بتدریج ان کی فطرت میں پروان چڑھا سکتے ہیں اور انھیں بنی نوعِ انسان کا دوست اور خیر خواہ بنا سکتے ہیں۔

---

[1] حقوقِ اسلامی۔ صفحہ ۳۴۷

اگر اپنی ذات، محبّت حمایت اور تقویّت کا مورد قرار پائے تو اس میں شدّت آجاتی ہے اور وہ مصلحت کی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے اور نتیجے کے طور پر خود پسندی اور خود پرستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بالآخر یہ بہت بڑی خرابیوں کو جنم دیتی ہے اور انسان کو اخلاقی بُرائیوں اور دوسروں کے حقوق میں تجاوز میں ملوّث کر دیتی ہے اور غیر انسانی کاموں پر اُکساتی ہے۔

اگر دوسروں سے دوستی، حمایت اور تقویت کا مورد قرار پائے تو حیوانی صفات پر غالب آجاتی ہے، تخریب اور جارحیّت کی جبلّت کو کمزور کر دیتی ہے، درندہ خوئی اور آتش مزاجی کی سرکوبی کرتی ہے اور آدمی کو ایک بہت ہی گرانقدر انسانی صفت سے متّصف کر دیتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دوسروں سے دوستی سے مراد اخلاقی فضیلت اور انسانی شرافت کی بنا پر دوسرے انسانوں سے پیار اور محبّت ہے۔ یہ نہیں کہ دوستی کا محرّک جبلّی خواہشات کی تکمیل اور مادّی تمنّاؤں کا حصُول ہو۔

انسان اپنے علاج کرنے والے ڈاکٹر اور دیکھ بھال کرنے والی نرس سے دلبستگی کا اظہار کرتا ہے لیکن اس دلبستگی کا روحانی مبداء دوسرے کے ساتھ دوستی اور عالی انسانی میلانات نہیں ہوتا بلکہ اس محبّت کا سرچشمہ اپنی ذات سے پیار اور زندگی سے عشق کا جذبہ ہوتا ہے۔ بیمار شخص اپنے طبیب اور نرس سے اس لیے لگاؤ رکھتا ہے کہ وہ اس کا علاج کرتے ہیں اور اس کی صحّت کی بحالی کا موجب بنتے ہیں اور یوں اس کی اپنی ذات سے محبّت کی خواہش کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس قسم کی محبّت حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے اور فقط انسانوں سے مخصوص نہیں ہے۔

دوسروں سے حقیقی دوستی رکھنے والا شخص وہ ہے جو انسانوں کو انسان ہونے کے ناتے اور پاک انسانی احساسات کی تحریک کی بنا پر دوست رکھتا ہو اور اس کی محبّت

خود غرضی اور مادّی فوائد سے پاک ہو۔ اس قسم کی دوستی عالی ظرفی کی علامت اور روح کی پاکیزگی کی نشانی ہوتی ہے اور انسانوں سے مخصوص ہے۔ ایسی دوستی اور محبّت انسانی زندگی کو حیوانات کی زندگی سے ممیّز کرتی ہے۔ انسانی معاشروں کو باہم مربُوط کرتی ہے اور بھائی چارے اور تعاون کی رُوح کو زندہ کرتی ہے۔ اس قسم کی محبّت لوگوں کو حیوانی عادات اور درندگی سے دور رکھتی ہے۔ انھیں احساسِ حفاظت اور اطمینانِ قلب بخشتی ہے۔ صلح صفائی کا ماحول پیدا کرتی ہے اور زندگی کو خوشگوار بناتی ہے۔

اسلام کے مقدّس آیئن میں دوسرے انسانوں سے دوستی اور محبّت کی جانب بے حد توجّہ دی گئی ہے اور مذہبی پیشواؤں نے اس پسندیدہ عادت کو انسانی خوش بختی کے عوامل میں سے ایک عامل اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کے حصُول کے وسیلوں میں سے ایک وسیلہ قرار دیا ہے۔

امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اَھْلَ الْاَرْضِ لَمَرْحُوْمُوْنَ مَاتَحَابُّوْا وَ اَدَّوُا الْاَمَانَةَ وَعَمِلُوْا الْحَقَّ [1]

"لوگ جب تک ایک دوسرے کے دوست رہتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، ان کی روش سچّائی اور حقیقت کے مطابق رہتی ہے تو وہ کرۂ زمین پر رحمت اور شفقت کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے ہیں۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اَبْلَغُ مَاتَسْتَدِرُّ بِهِ الرَّحْمَةَ اَنْ تُضْمِرَ لِجَمِيْعِ النَّاسِ الرَّحْمَةَ [2]

"سب سے مؤثر چیز جس کے ذریعے تم اللہ کی رحمت کو اپنی جانب متوجہ

---

[1] مجموعۂ ورام۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۲

[2] غرر الحکم۔ صفحہ ۲۱۲

کر سکتے ہو یہ ہے کہ تم اپنے باطن میں سب لوگوں پر مہربان رہو۔"

اور آپ نے یہ بھی فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ سُبحانَہٗ یُحِبُّ اَنْ یَّکُوْنَ نِیَّۃُ الْاِنْسَانِ لِلنَّاسِ جَمِیْلَۃً [1]

"اللہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی بھلائی کے بارے میں سوچیں اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔"

انسان دوستی اور عامّۃ النّاس کی خیر خواہی اللہ کے پیغمبروں اور روحانی پیشواؤں کی بدیہی صفات تھیں۔ وہ لوگوں کی سعادت اور خوش بختی کے شیدا تھے اور ان کی گمراہی اور نادانی سے انھیں دکھ پہنچتا تھا۔

ایک نکتہ جس کی جانب یہاں اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ہر نسل اور ہر ملک کے لوگوں سے خیر خواہی اور احسان کے بارے میں تاکید اور سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام اس بات پر بھی یقین رکھتا ہے کہ ایک اٹوٹ اور پائدار رشتہ قائم کرنے کے لیے ایک مضبوط اور مستقل بنیاد کی ضرورت ہے جو کبھی بھی متزلزل نہ ہو اور تمام لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور وابستہ رکھے۔

اسلام ہم زبانی، ہم وطنی، نسل کی وحدت اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے مسئلے کو بنیادی اور قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا کیونکہ گو یہ ممکن ہے کہ یہ چیزیں کسی حد تک لوگوں کے مابین روابط کے قیام کا سبب بنیں لیکن اگر ان سے بھی قوی تر عوامل مثلاً مادّی تصادمات اور اختلافات بیچ میں آجائیں تو ان روابط کو توڑ دیتے ہیں اور ان کی بجائے دشمنی اور عناد پیدا کر دیتے ہیں۔

اسلام اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اگر لوگوں کا ایک آئین اور ایک مذہب ہو

---

[1] غرر الحکم۔ صفحہ ۲۷۱

تو خواہ وہ مختلف نسلوں اور مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے ہوں اور مختلف بولیاں بولتے ہوں پھر بھی ان کے مابین بھائی چارے کی رُوح پیدا ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ اور مخلصانہ برتاؤ کریں گے۔ اس صورت میں کوئی بھی عامل نہ تو لوگوں کے روابط میں رخنہ پیدا کر سکے گا اور نہ ہی ان کے تعلّقات میں دشمنی کا رنگ بھر سکے گا۔

صدرِ اسلام کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے سے اس نظریے کی صحّت واضح ہو جاتی ہے۔ جب رسولِ اکرمؐ بنی نوعِ انسان کی نجات کے لیے اسلام کی عالی تعلیمات کے ساتھ مبعوث برسالت ہوئے گو اُس وقت عربستان کے لوگ ایک نسل اور ایک وطن سے تعلّق رکھتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے پھر بھی یہ جزیرہ نما جنگ، دشمنی، ظلم اور زیادتی کی آگ میں جل رہا تھا اور اس علاقے میں جن چیزوں کا فقدان تھا وہ امن و امان اور لوگوں کے مابین انسانی روابط تھے۔

رسولِ اکرمؐ نے اس قوم کی ہدایت اور اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور ابھی زیادہ مدّت نہیں گزری تھی کہ وہی لوگ جو صدیوں سے آپس میں نہ ختم ہونے والی دشمنی اور خصومت رکھتے تھے اور خونریزی اور جرائم کے خُوگر ہو چکے تھے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایک دوسرے کے ایسے بھائی بن گئے کہ دیرینہ بدخواہیوں، دشمنیوں، زیادتیوں اور خونریزیوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا اور ان بُری اور ناپسندیدہ عادات کی بجائے فضیلتیں، پاکیزگیاں، خیر خواہیاں اور دوسری مستحسن صفات اور عادات ظہور پذیر ہو گئیں۔

قرآنِ مجید ان روابط کو 'حَبلُ اللّٰہ' یعنی اللہ کی رسّی کا نام دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"سب کے سب اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں

نااتفاقی پیدا نہ کرو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمھارے دلوں میں باہمی محبّت پیدا کر دی اور تم اُس کی مہربانی سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور اس صورت میں جب کہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اس نے تمھیں بچالیا۔“ [1]

مذہبی تعلّق اور دینی وحدت اتنی مضبوط اور محکم چیز ہے کہ ہر مسلمان خواہ اس کا تعلّق کسی نسل سے ہو اور دنیا کے کسی بھی خطّے میں بُود وباش رکھتا ہو اپنے آپ کو اپنے دینی بھائیوں سے جُدا نہیں سمجھتا اور ان کی خوشی میں خوش اور غم میں غمگین ہوتا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے اپنے ایک ارشاد میں اس حقیقت کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ وَّاحِدٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔

”اہلِ ایمان محبّت، دوستی اور احساسات میں ایک دوسرے کی بہ نسبت ایک پیکر کی مانند ہیں جس کا ایک عضو تکلیف میں ہو تو دوسرے اعضاء تکلیف اور بے چینی کے ذریعے اس سے ہمدردی کرتے ہیں۔“

شیخ سعدی نے اپنے مشہور اشعار میں اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے:

---

[1] سورۃ آلِ عمران - آیت ۱۰۳

بنی آدم اعضائے یک پیکرند　　　　که در آفرینش زیک گوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار　　　　دگر عضوہا را نماند قرار

(بنی آدم ایک پیکر کے اعضاء ہیں کیونکہ ان کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ جب زمانہ ایک عضو کو تکلیف پہنچاتا ہے تو دوسرے اعضاء کو بھی قرار نہیں رہتا)۔

قرآنِ مجید اس اٹوٹ اور بنیادی رشتے کو بھائی چارے کا رشتہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"بالتحقیق باایمان لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ پس تم اپنے بھائیوں کے مابین صلح صفائی برقرار رکھو۔"[1]

اسی رشتے اور تعلق کے سلسلے میں ایک دوسرے سے محبت کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اہلِ ایمان کو اس امر کا پابند کیا جاتا ہے کہ اللہ کی خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھیں۔

امام جعفر الصادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

اِنَّ لِلّٰہِ خَلْقًا عَنْ یَمِیْنِ الْعَرْشِ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَعَنْ یَمِیْنِ اللّٰہِ وُجُوْھُھُمْ اَبْیَضُ مِنَ الثَّلْجِ وَاَضْوَءُ مِنَ الشَّمْسِ الضَّاحِیَۃِ یَسْئَلُ السَّائِلُ مَا ھٰؤُلَاءِ؟ فَیُقَالُ: ھٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ تَحَابُّوْا فِیْ جَلَالِ اللّٰہِ[2]

"اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جنھیں قیامت کے دن اس کی مہربانیوں اور عنایتوں کے سائے میں جگہ ملے گی۔ ان کے چہرے آفتاب کی مانند

---

[1] سورۃ الحجرات۔ آیت ۱۰　　　　[2] حقوقِ اسلامی صفحہ ۳۰۴

نورانی ہوں گے۔ کسی شخص نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کی ہے اور باہم مہربان رہے ہیں۔"

اس مقصد کے پیشِ نظر کہ یہ بھائی چارے کا رشتہ ٹوٹ نہ جائے اسلام نے ان عوامل کی تعریف کی ہے جو اس (رشتے) کی تقویت کا باعث بنتے ہیں مثلاً سلام، مصافحہ، ملاقات وجوابی ملاقات، مریض کی عیادت، احسان و نیکوکاری، خدمتِ خلق، ضیافت اور مہمانداری، دوسروں کی ضروریات پوری کرنا وغیرہ اور جو کام اخوت اور بھائی چارے کی روح کو مجروح کرنے کا موجب بنتے ہیں اُن کی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو ان اعمال کے ارتکاب سے منع کیا ہے مثلاً تکبر، لوگوں سے بے اعتنائی برتنا، غیبت اور عیب جوئی، دوسروں کو تکلیف اور اذیت پہنچانا، سخن چینی، دوسرے کے کاموں کے بارے میں تجسس کرنا، تحقیر اور سرزنش، باہمی امداد اور تعاون سے اجتناب برتنا، ٹھٹھا مذاق وغیرہ۔

یہاں ہم مختصراً اور بطور خلاصہ اسلام کے چند اُن اوامر و نواہی کی جانب اشارہ کرتے ہیں جن کا اجتماعی روابط سے گہرا تعلق ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس موضوع پر اسلام کے عالی مرتبت رہنماؤں کے کچھ ارشادات بھی نقل کرتے ہیں:

دُوسروں کو خوش کرنا

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

مَنْ سَرَّ مُؤْمِنًا فَقَدْ سَرَّنِيْ [1]

"جس نے کسی مومن کو خوش کیا اُس نے مجھے خوش کیا۔"

---

[1] جامع السعادات۔ جلد ۲

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

إِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ إِدْخَالُ السُّرُورِ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ [1]

"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کام مومنین کو خوش کرنا ہے۔"

لوگوں کی حاجت روائی

رسولِ اکرمؐ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ قَضَىٰ لِأَخِيهِ الْمُؤْمِنِ حَاجَةً فَكَأَنَّمَا عَبَدَ اللّٰهَ دَهْرَهُ [2]

"جو شخص اپنے مومن بھائی کی حاجت برلائے اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے ایک زمانہ عبادتِ الٰہی میں گزارا ہو۔"

امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام نے فرمایا:

إِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا فِي الْأَرْضِ يَسْعَوْنَ فِي حَوَائِجِ النَّاسِ، هُمُ الْآمِنُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [3]

"روئے زمین پر اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جو لوگوں کی حاجت برآری کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بندے قیامت کے دن سختیوں اور دشواریوں سے محفوظ ہوں گے۔"

بلاشبہ دوسروں کی مشکلات حل کرنے اور حاجتیں رفع کرنا لوگوں کے مابین

---

[1] جامع السعادات - جلد ۲ [2] وسائل الشیعہ

[3] اصول الکافی

محبّت پیدا کرنے اور ان کے تعلّقات مضبوط کرنے میں بڑا گہرا اور ناقابلِ انکار اثر رکھتا ہے اور کبھی کبھی ایسا اتّفاق بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کے کام بڑی گہری دوستی قائم ہونے کا موجب بن جاتے ہیں۔

غیبت کی ممانعت

ایک اہم چیز جو اجتماعی روابط پر بڑی کاری ضرب لگاتی ہے اور جس کی اسلام میں بڑی شدید مخالفت کی گئی ہے غیبت کرنا یا دوسروں کے عیب بیان کرنا ہے۔

خداوندِ متعال فرماتا ہے:

"یہ نہیں چاہیے کہ تم مسلمانوں میں سے بعض، غیبت اور دوسروں کے عیب بیان کرنے کے لیے زبان کھولیں۔"[1]

رسول اکرمؐ ارشاد فرماتے ہیں:

يَا مَعْشَرَ مَنْ اٰمَنَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِقَلْبِهٖ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَبَّعُوا عَوْرَاتِهِمْ فَاِنَّ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ اَخِيْهِ يَتَتَبَّعُ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ حَتّٰى يَفْضَحَهٗ فِيْ جَوْفِ بَيْتِهٖ[2]

"اے وہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لائے ہو تاہم تمھارے دل اس سے بے خبر ہیں مسلمانوں کی غیبت کرنے کے لیے زبان مت کھولو اور ان کے عیوب کا کھوج لگانے کی کوشش میں نہ رہو کیونکہ جو شخص اپنے دینی بھائی کے عیوب کے تجسّس میں رہتا ہے اللہ اس کے راز فاش کر دیتا ہے اس کے عیب عیاں کر دیتا ہے اور اسے رسوا کر دیتا ہے۔"

---

[1] سورۂ الحجرات۔ آیت ۱۲ [2] جامع السعادات۔ جلد ۲

آنحضرتؐ نے مزید فرمایا:

مَا عُمِّرَ مَجْلِسٌ بِالْغِیْبَۃِ اِلَّا خُرِّبَ بِالدِّیْنِ فَنَزِّھُوْا اَسْمَاعَکُمْ مِنِ اسْتِمَاعِ الْغِیْبَۃِ فَاِنَّ الْقَائِلَ وَالْمُسْتَمِعَ شَرِیْکَانِ فِی الْاِثْمِ [1]

"جو مجلس دوسروں کی غیبت اور بدگوئی کے ذریعے رونق حاصل کرے اور آباد ہو وہ دینی نقطۂ نگاہ سے ویران ہو گی۔ اے مسلمانو! تم اپنے کان غیبت سُننے سے دُور رکھو کیونکہ غیبت کرنے والا اور غیبت سُننے والا دونوں گناہ میں شریک ہیں۔"

ایک ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

"جو شخص دوسروں کی برائی کرتا ہے وہ آخر کار ایک دن رُسوا ہوتا ہے اور سر درد سے دوچار ہوتا ہے۔ بدیں معنی کہ وہ چاہے یا نہ چاہے اس کی باتیں دوسرے فریق کے کانوں تک پہنچتی ہیں اور نتیجے کے طور پر وہ ایک دوست کھو بیٹھتا ہے۔ جو شخص اس کی باتیں سنتا ہے وہ اس کی بدگوئی اور نکتہ چینیوں سے اُکتا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بدگوئی عادت کی شکل اختیار کر لے اور وہ یوں کہ ایک شخص بلا ارادہ ہر مجلس اور محفل میں دوسروں کی غیبت کرنے لگے۔ دراصل دوسروں کی بدگوئی کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ بدگو شخص دوسروں سے حسد کرتا ہے۔ بدگو شخص کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور دوسروں کو اپنے آپ سے کمتر ظاہر کرے۔ علاوہ ازیں جس شخص کو اطمینانِ خاطر نہ ہو اور اپنی قدر و قیمت اور مقام کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں

---

[1] احیاء العلوم - جلد ۳

کی غیبت اور بدگوئی کرنے لگتے ہیں۔"

ایذا رسانی کی ممانعت

لوگوں کو آزردہ کرنا ایک ایسی چیز ہے جو لوگوں کے تعلقات کو بہت ناخوشگوار بنا دیتی ہے۔ پیار، محبّت اور دلی اُنسیّت کو معدوم کر دیتی ہے۔ اُلجھنیں پیدا کرتی ہے اور لوگوں کو دشمنی اور انتقام پر اُکساتی ہے۔

اسلامی احکام میں مسلمانوں کو دوسروں کو دُکھ دینے اور اذیّت پہنچانے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِہٖ وَلِسَانِہٖ [1]

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان امان میں ہوں" وہ ہاتھ سے کسی کو اذیّت نہ دے اور زبان سے بھی لوگوں کو نہ ستائے۔

ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا ہے:

لَا یَحِلُّ لِلْمُسْلِمِ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی اَخِیْہِ بِنَظْرَۃٍ تُؤْذِیْہِ۔ [2]

"مسلمان یہ حق نہیں رکھتا کہ مسلمان بھائی پر یوں نگاہ ڈالے کہ اس کے لیے موجبِ آزار ہو۔"

یعنی مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ دوسرے مسلمان کو غصّے، مذاق یا تحقیر وغیرہ کی نگاہ سے دیکھ کر اسے پریشان کرے اور دُکھ دے۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

---

[1] حقوقِ اسلامی [2] جامع السعادات - جلد ۲

مَنْ حَقَّرَ مُؤْمِنًا مِسْكِينًا اَوْ غَيْرَ مِسْكِيْنٍ لَمْ يَزَلِ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ حَاقِرًا لَهٗ مَاقِتًا، حَتّٰى يَرْجِعَ عَنْ مَحْقَرَتِهٖ اِيَّاهُ [1]

"جو شخص کسی مومن کی تحقیر کرے اللہ اس پر غضبناک ہوگا تاوقتیکہ وہ اپنے بُرے کام کی تلافی کردے۔"

عیب جُوئی کی ممانعت

بعض لوگوں کی فطرت میں ایسے ناپسندیدہ میلانات موجود ہوتے ہیں جو انھیں دوسروں کے خصوصی امور کے بارے میں تجسّس اور ان کے بھید معلوم کرنے کی جانب مائل کرتے ہیں۔ یہ میلانات ایسی منحوس بیماریوں کو جنم دیتے ہیں جو سب سے پہلے ان میں مبتلا ہونے والوں کا دامن پکڑتی ہیں اور انھیں بدبختی کی جانب کھینچتی ہیں۔

جو عوامل انسان کو دوسروں کی عیب جوئی پر آمادہ کرتے ہیں وہ ایک قسم کا احساسِ کمتری ہے جس کی تلافی کے لیے انسان دوسروں کے عیوب گنوانے لگتا ہے تاکہ اسے اطمینان حاصل ہو۔ اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ایسا کرنے سے لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے نفرت اور کراہت پیدا ہوتی ہے۔ دوست اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے اس کے تعلّقات کمزور پڑ جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ جتنا وقت اور محنت دوسروں کی عیب جوئی میں ضائع کرتے ہیں اگر اسے اپنے عیوب کا کھوج لگانے میں صرف کریں اور ان عیوب کو دُور کرنے کی کوشش کریں تو بڑے مفید نتائج سے بہرہ ور ہوں گے۔

لوگوں کے باہمی تعلّقات کی حفاظت کی خاطر اسلام نے عیب جوئی کو، جو جدائی

---

[1] احیاء العلوم - جلد ۲

اور تفرقے کا موجب ہے ممنوع قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس کے ارتکاب سے خبردار کیا ہے۔

امام محمد الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

كَفٰى بِالْمَرْءِ عَيْبًا اَنْ يَّبْصُرَ مِنَ النَّاسِ مَا يَعْمٰى عَنْهُ مِنْ نَفْسِهٖ اَوْ يُعَيِّرَ النَّاسَ بِمَا لَا يَسْتَطِيْعُ تَرْكَهٗ اَوْ يُؤْذِىَ خَلِيْلَهٗ بِمَا لَا يَعْنِيْهِ [1]

"ایک انسان میں عیب ثابت ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ایک عیب دوسروں میں دیکھے اور اسی عیب کو جو خود اس میں ہے نہ دیکھے یا لوگوں کو ایک ایسے کام پر سرزنش کرے جسے ترک کرنے پر وہ خود قادر نہ ہو یا اپنے دوست کو ایسے معاملات کے سلسلے میں تکلیف پہنچائے جن کا تعلق اس سے نہ ہو۔"

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَنْ بَحَثَ عَنْ عُيُوْبِ النَّاسِ فَلْيَبْدَاْ بِنَفْسِهٖ [2]

"جو شخص لوگوں کے عیوب کی چھان بین کرنے لگے اسے چاہیئے کہ اس کام کی ابتدا اپنے آپ سے کرے (کیونکہ وہ خود بھی تو لوگوں میں شامل ہے۔)"

امیر المومنین ؑ عیب جو اشخاص کو رفاقت اور میل جول کے قابل نہیں سمجھتے اور لوگوں کو ان کی صحبت سے منع فرماتے ہیں۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے:

اِيَّاكَ وَمُعَاشَرَةَ مُتَتَبِّعِيْ عُيُوْبِ النَّاسِ فَاِنَّهُمْ لَمْ يَسْلَمْ مُصَاحِبُهُمْ مِنْهُمْ [3]

---

[1] الکافی - جلد ۲ [2]، [3] غررالحکم

"عیب جُو لوگوں سے میل جول سے پرہیز کرو کیونکہ ان کا رفیق بھی ان کی گزند سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔"

تمسخر کرنے کی ممانعت

تمسخر کسی شخص کے ایسے عیب کی عیب جوئی ہے جو اختیاری اور قابل رفع نہ ہو مثلاً یہ کہ دولتمند، غریب کا مذاق اُڑائے، خوبصورت شخص بدصورت شخص کی تضحیک کرے یا طاقتور کمزور پر پھبتی کسے۔

یہ بُرا عمل یعنی دوسروں کا مذاق اڑانا دلوں میں دشمنی کا بیج بو دیتا ہے کیونکہ جس شخص کی تضحیک کی جائے وہ لوگوں کی نظروں میں رسوا اور ذلیل ہوتا ہے اور اس کے احساسات مجروح ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"اے اہلِ ایمان! تم میں سے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے شاید جن کا مذاق اڑایا جائے وہ مذاق اُڑانے والوں سے بہتر اور بالاتر ہوں" [1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں فضیلت اور برتری کا معیار دولت، طاقت اور خوبصورتی وغیرہ نہیں ہے بلکہ برتری کا معیار فقط اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عزت اور آبرومندی ہے۔

اسلام جو تمام مسلمانوں کی عزت اور آبرومندی کا طالب ہے اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی شخص کی حیثیت اور رتبے پر حملہ کر کے اسے داغدار کیا جائے۔

اسلام نے جو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی گردانتا ہے اور ان کے باہمی

---

[1] سورۃ الحجرات - آیت ۱۱

تعلقات میں دلچسپی رکھتا ہے اس ناپسندیدہ روش کا مقابلہ کیا ہے اور مسلمانوں کو ایسے اعمال سے خبردار کیا ہے۔

عموماً دو قسم کے اشخاص لوگوں کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اوّل وہ اشخاص جو خود غرض متکبّر اور حاسد ہوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں قابلِ احترام اور دوسروں کو بے وقعت ظاہر کریں۔

دوسرے وہ اشخاص جن کا کام ہی دوسروں کا مذاق اڑانا ہو اور جن کا مقصد لوگوں کو ہنسانا اور محظوظ کرنا ہو۔ اس قسم کے لوگ معاشرے کے سب سے زیادہ رذیل اور پست افراد ہوتے ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السّلام نے مسخروں کو مُبطِل کہا ہے۔ ایک دن ایک مسخرہ آپ کے کندھے سے چادر کھینچ کرلے بھاگا۔ امام علیہ السّلام خاموش رہے۔ آپ کے اصحاب اس شخص کے پیچھے گئے اور آپ کی چادر لے آئے۔

امامؑ نے پوچھا:

"وہ کون تھا؟"

لوگوں نے بتایا کہ وہ ایک مسخرہ ہے اور لوگوں کو ہنسایا کرتا ہے۔

آپ نے فرمایا:

"اس سے کہہ دو کہ اِنَّ لِلّٰہِ یَوْمًا یَخْسَرُ فِیْہِ الْمُبْطِلُوْنَ"

(اللہ تعالیٰ نے یومِ قیامت کے نام سے جس دن کو لوگوں کے اچھے اور بُرے کاموں کے حساب کتاب کے لیے معیّن کیا ہے اس دن بیہودہ سرا لوگ گھاٹے میں رہیں گے) [1]

جو لوگ مذاق اُڑانے والوں کے طور طریقوں اور اعمال پر توجّہ دیتے ہیں

---

[1] تفسیر سورۃ الحجرات - از مناقب ابن شہر آشوب - جلد دوم

اور جن کا مذاق اڑایا جائے ان پر ہنستے ہیں انھیں اس امر کی جانب توجہ دینی چاہیے کہ اس برُے کام کے گناہ میں وہ بھی شریک ہیں کیونکہ جب تک وہ نہ ہنسیں مذاق اڑانے والے نہ اپنا مسخرہ پن کا بازار گرم کر سکتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو آزار پہنچا سکتے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ بعض ان اسلامی احکام کا بے حد مختصر نمونہ تھا جن پر عمل پیرا ہونے سے افراد کے باہمی تعلقات خوشگوار اور سعادت بخش ہو سکتے ہیں اور ان کی روشنی میں معاشرے کو انسانی رنگ میں رنگا جا سکتا ہے۔

ایک ایسا نکتہ جس کی طرف بحث ختم کرتے ہوئے اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور فضیلت کے حصول کی خاطر اچھی صفات سے آراستہ ہوں۔ اخلاقی رذائل سے دوری اختیار کریں اور انسانیت کی خاطر نیکوکار، خیر خواہ اور مؤدب بنیں۔ یہ نہ ہو کہ مادی منفعت کے حصول اور دنیاوی فوائد کی دستیابی کے لیے نمائشی طور پر ان صفات کا اظہار کریں۔ جن لوگوں نے مکتبِ اسلام میں تربیت پائی ہے وہ کسی حالت میں بھی اپنی اس روش سے منحرف نہیں ہو سکتے جو اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہے اور زندگی کے نشیب و فراز ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے دوسرے مکاتب میں تربیت پائی ہے اگر ان کی زندگی میں کوئی اتار چڑھاؤ آئے تو ان کی روش بھی بدل جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس اخلاق اور تربیت کو عملدرآمد کی کفالت اور ضمانت حاصل نہ ہو وہ ہمیشہ قائم رہنے کے قابل نہیں ہوتا۔

جو لوگ معاشرے کی نیک بختی میں دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس امر کی کوشش کریں کہ افراد کو ان فرائض

سے آگاہ کریں جو اسلام نے ان کے لیے متعین فرمائے ہیں تاکہ اللہ کے فضل سے مسلمانوں کا معاشرہ ہر نقطۂ نظر سے دنیائے انسانیت کا سب سے بہتر اور برتر معاشرہ بن سکے۔

اِسلام میں آدابِ معاشرت

بنی نوعِ انسان کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ افراد کے باہمی تعلّقات خلوص اور صداقت پر مبنی ہوں۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی کپڑا اور مکان نہیں بلکہ افراد اور معاشروں میں دوستانہ تعلّقات کا مسئلہ ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک کے لیے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے ساتھ کیسے تعلقات رکھیں اور افراد کو بھی یہ مشکل لاحق ہے کہ وہ آپس میں کس طرح مل جُل کر رہیں۔

بدقسمتی سے 'پرامن بقائے باہمی' کا جملہ بھی اصلی دُکھ کا مداوا نہیں کرسکا اور مختلف لوگوں کی تقاریر اور مقالات کے علاوہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

ہر روز دنیا کے مختلف گوشوں میں جنگ کی آگ کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں اور افراد کا ایک گروہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور مختلف کنبوں کو پریشان اور بے سروسامان کردیتا ہے۔

جو چھوٹے موٹے اختلافات اور تنازعات ایک شہر یا ایک محلّے کے باشندوں اور بعض اوقات ایک خاندان کے افراد کے مابین رونما ہوتے ہیں وہ سب اسی مشکل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

حقیقت دراصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں کے باہمی تعلّقات ایمان اور روحانیّت کی بنیاد پر استوار نہیں ہوں گے یہ مُشکل، مشکل ہی رہے گی اور کوئی دوا اس درد کا درماں نہ کرسکے گی۔

اسلام کے آسمانی آیئن نے اس مشکل کے حل کے لیے افراد کی تربیّت پر توجہ دی ہے اور اس تربیّت کی بنیاد بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان اور نیکی اور انسانیّت کی رُوح کی تقویّت پر رکھی ہے۔

اس سلسلے میں اسلام کے احکامات اتنے دقیق اور عمیق ہیں کہ اگر لوگ ان پر عمل پیرا ہوں تو ان کی زندگیاں تابناک ہوجائیں اور ان کے میل جول اور ملاقاتوں پر انسانی رنگ چڑھ جائے۔

سب سے پہلے اسلام نے لوگوں کو اس حقیقت سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ سب ایک باپ اور ایک ماں کی اولاد ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیّت حاصل نہیں ہے۔ سفید، سیاہ، زرد یا سُرخ نسل اور بالعموم بدن کی جلد یا چہرے کا رنگ ایک قوم کی دوسری قوم پر برتری کا موجب نہیں بن سکتا۔ نہ ہی زبانوں اور بولیوں کا اختلاف ایک ملّت کو دوسری ملّت سے ممتاز کرسکتا ہے۔

مقنّنِ اسلام کی نظر میں وہ واحد چیز جو کسی فرد یا معاشرے کی برتری کا سبب بن سکتی ہے ایمان، تقویٰ اور علم و دانش سے مزیّن ہونا ہے۔

قرآنِ مجید صاف لفظوں میں فرماتا ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور

تمھیں قومیں اور قبیلے قرار دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ رُتبے والا وہ ہے جو زیادہ متّقی ہو۔" [1]

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے:

"اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو باایمان ہیں اور علم و دانش رکھتے ہیں اُونچے درجوں پر فائز کرتا ہے۔" [2]

رسولِ اکرم ؐ نے فرمایا ہے:

لَا فَخْرَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔

"کسی عرب کو غیر عرب پر (اور کسی نسل کو دوسری نسل پر) بجُز تقویٰ کے کوئی افتخار حاصل نہیں ہے۔"

جب ابنائے آدم اس حقیقت کو سمجھ لیں گے تو بہت سے ایسے اختلافات اور امتیازات جو خود ان کی احمقانہ خودغرضیوں اور خودپسندیوں کی پیداوار ہیں ختم ہو جائیں گے اور ان کے تعلّقات ایک بالکل نئی شکل اختیار کریں گے۔

یہ بات عالمی اور بین الاقوامی سطح پر بالکل صحیح ہے اور خاندانوں کے دائرے میں بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے معاندانہ تعلّقات اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات ختم ہو سکتے ہیں۔

اس بحث میں جو چیز موردِ توجّہ ہے وہ مسلمان خاندانوں اور افراد کو اسلام کی معاشرتی تعلیمات سے آشنا کرنا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر وہ آپس کے میل جول سے بیش از بیش فوائد حاصل کریں اور ان کے مابین اچھے تعلّقات قائم ہوں۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں سے میل جول رکھنا چاہتے ہیں

---

[1] سورۃ الحجرات۔ آیت ۱۳ [2] سورۃ المجادلہ آیت ۱۱

لیکن آداب معاشرت سے نابلد ہونے کی بنا پر مجبوراً الگ تھلگ رہتے ہیں اور معاشرے میں اپنے لیے کوئی مقام حاصل نہیں کر پاتے۔

یہ موضوع بجائے خود بہت اہم ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں لوگوں کے ساتھ کس طرح یگانگت اور دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں۔ ہم سوسائٹی میں ایسے افراد کو جانتے ہیں جو بے حد ہر دل عزیز ہوتے ہیں اور جہاں کہیں بھی جاتے ہیں لوگ ان سے محبّت اور دلی تعلّق کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم ایسے لوگوں کو بھی جانتے ہیں جن کی جانب کوئی توجّہ نہیں دیتا اور عوام کو ان سے کوئی اُنس نہیں ہوتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے اور بعض ویسے کیوں ہیں ؟ شاید اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں کہ افراد کی خلقت اور ذات مختلف ہوتی ہیں اور یہ موضوع ایک شخص کی ذات سے تعلّق رکھتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر محبّت اور توجّہ کے قابل ہو یا نہ ہو۔

لیکن ماہرینِ نفسیات اس جواب کو درست نہیں سمجھتے ان کا کہنا ہے کہ اشخاص کے اخلاق، طور طریقے اور صفات ان کی محبوبیّت یا عدم محبوبیّت کا سبب ہوتی ہیں۔

یہ خود اشخاص کا فرض ہے کہ وہ صحیح طور طریقے اپنائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ میل جول میں اپنی ذمّے داریاں پوری کریں تاکہ لوگوں کی دوستی اور محبّت سے بہرہ مند ہوں۔

۱۔ لوگوں کی شخصیّت کا احترام

آدابِ معاشرت کا ایک اہم نکتہ جس کی جانب اسلامی احکام میں توجّہ دلائی گئی ہے اور جس پر اسلام کے گرامی قدر رہنماؤں نے بڑی سختی سے عمل کیا لوگوں کی شخصیّت کا احترام ہے۔

لوگوں کے احترام کے سلسلے میں رسولِ اکرمؐ مختلف امور کے معمولی سے معمولی پہلوؤں کی جانب بھی توجّہ دیتے تھے اور چھوٹی سے چھوٹی ذمّے داری سے بھی پہلوتہی نہیں فرماتے تھے۔

کَانَ (ص) یُکْرِمُ مَنْ یَدْخُلُ عَلَیْهِ حَتّٰی رُبَّمَا بَسَطَ ثَوْبَهٗ یُؤْثِرُ الدَّاخِلَ بِالْوِسَادَةِ الَّتِیْ تَحْتَهٗ [1]

"جب کوئی شخص رسولِ اکرمؐ کے پاس آتا تو آپ اس کا احترام کرتے اور اکثر فرش کے طور پر اپنی عبا اُس کے پاؤں کے نیچے بچھا دیتے اور جس سرہانے پر ٹیک لگائے ہوتے وہ اُسے دے دیتے۔"

ایک دن رسولِ اکرمؐ مسجد میں تنہا تشریف فرما تھے۔ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور آپ کی جانب آیا۔ حضورؐ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ذرا پیچھے ہٹ گئے اور وہ جگہ اس کے لیے خالی کر دی۔ اس شخص نے عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! مسجد خالی ہے اور جگہ وسیع ہے۔ پھر آپ ایک قدم پیچھے کیوں چلے گئے؟"

آپ نے فرمایا:

"مسلمان کے مسلمان پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب وہ اس کے پاس آکر بیٹھے تو وہ خود ایک قدم پیچھے ہٹ جائے اور اس کے محترم ہونے کا اعتراف کرے۔" [2]

اگر کچھ لوگ حضورؐ کے پاس بیٹھے ہوتے تو آپ سب کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی محبّت آمیز نگاہِ کرم سب حاضرین پر مساوی طور پر ڈالتے تھے۔ [3]

جب رسولِ اکرمؐ کسی مجلس میں تشریف لاتے تو جہاں خالی جگہ دیکھتے وہیں

---

[1]، [2] بحار الانوار - جلد ۶ [3] روضۂ کافی

بیٹھ جاتے اور بلند اور نچلی جگہ کی کوئی پروا نہ کرتے۔

جب آپ مسجد میں یا کسی اور مقام پر اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تو مجلس کو ایک دائرے کی شکل دے دی جاتی تاکہ بنیادی طور پر بلند یا نچلے مقام کا کوئی سوال ہی نہ رہے۔

اگر کوئی اجنبی شخص آنحضرتؐ کی مجلس میں وارد ہوتا تو وہ آپ کو پہچان نہ پاتا کیونکہ آپ دوسروں کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ مجبوراً نووارد کو پوچھنا پڑتا کہ آپ میں سے رسولِؐ خدا کون ہیں؟

گول میز، جس سے دَورِ حاضر کی بڑی بڑی شخصیّتیں استفادہ کرتی ہیں خاتم النّبیّینؐ کی مجالس کی ہی نقل ہے۔ فرق یہ ہے کہ آجکل گول میز کا مقصد اس مقصد کی عین ضد ہے جو رسولِ اکرمؐ اپنی مجالس کی تشکیل سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آنحضرتؐ اپنی مجالس کی تشکیل دائرے کی صورت میں اس لیے کرتے تھے کہ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ میں اور دوسروں میں کوئی فرق نظر آئے یا کوئی شخص آپ کے مقابلے میں نچلے مقام پر بیٹھے۔ اس کے برعکس آج کل گول میز کے استعمال کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجلس کے شرکاء میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں نچلی سطح پر بیٹھے اور کوئی دوسرا شخص اس سے ممتاز نظر آئے۔

رسولِ اکرمؐ اپنی پوری قوّت سے طبقاتی، نسلی اور ایسے ہی دوسرے امتیازات کو مٹانے کے لیے کوشاں رہے۔ آپ کوشش فرماتے تھے کہ اس غلط نظریے کو جو لوگوں نے ایک دوسرے پر برتری جتانے کے لیے وضع کر رکھا ہے ملیامیٹ کر دیں اور فضیلت و برتری کی بنیاد روحانیّت اور عالی انسانی صفات پر رکھیں۔

رسولِ اکرمؐ دوسروں کی شخصیّت کا جو احترام کرتے تھے اس نے سب کو آپ پر فریفتہ کر دیا تھا۔ ہر طبقے کے لوگ آپ کی والہانہ محبّت سے بہرہ مند ہوتے تھے اور

کوئی بھی آپ کی جانب سے تحقیر اور بے اعتنائی کا مورد قرار نہیں پاتا تھا۔

حضورؐ خود واضح الفاظ میں فرمایا کرتے تھے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

"میں اللہ کی جانب سے مبعوث کیا گیا ہوں تاکہ لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کو حدِّ کمال تک پہنچا دوں۔"

امام علی علیہ السّلام اپنی حکومت کے زمانے میں کوفہ سے باہر ایک غیر مسلم کے ہم سفر ہو گئے۔ وہ شخص آپ کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے آپ سے پوچھا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

امام نے جواب دیا:

"کوفہ۔"

بالآخر وہ ایک دوراہے پر پہنچے۔ ذمّی شخص اپنی راہ پر ہو لیا لیکن خلافِ توقّع اس نے دیکھا کہ آپ اس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ اس نے پوچھا:

"کیا آپ کوفہ نہیں جا رہے؟"

حضرت نے فرمایا:

"جا رہا ہوں۔"

وہ کہنے لگا: "کوفہ کا راستہ وہ ہے۔"

آپ نے فرمایا:

"میں جانتا ہوں۔"

اس نے پوچھا: "پھر آپ نے اپنا راستہ کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا:

"مصاحبت اور رفاقت کے بطور احسن انجام پذیر ہونے کے لیے

ضروری ہے کہ انسان اپنے ہم سفر سے جُدا ہوتے وقت چند قدم اس کے ساتھ ساتھ جائے اور یہ وہ دستور ہے جو ہمارے جلیل القدر پیغمبر صؐ نے ہمیں سکھایا ہے۔"

اس پُرخلوص تکریم اور احترام کا ذمّی مرد پر بڑا گہرا اثر ہوا اور اس نے پوچھا:

"کیا آپ کے پیغمبر صؐ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟"

آپ نے فرمایا: "ہاں"

اس شخص نے کہا: "جن لوگوں نے پیغمبرِ اسلام کی پیروی اختیار کی اور آپ کے نقشِ قدم پر چلے وہ آپ کی انہی اخلاقی تعلیمات اور کریمانہ سلوک پر فریفتہ ہوئے ہیں۔"

بعد میں اُس نے اپنا راستہ ترک کر دیا اور امام علیؑ کے ساتھ کوفہ روانہ ہو گیا۔ دریں اثنا اس نے اسلام کے بارے میں آپ سے گفتگو کی اور بالآخر مسلمان ہو گیا۔ [1]

آدابِ معاشرت میں دوسروں کی شخصیّت کا احترام اس قدر اہمیّت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں رسولِ اکرمؐ سے فرماتا ہے:

"اے نبی (ص)! میرے بندوں سے کہہ دو کہ لوگوں کو کچھ کہنے یا ان سے گفتگو کرنے میں، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلّق رکھتے ہوں اچھے طریقے سے بات کرو اور بُری باتیں کرنے سے پرہیز کرو۔" [2]

امام محمد الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

عَظِّمُوا اَصْحَابَكُمْ وَوَقِّرُوهُمْ وَلَا يَتَهَجَّمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ [3]

---

[1] بحار الانوار - جلد ۴۷ - قرب الاسناد صفحہ ۷ - اصول کافی - جلد ۲

[2] سورۃ بنی اسرائیل - آیت ۵۳ [3] بحار الانوار - جلد ۴۷

"اپنے دوستوں کا احترام کرو اور انھیں بزرگ سمجھو اور ادب کے برخلاف ایک دوسرے پر معترض نہ ہو۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

لَا تُحَقِّرَنَّ اَحَدًا مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَاِنَّ صَغِيْرَهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ كَبِيْرٌ [1]

"مسلمانوں میں سے کسی کی تحقیر نہ کرو اور اسے چھوٹا نہ سمجھو کیونکہ مسلمان خواہ کتنا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اللہ کے نزدیک بڑا ہے۔"

بعض لوگ کہنے کو اپنے دوستوں سے دوستانہ سلوک کرتے ہیں اور دوستی کے بہانے ایک دوسرے کے ادب اور احترام کے فریضے کو نظرانداز کر دیتے ہیں، حالانکہ یہی غلط روش دوستیوں کو متزلزل کر دیتی ہے اور دوستوں کو ایک دوسرے سے بددل کر دیتی ہے۔

لَا تُضَيِّعَنَّ حَقَّ اَخِيْكَ اِتِّكَالًا عَلٰى مَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ فَاِنَّهٗ لَيْسَ لَكَ بِاَخٍ مَنْ ضَيَّعْتَ حَقَّهٗ [2]

"اس دوستی کے مراتب کی خاطر جو تمھارے مابین قائم ہے اپنے دوست کا حق کبھی بھی ضائع نہ کرو کیونکہ تم جس شخص کا حق ضائع کرو گے پھر وہ تمھارا دوست نہیں رہے گا۔"

بعض نادان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ دو اشخاص کے درمیان دوستی بڑھانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے فحش باتیں کہیں اور کسی چبھتے ہوئے مذاق سے دریغ نہ کریں۔ وہ اس ناپسندیدہ رویّے کو نزدیک ترین دوستانہ تعلّقات تصوّر کرتے ہیں حالانکہ دوستوں کی تضحیک اور انھیں حقیر سمجھنا کسی طرح بھی قابلِ ستائش

---

[1]، [2] بحارالانوار۔ جلد ۷۴

نہیں ہے اور ان ناپسندیدہ افعال کو دو دوستوں کی نزدیکی کی دلیل ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا۔

ارسطو کہتا ہے:

"دوستی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ دوست ایک دوسرے کی فضیلت اور قدر و قیمت کو پہچانیں اور انھیں احترام کی نظر سے دیکھیں۔"

دو دوست اگر ایک دوسرے کی خوبیوں اور قدر و قیمت کو نہ پہچانیں اور ایک دوسرے کا احترام نہ کریں تو پھر وہ کیسے خلوص کا دم بھر سکتے ہیں اور کیونکر دوستی کے قابل ہو سکتے ہیں؟

ادب انسان کے لیے زیاں کا موجب نہیں ہوتا بلکہ اسے بے شمار فائدے پہنچاتا ہے۔ جو مقاصد مال و دولت کے ذریعے دستیاب نہ ہوں وہ ادب کی بدولت حاصل ہو جاتے ہیں۔

ایک شخص جس کا نام زہری تھا غمگین اور پژمُردہ چہرے کے ساتھ امام زین العابدینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

امام علیہ السّلام نے اس کی افسردگی کی وجہ پوچھی تو اس نے عرض کیا:

"فرزندِ رسولؐ! غم و اندوہ نے مجھے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ایک طرف تو حاسد لوگ ہیں جو مجھے آرام و آسائش میں نہیں دیکھ سکتے اور اپنی حرکتوں سے مجھے پریشان کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف میرے دشمن اور بدخواہ ہیں جو میرے غم و اندوہ کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جن کی میں نے خدمت کی ہے اور جن سے مجھے دوستی کی امّید تھی لیکن وہ میرے درپۓ آزار ہیں۔"

امام علیہ السّلام نے فرمایا:

"اے زہری! اپنی زبان پر قابو رکھو اور جو کچھ مُنہ میں آئے کہتے نہ چلے جاؤ تاکہ تم اپنے دوستوں کو نہ کھو دو اور انھیں اپنا دشمن نہ بنا لو۔"

اس نے کہا:

"یا ابن رسولؐ اللہ! میں جو کچھ کہتا ہوں اس سے ان کی خدمت کرتا ہوں اور ان پر احسان کرتا ہوں۔"

امامؑ نے فرمایا:

"ایسا نہیں ہے۔ ایسی بات کرنے سے پرہیز کرو جسے قبول کرنے کے لیے لوگوں کے ذہن آمادہ نہ ہوں۔"

ازاں بعد آپ نے فرمایا:

"اے زہری! جس شخص کی عقل کامل نہ ہو وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ذریعے بھی ہلاکت سے دوچار ہو جاتا ہے۔"

پھر امام علیہ السّلام نے زہری کو ایک بنیادی حکم دیا اور فرمایا کہ اس پر عمل کرنے سے لوگوں کا رویّہ تمھیں افسردہ اور غمگین نہیں کرے گا۔

آپ نے فرمایا:

"اے زہری! اس میں کیا حرج ہے اگر تم تمام مسلمانوں کو اپنے اہلِ خاندان اور اعزّہ و اقارب سمجھو۔ بوڑھوں کو باپ، چھوٹوں کو فرزند اور ہم عمروں کو اپنا بھائی تصوّر کرو۔ جب تم اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لو گے تو پھر کس پر ظلم کرنے کو تیّار ہو گے؟ کس پر نفرین کرنے پر تیّار ہو گے؟ کیا تم اس بات پر آمادہ ہو گے کہ ان میں سے کسی کی بے آبروئی ہو؟۔

اے زہری! اگر تمھارے دل میں خیال آئے کہ میں فلاں شخص سے بہتر ہوں تو اپنے آپ کو یوں سمجھو۔ اگر وہ عمر میں تم سے بڑا ہے تو اپنے

آپ سے کہو وہ اسلام اور ایمان کے معاملے میں مجھ پر سبقت رکھتا ہے اور اس نے مجھ سے زیادہ نیک کام انجام دیے ہیں اور اگر وہ عمر میں تم سے چھوٹا ہے تو اپنے آپ سے کہو کہ اس نے مجھ سے تھوڑے گناہ کیے ہیں اور اگر وہ تمھارا ہم عمر ہے تو اپنے آپ سے کہو کہ مجھے اپنے گناہوں کے بارے میں تو یقین ہے لیکن اس کے گناہوں کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔

اگر لوگ تمھارا احترام اور عزّت کریں تو کہو کہ یہ خود لوگوں کی کریم النفسی ہے اور اگر وہ تم سے بے مہری سے پیش آئیں اور زیادتی کریں تو اپنے دل کو سمجھا لو کہ یہ کسی لغزش کی وجہ سے ہے جس کا میں مرتکب ہوا ہوں۔ اگر تم یہ روش اپنا لو تو تمھاری زندگی خوشگوار ہو جائے گی اور بہت سے لوگ تمھارے دوست بن جائیں گے اور تمھارے دشمنوں کی تعداد میں کمی ہو جائے گی۔

یہ نکتہ بھی مت بھولو کہ لوگ اس شخص کا احترام زیادہ کرتے ہیں جس سے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچے اور جو ان سے کسی چیز کا خواستگار نہ ہو۔"

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی بنا پر اسلام کے نقطۂ نظر سے اجتماعی زندگی میں کامیابی کا اہم ترین ذریعہ لوگوں کی شخصیّت کا احترام اور سب کے بارے میں مراتبِ ادب کی ادائیگی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اور ہم نے بطور نمونہ ان میں سے تھوڑی سی نقل کر دی ہیں۔

۲۔ لوگوں سے مہربانی کا برتاؤ

اسلام کے معاشرتی احکام میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں سے نرمی اور مہربانی

سے پیش آیا جائے۔ قرآنِ مجید، رسولِ اکرمؐ کے اخلاق کے بارے میں فرماتا ہے:

"یہ اللہ کی رحمت اور عنایت کی وجہ سے تھا کہ تم لوگوں کے بارے میں مشفق اور مہربان ہو گئے اور اگر تم ایک تند، ترش رو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمھارے ارد گرد سے منتشر ہو جاتے۔"[1]

اس آیۂ شریفہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ لوگوں کے آنحضرتؐ کی جانب مائل ہونے کی ایک وجہ آپ کی مہربانی اور نرم دلی تھی اور بلاشبہ جس شخص میں بھی یہ صفت ہو لوگوں کے دل اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

لوگ تند مزاج اور سخت گیر اشخاص سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے افراد الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

عموماً لوگوں کے میل جول، آمد و رفت اور ملاقاتوں کے دوران ان سے لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں یا وہ کوئی ایسا کام کر بیٹھتے ہیں جو انسانی خواہشات کے خلاف ہو۔ ان صورتوں میں انسان کو چاہیے کہ چشم پوشی اور درگزر سے کام لے اور غصّے اور تند مزاجی سے پرہیز کرے۔

سُئِلَ اَبُوْعَبْدِاللهِ (ع)، مَاحَدُّ حُسْنِ الْخُلُقِ؟ قَالَ: تُلَیِّنُ جَنَاحَكَ وَتُطِیْبُ كَلَامَكَ وَتَلْقیٰ اَخَاكَ بِبِشْرٍ حَسَنٍ[2]

امام الصّادق علیہ السّلام سے دریافت کیا گیا:

"حُسنِ خُلق کی حدیں کون سی ہیں؟" آپ نے فرمایا: "نرمی برتنا اور مہربانی کرنا، اچھی اور پاکیزہ باتیں کرنا اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا۔"

---

[1] سورۃ آلِ عمران۔ آیت ۱۵۹ [2] بحار الانوار۔ جلد ۷۴

امام علی علیہ السّلام نے اپنے فرزند امام حسن ؑ کے نام وصیّت میں فرمایا:

اِجْعَلْ نَفْسَكَ مِنْ اَخِيْكَ عِنْدَ صَرْمِهٖ عَلَى الصِّلَةِ وَعِنْدَ صُدُوْدِهٖ عَلَى اللُّطْفِ وَالْمُقَارَبَةِ وَعِنْدَ جُمُوْدِهٖ عَلَى الْبَذْلِ وَعِنْدَ تَبَاعُدِهٖ عَلَى الدُّنُوِّ وَعِنْدَ شِدَّتِهٖ عَلَى اللِّيْنِ وَعِنْدَ جُرْمِهٖ عَلَى الْعُذْرِ [1]

"اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرو کہ دوستوں کی بے وفائی اور قطع تعلّق کے مقابلے میں وفادار رہو اور ان کے ساتھ اپنے تعلّق کی حفاظت کرو اور ان کی سرد مہری، خشک مزاجی اور دُوری کے جواب میں کشادہ دل اور ملنسار رہو اور ان کے قریب ہو جاؤ اور ان کی خُشونت اور تُند مزاجی کے مقابلے میں نرمی اور ملائمت اختیار کرو۔ اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہو تو ان کا عذر قبول کر لو اور ایسا رویّہ اختیار کرو کہ گویا وہ تم پر اختیار رکھتے ہیں لیکن خیال رکھّو کہ یہ روش تمھیں خود اپنے بارے میں اپنانی چاہیئے اور فقط ان لوگوں کے بارے میں انجام دینی چاہیئے جو اس کے قابل ہوں۔"

بہت جلد غصّے میں آجانا اور لوگوں پر اپنے غیظ و غضب کی چنگاریاں برسانا انسان کی معاشرتی زندگی کی ناکامی اور اس کے دوستوں کے قطع تعلّق کا موجب بنتی ہے۔

یہ درست ہے کہ سرکش جبلّت کے زیرِ اثر انسان چاہتا ہے کہ دوسروں کو ان کی غلط کاریوں اور لغزشوں کی سزا دے لیکن عقل کہتی ہے کہ یہ روش غلط ہے

---

[1] نہج البلاغہ

اور اس سے توقع کے مطابق نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

سخت گیری اور تُند خوئی سے دوسروں کی تنبیہ اور اصلاح ممکن نہیں اور اگر اس کام کے کرنے کا کوئی طریقہ ہے تو وہی ہے جو قرآنِ کریم نے پیش فرمایا ہے اور جس کی سفارش اسلام کے پیشواؤں نے بھی کی ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے نرمی اور مہربانی کا سلوک کیا جائے اور اچھی باتوں اور محبت آمیز سلوک سے ان کی رہنمائی کی جائے۔

قرآنِ مجید، حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو فرعون کی ہدایت کے لیے روانگی کے سلسلے میں حکم دیتا ہے کہ:

"فرعون سے نرمی اور ملائمت سے بات کرو۔ ممکن ہے وہ تمھاری نرم باتوں سے متاثر ہو کر نصیحت قبول کر لے یا عذابِ الٰہی سے ڈر جائے۔" [1]

ڈیل کارنیگی کہتا ہے:

"اگر آپ کو طیش آجائے اور آپ غضب آلود الفاظ اپنی زبان پر لے آئیں تو چونکہ آپ اپنے دل کا غبار نکال لیتے ہیں اس لیے راحت محسوس کرتے ہیں لیکن دوسرے فریق کا کیا حال ہوتا ہے؟ کیا وہ بھی اس لذت سے بہرہ ور ہوتا ہے جو آپ محسوس کر رہے ہیں؟ کیا آپ کی منتقمانہ آواز اور دشمنی کا انداز اُس کے لیے معاملے کو اتنا سادہ بنا سکتا ہے کہ وہ آپ سے متفق ہو جائے؟"

امریکی صدر وڈرو ولسن کہتا ہے:

"اگر آپ مجھے مُکّا دکھائیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بھی اس سے قوی تر مُکّا آپ کو دکھاؤں گا لیکن اگر آپ میرے پاس آئیں

---

[1] سورۃ طٰہٰ۔ آیت ۴۴

اور کہیں کہ آؤ ہم باہم مل بیٹھیں اور مشورہ کریں کہ اگر ہمارے مابین کوئی اختلاف ہو تو اس بات کا کھوج لگائیں کہ یہ اختلافِ نظر کیوں پیدا ہوا ہے اور درحقیقت اختلاف کی وجوہات کیا ہیں تو ہمیں بہت جلد پتا چل جائے گا کہ ہمارا آپس میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں اور جن چیزوں کے بارے میں اختلاف ہے وہ بہت ہی معمولی ہیں اور اکثر باتوں میں ہم ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ فقط حوصلے، خلوص، دل کی صفائی اور متفق ہونے کی خواہش سے ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ آپس میں متفق ہو جائیں۔"

ایک شخص امام السجادؑ کی مجلس میں اُس وقت آیا جب مختلف طبقات کے اور لوگ بھی آپ کی خدمت میں موجود تھے۔ چونکہ اُس شخص کے دل میں آپ کے لیے کدورت تھی اس لیے اس نے آپ کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور بے ادبانہ الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔

اس کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد امام علیہ السلام نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا:

"تم لوگوں نے دیکھا کہ اس شخص نے ہمارے ساتھ کتنی سختی کی ہے اور کیا کیا باتیں کہی ہیں؟ اب ہم چاہتے ہیں کہ تمھارے ہمراہ اس کے پاس جائیں اور اس کی باتوں کا جواب دیں۔"

سب نے اس کام میں شرکت پر آمادگی کا اظہار کیا۔

امام علیہ السلام روانہ ہوئے اور آپ کے اصحاب بھی ساتھ ہو لیے۔ سبھی کا یہ خیال تھا کہ آپ بڑی سختی اور خشونت سے اُسے موردِ عتاب ٹھہرائیں گے لیکن ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ آہستہ آہستہ اس آیۂ شریفہ کی تلاوت فرما رہے ہیں:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ [1]

"(باتقویٰ افراد وہ لوگ ہیں جو) اپنے غصّے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی اور درگزر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

لوگ سمجھ گئے کہ امام علیہ السّلام انتقام کا ارادہ نہیں رکھتے۔ جب اس شخص کے مکان پر پہنچے تو اسے آواز دی۔ جب اسے پتا چلا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو اسے یقین ہوگیا کہ آپ اُسے سزا دینے آئے ہیں چنانچہ اس نے بھی اپنے آپ کو ہر صورتِ حال کے لیے تیّار کر لیا اور گھر سے باہر نکلا لیکن خلافِ توقع اس نے دیکھا کہ امام علیہ السّلام کا چہرہ شگفتہ اور کھلا ہوا ہے۔

امام علیہ السّلام نے اس سے فرمایا:

"تھوڑی دیر پہلے تم میرے پاس آئے تھے اور کچھ باتیں کہی تھیں۔ اب میں تمھارے پاس آیا ہوں تاکہ تمھیں کہوں کہ اگر تمھاری باتیں درست تھیں اور جو برائیاں تم نے مجھ سے منسوب کی ہیں وہ واقعی مجھ میں موجود ہیں تو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے اور میری برائیاں معاف کر دے اور اگر تم نے جھوٹ کہا تھا اور مجھ سے غلط باتیں منسوب کی تھیں تو میں اللہ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ تمھیں بخش دے اور تمھارے گناہ سے درگزر فرمائے۔"

اس شخص نے اپنے آپ کو امام علیہ السّلام کی اس کریمانہ روش کے مقابلے میں بے بس پایا اور کہا:

---

[1] سورۃ آلِ عمران: آیت ۱۳۴

"یابن رسول اللہ! جن برائیوں کا میں نے ذکر کیا تھا ان میں سے کوئی بھی آپ میں نہیں ہے بلکہ میں ان کا حامل ہونے کا زیادہ سزاوار ہوں۔"

یوں امام علیہ السّلام نے ایک ایسے شخص کو جو آپ کے مخالفین میں سے تھا اپنے دوستوں میں شامل کر لیا اور اپنے اصحاب اور رفقاء کو عملاً یہ درس دیا کہ ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ خود دار ہو اور لوگوں کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرے۔[1]

یہ درس کتابِ معاشرت کے ابواب میں سے ایک اہم ترین باب ہے جس کی جانب اسلامی تعلیمات میں بہت توجّہ دی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کے پیروؤں کو چاہیئے کہ اس پسندیدہ روش کی عادت ڈالیں تاکہ اس کے عظیم اور بیش قیمت فوائد سے بہرہ مند ہو سکیں۔

۳۔ تواضع اور فروتنی

آدابِ معاشرت کا ایک پہلو جو اچھے نتائج برآمد کرتا ہے اور معاشرے میں انسان کی ہر دلعزیزی کا موجب بنتا ہے وہ تواضع اور فروتنی ہے۔

فروتنی نہ صرف یہ کہ افراد کی حیثیّت کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ ان کے رتبے کی بلندی کا موجب بنتی ہے جو چیز انسان کو لوگوں کی نظروں میں قابلِ نفرت بناتی ہے وہ تکبّر اور خود بینی ہے کیونکہ یہ صفت انسان کو دوسروں کی جانب سے عزت اور احترام سے محروم کر دیتی ہے اور دلوں میں دشمنی کا بیج بو دیتی ہے۔

قرآنِ مجید متواضع لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اللہ کے نیک بندے روئے زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ راستہ چلتے ہیں اور جب نادانوں سے ناروا باتیں سنتے ہیں تو وہ ناجائز

---

[1] ارشادِ مفید۔ جلد دوم

کلام نہیں کرتے اور نادانوں کی روِش نہیں اپناتے بلکہ کہتے ہیں کہ "تم سلامت رہو"۔ [1]

رسولِ اکرمؐ اور آپ کے خانوادۂ عصمت کی روِش اسی بنیاد پر استوار تھی۔ وہ کمزور اور نادار طبقے کے لوگوں سے مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھتے تھے اور ان سے برادرانہ سلوک کرتے تھے۔

رسولِ اکرمؐ لوگوں کے تکبّر اور خود غرضیوں کا بڑی شدّومد سے مقابلہ کرتے تھے اور جب بھی حالات اس امر کے مقتضی ہوتے انھیں تواضع اور فروتنی کا سبق دیتے تھے۔

ایک دن جب آنحضرتؐ اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے اور صحابۂ کرام ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے ایک مسلمان جو نادار تھا اور پھٹا پرانا لباس پہنے ہوئے تھا وارد ہوا اور اسلامی طریقے کے مطابق (یعنی جو شخص خواہ اس کی حیثیّت کچھ بھی ہو جب کسی مجلس میں آئے تو جہاں جگہ خالی دیکھے بیٹھ جائے اور اس خیال سے کوئی خاص جگہ تلاش نہ کرے کہ میرا رتبہ اس کا تقاضا کرتا ہے) اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک جگہ خالی دیکھ کر وہاں بیٹھ گیا۔ اتّفاقاً یہ جگہ ایک امیر آدمی کے پہلو میں تھی۔ امیر آدمی نے اپنا لباس سمیٹا اور اپنی جگہ سے کھسک کر اس نادار شخص سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس غریب آدمی کے اس کے پاس آ بیٹھنے سے اُسے کوفت ہوئی ہے۔

رسولِ اکرمؐ اس امیر آدمی کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ فرما رہے تھے۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"کیا تمھیں یہ خوف ہوا ہے کہ اس شخص کی ناداری سے کوئی چیز تمھارے چپک جائے گی؟"

---

[1] سورۃ الفرقان - آیت ۶۳

اس نے عرض کیا: "نہیں۔ یارسول اللہ"
پھر آپ نے فرمایا:
"کیا تمھیں یہ خوف ہوا کہ تمھاری دولت سے کوئی چیز اُسے منتقل ہو جائے گی؟"
اس نے جواب دیا: "نہیں۔ یارسول اللہ"
پھر آپ نے فرمایا:
"کیا تمھیں خوف پیدا ہوا کہ تمھارا لباس اس سے چھُو کر گندہ ہو جائے گا؟"
اس نے جواب دیا: "نہیں۔ یارسول اللہ"
اس پر آپ نے فرمایا:
"پھر تم نے کیوں اپنے آپ کو سمیٹا اور اس سے دُور جا بیٹھے؟"
اس شخص نے عرض کیا: "یارسول اللہ! میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اب اس غلطی کی تلافی اور اس گناہ کے کفّارے کے طور پر میں اپنے اس مسلمان بھائی کو اپنی آدھی دولت دینے کو تیّار ہوں"
نادار شخص نے جب اس کی بات سُنی تو کہا:
"یارسول اللہ! میں اس دولت کو قبول کرنے کے لیے تیّار نہیں ہوں"
حاضرین نے متعجّب ہو کر پوچھا: "کیوں؟"
اس نے کہا:
"مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں بھی غرور اور خود پسندی میں گرفتار نہ ہو جاؤں اور کسی دن اپنے کسی مسلمان بھائی سے ایسا ہی سلوک نہ کروں جیسا اس شخص نے آج میرے ساتھ کیا ہے" [1]

---

[1] اصول کافی - جلد دوّم

افلاطون کہتا ہے:

"بہترین چیز جو دوستی کا موجب ہے مناسب حد تک تواضع اور فروتنی ہے"

علمائے اسلام وضاحت کرتے ہیں کہ:

"غرور اور نخوت دوستی کے لیے ایک بڑی آفت ہے۔ جس شخص کا سر پُرغرور اور رفتار نخوت آمیز ہو اس کے دوست اس سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں اور کوئی اس کی دوستی کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ فروتن اور متواضع لوگ اپنی روش سے دوستوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں لیکن اس کے برعکس ایک خود پسند شخص کسی کا دوست نہیں بن سکتا کیونکہ لوگ دوسروں کی خودپسندی اور نخوت برداشت نہیں کر پاتے"

مُحدّث قُمّیؒ قدس سرہٗ کہتے ہیں:

"لوگوں کی خود بینی اور خود پسندی مندرجہ ذیل صورتوں میں بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ متکبّر اور خود پسند شخص ہمیشہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور دوسروں کو چھوٹا تصوّر کرتا ہے اور انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ کسی کام میں بھی لوگوں کے برابر نہیں ہونا چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ راہ چلتے ہوئے دوسروں سے آگے رہے اور مجلسوں اور محفلوں میں دوسروں سے بلند تر مقام پر بیٹھے۔ وہ توقع رکھتا ہے کہ دوسرے اسے سلام کریں۔ اگر کوئی شخص اسے نصیحت کرے تو وہ خفا ہوجاتا ہے اور اگر وہ کسی کو نصیحت کرے تو اسے اذیّت دیتا ہے۔ اگر دوسرے اس کی بات نہ مانیں تو غضبناک ہوجاتا ہے۔ اگر وہ پڑھائے تو شاگردوں کی تحقیر اور توہین کرتا ہے، ان پر احسان جتاتا

ہے اور انھیں اپنا نوکر سمجھتا ہے۔" [1]

اب آپ غور فرمائیں کہ جس شخص کے طور طریقے ایسے ہوں کیا وہ معاشرے میں دوست پیدا کر سکتا ہے اور کیا لوگ فی الحقیقت ایسے شخص کی پروا کر سکتے ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خود خواہی اور تکبّر کے خلاف جنگ کی ہے اور قرآنِ مجید صاف صاف لفظوں ارشاد فرماتا ہے:

اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ [2]

چھٹے امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

جہنّم میں ایک بے حد تکلیف دہ مقام ہے جو متکبّروں کے لیے مخصوص ہے۔" [3]

قرآنِ مجید لقمان حکیم کی حکمت آمیز باتوں کو جو انھوں نے اپنے بیٹے کو بطورِ نصیحت کہیں نقل کرتا ہے اور اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے:

"ہرگز تکبّر اور نازکی وجہ سے لوگوں سے منہ نہ پھیر اور غرور اور تکبّر کے ساتھ زمین پر نہ چل کیونکہ اللہ متکبّر اور خود ستائی کرنے والے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔" [4]

امام الصّادق علیہ السّلام احساسِ کمتری کو تکبّر اور خود پسندی کا نفسیاتی مبدا گردانتے ہیں اور فرماتے ہیں:

مَا مِنْ اَحَدٍ یَتِیْهُ اِلَّا مِنْ ذِلَّةٍ یَجِدُهَا فِیْ نَفْسِهٖ [5]

"کوئی شخص تکبّر کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوتا بجز اُس پستی کی وجہ سے جس کا احساس وہ اپنے دل میں کرتا ہے۔"

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۵۹ [2] سورۃ الزُمَر۔ آیت ۶۰ [3] الکافی

[4] سورۃ لقمان۔ آیت ۱۸ [5] الکافی۔ جلد ۳

دقیق علمی چھان بین اور متکبر لوگوں کے حالات کے مطالعے کے بعد موجودہ دور کے ماہرینِ نفسیات بھی اس نظریے کی تائید کرتے ہیں اور تکبر کا منبع احساسِ کمتری کو گردانتے ہیں۔ 'مک برائڈ' کہتا ہے:

"ایک فرد یا ایک قوم کے اپنے آپ کو برتر خیال کرنے کے معنی دوسرے افراد اور دوسری اقوام کو ذلیل کرنے اور پست سمجھنے کے ہیں۔ آجکل کی نفرتیں، دشمنیاں اور کشمکشیں بھی عموماً اسی احساسِ کمتری کی پیداوار ہیں۔ اس طرزِ فکر کی بیخ و بُن درحقیقت احساسِ حقارت کی ایک قسم کی جھوٹی تلافی ہے ورنہ کوئی نیک اور شریف انسان خود اپنے اور دوسرے طبقوں اور نسلوں کے مابین کسی قسم کے امتیاز اور اختلاف کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی روشنی میں تواضع اور فروتنی کا معاشرت سے بنیادی تعلق ہے اور جیسا کہ بطور نمونہ ذکر کیا گیا ہے اسلامی تعلیمات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ ہر قسم کی خود پسندی سے دامن بچاتے ہوئے اپنے آپ کو تواضع کے زیور سے آراستہ کریں تاکہ کامیاب اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے نزدیک محبوب ٹھہریں۔ یقیناً

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
دل میں وہ فروتنی کو جا دیتا ہے
(انیس)

۴۔ ایفائے عہد

انسان کو فطرتاً اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے جو وعدے دوسروں

سے کیے ہوں انھیں پُورا کرے اور جس چیز کا عہد کیا ہو اس پر عمل کرے اور چونکہ اس مسئلے کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اس لیے ہر دین اور مذہب کا پیرو وعدہ وفائی کا فطری شعور رکھتا ہے اور وعدہ خلافی اور پیمان شکنی کو بُرا اور ناپسندیدہ گردانتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں وعدے کی پابندی بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس طرح انسان دوسروں کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ معاشرے کی نیک بختی کا ایک رکن ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے اور ترقّی اور کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔

ہر معاہدہ جو دو اشخاص کے مابین طے پائے اخلاقاً گرانقدر اور قابلِ احترام ہے خواہ اس کی کوئی قانونی اور رسمی ضمانت نہ ہو اور اس کا موضوع بھی معمولی اور بے اہمّیت ہو۔

قرآنِ مجید ایفائے عہد کو ایمان کی شرائط کا ایک حصّہ اور اہل ایمان کی ایک صفت قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"بلاشبہ باایمان لوگ رستگار، نجات یافتہ اور سعادت مند ہیں جو نمازمیں اپنے تمام وجود کے ساتھ خشوع وخضوع کرتے ہیں اور وہ جو لغو اور بےہودہ روش اور گفتار سے پرہیز کرتے ہیں..... اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کو وفا کرتے ہیں۔"[1]

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا [2]

"نیکوکار لوگ جب کسی سے عہد و پیمان کرتے ہیں تو اُسے وفا

---

[1] سورۃ المؤمنون - آیات ۳ و ۸ [2] سورۃ البقرۃ ۱۷۷

کرتے ہیں"۔

رسولِ اکرمؐ کے ارشادات میں سے ہے کہ:

مَنْ عَامَلَ النَّاسَ فَلَمْ يَظْلِمْهُمْ وَحَدَّثَهُمْ فَلَمْ يَكْذِبْهُمْ وَوَعَدَهُمْ فَلَمْ يُخْلِفْهُمْ فَهُوَ مِمَّنْ كَمُلَتْ مُرُوَّتُهُ وَظَهَرَتْ عَدَالَتُهُ وَوَجَبَتْ اُخُوَّتُهُ [1]

"جو شخص معاشرت اور لین دین میں لوگوں پر ظلم نہ کرے، اپنی گفتگو میں جھوٹ نہ بولے اور اپنے وعدوں اور معاہدوں پر قائم رہے وہ جوانمردی اور عدالت کے کمال پر ہے اور ضروری ہے کہ انسان اس کے ساتھ دوستی اور برادری کی بنیاد ڈالے اور محبّت آمیز تعلقات قائم کرے"۔

امام محمّد الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

ثَلَاثٌ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِاَحَدٍ فِيْهِنَّ رُخْصَةً اَدَاءُ الْاَمَانَةِ اِلَى الْبِرِّ وَالْفَاجِرِ وَالْوَفَاءُ بِالْعَهْدِ لِلْبِرِّ وَالْفَاجِرِ وَبِرُّ الْوَالِدَيْنِ بَرَّيْنِ كَانَا اَوْ فَاجِرَيْنِ [2]

"تین چیزیں ہیں (جو ہر مسلمان کے حتمی اور قطعی وظائف میں سے ہیں اور) اللہ تعالیٰ نے ان کی خلاف ورزی کی اجازت کسی کو نہیں دی۔ اوّل امانت کی ادائیگی خواہ مالِ امانت کا مالک نیکوکار ہو یا گنہگار ہو۔ دوّم ایفائے عہد خواہ وہ اچھے شخص سے ہو یا برے شخص سے اور سوّم ماں باپ کے حق میں نیکی خواہ وہ نیکوکار ہوں

---

[1] خصال۔ جلد ۱۔ بحار الانوار۔ جلد ۷۵ [2] الکافی۔ جلد ۲۔ خصال۔ جلد ۱

یا نہ ہوں ؟"

جیسے ایفائے عہد معاشرے میں اعتماد کی حس کو بیدار کرتا ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نظم وضبط قائم کرتا ہے اسی طرح عہد وپیمان سے بے اعتنائی قنوطیت اور بے نظمی کا سبب بنتی ہے اور بعض اوقات اس کی وجہ سے کام بگڑ جاتے ہیں۔

جو شخص ایمان اور نیکی کے راستے سے ہٹ جائے، اپنا عہد توڑ دے اور اپنے کیے ہوئے وعدوں کی کوئی پروا نہ کرے وہ اپنے اس ناپسندیدہ فعل سے دوسروں کے دلوں میں عناد اور دشمنی کے بیج بو دیتا ہے۔

عہد شکنی معاشرے کے انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا ایک بہت بڑا سبب ہے اور اگر یہ کسی قوم میں رواج پا جائے تو اس قوم کو زوال اور بدبختی کی جانب لے جاتی ہے۔

بدقسمتی سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اپنے وعدوں پر عمل نہیں کرتے بلکہ عہد شکنی اور فریب کاری کو ہوشیاری اور ترقی کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور ایک ہنر قرار دیتے ہیں جبکہ ان کا طرزِ عمل کسی اخلاقی اور انسانی اصل سے مطابقت نہیں رکھتا اور وہ بلاشبہ معاشرے کے غدّار ہیں۔

مسلمانوں کے باہمی میل جول کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا یہ ایک بہت ہی مختصر نمونہ تھا اور بلاشبہ ان میں سے ہر ایک حکم افراد کے مابین پُرخلوص دوستی اور تعلّقات کے قیام کے سلسلے میں ناقابلِ تردید اثر کا حامل ہے۔

اب بحث کے خاتمے پر ہم قارئینِ گرامی کی توجّہ لوگوں کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کے طرزِ سلوک کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم، ان بزرگ پیشوا کے حقیقی پیرو بن سکیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ ہر شخص کی دعوت قبول فرما لیتے تھے اور اُس میں اِس بات کی

کوئی تخصیص نہ تھی کہ دعوت دینے والا آزاد ہے یا غلام، دولت مند ہے یا نادار وغیرہ۔

جب بھی کوئی حاجت مند آنحضرتؐ کے پاس آتا آپ اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس کی حاجت برآری کی کوشش فرماتے۔ جو شخص عذر خواہ ہوتا اس کا عذر قبول کر لیتے۔ دوسروں کے بُرے کاموں کا بدلہ نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی غلطیوں سے چشم پوشی فرماتے تھے۔ جس سے بھی ملاقات ہوتی اسے پہلے سلام کہتے۔ دشمن جو ناخوشگوار سلوک آپ سے کرتے اس پر صبر فرماتے۔

بغیر کسی تکبّر کا اظہار کیے زمین پر بیٹھ جاتے۔ بوقتِ ضرورت اپنا جوتا اور لباس خود مرمّت کر لیتے۔ کسی کی بدلحاظی نہ کرتے۔ بیماروں کے گھر خواہ دور بھی ہوتے آپ جا کر ان کی عیادت فرماتے۔ نادار لوگوں کے ساتھ ایک مجلس میں ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھاتے اور ان سے مہربانی کا برتاؤ کرتے۔

خوراک اور لباس کے معاملے میں اپنے لیے کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔

مسلمانوں سے مصافحہ کرتے تھے اور بڑی گرمجوشی سے ان کا ہاتھ دباتے تھے۔

آنحضرتؐ کے نزدیک محبوب ترین شخص وہ تھا جو لوگوں کی زیادہ مدد کرے اور ان کی بہتری کی کوشش کرے۔ جس مجلس میں آپ تشریف فرما ہوتے وہ حلم، حیا، صبر اور امانت کی محفل ہوتی تھی۔ آنحضرتؐ کے حضور میں معمّر اشخاص محترم اور نوعمر لوگ پیار کے مورد قرار پاتے تھے۔ آپ لوگوں سے ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔

آپ سخت گیر نہ تھے اور کسی کے خلاف دل میں کینہ نہ رکھتے تھے۔ چلّا کر نہیں بولتے تھے۔ کبھی بھی کسی کے خلاف حتّیٰ کہ کافروں اور بت پرستوں کے خلاف بھی خراب اور ناروا بات زبان پر نہیں لاتے تھے۔ اگر آپ کے اصحاب غیر حاضر ہوتے تو

ان کی خیریت کے بارے میں پوچھتے تھے۔ کبھی بھی کسی کے سامنے پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ اللہ کے سب بندوں پر مہربان تھے۔ صلۂ رحمی فرماتے تھے اور اپنے خویش و اقارب سے محبت کرتے تھے۔ وعدے کی سب لوگوں سے زیادہ پابندی کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص آپ سے گفتگو کرتا تو اس کی بات بڑے غور سے سنتے تھے اور صرف سننے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہوتے تھے۔

حضرت خاتم الانبیاءؐ کے جو اخلاق اور کردار محدثین اور مورخین اسلام نے نقل کیے ہیں ان کے یہ چند نمونے تھے۔ امید ہے کہ عام مسلمان آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق پیدا کریں گے اور دورِ حاضر میں ساری دنیا کو اخلاق اور انسانیت کا عملی درس دیں گے۔

اسلام میں
بھائی چارہ اور غمخواری

انسانی روابط میں ایک مضبوط رشتہ بھائیوں کا رشتہ ہے۔ بھائی آپس میں محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں، غم اور خوشی میں بھی اپنے آپ کو ایک دوسرے کا شریک سمجھتے ہیں۔

ممکن ہے کبھی کبھار بھائیوں کے مابین بھی اختلاف ہو جائے اور پریشانیاں لاحق ہوں لیکن جلد ہی خُلوص اور محبت ان کدورتوں کی جگہ لے لیتی ہے۔

اسلام نے معاشرے کے نظام کے استحکام اور لوگوں کے تعلقات بہتر بنانے کے لیے اس مضبوط رشتے سے استفادہ فرمایا ہے اور تمام مسلمان اور با ایمان افراد کو بمنزلہ سگے بھائیوں کے قرار دیا ہے۔

جس طرح دو بھائی اپنے باپ کے واسطے سے ایک دوسرے سے تعلق اور رابطہ رکھتے ہیں اسی طرح اسلام نے رسولِ اکرمؐ کو امّت کا باپ اور مسلمانوں کو آپ کے فرزند اور یوں تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔

اس حکم میں یعنی اخوّت اور اسلامی برادری کے سلسلے میں کسی حد یا انتہا کا وجود نہیں اور تمام مسلمان خواہ وہ کسی نسل سے ہوں، دنیا کے کسی خطے میں رہائش پذیر ہوں اور کوئی زبان بولتے ہوں اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں اور اسلام کی نظر میں ایک دوسرے کے بھائی تصوّر ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید کھُلے الفاظ میں اس بھائی چارے کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"بلا شبہ باایمان لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں کے درمیان (اگر اختلاف پیدا ہو جائے تو) صلح صفائی کرادو اور متّقی بنو تاکہ اللہ تعالیٰ کی عنایتوں اور رحمتوں کے سزاوار ہو جاؤ" [1]

جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے طلوعِ اسلام سے پہلے لوگوں میں بہت سی دشمنیاں اور اختلافات موجود تھے۔ اسلام کی نجات بخش تعلیمات کی بدولت لوگوں میں بھائی چارے کی روح پھونکی گئی اور اسلامی اخوّت وجود میں آئی۔

قرآنِ مجید نے اس موضوع کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

"تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور متفرّق نہ ہو جاؤ اور ان نعمتوں کو یاد کرو جو اللہ نے تمھیں دی ہیں یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تمھارے دلوں میں الفت اور محبّت ڈال دی اور اللہ کی مہربانی ہی کا نتیجہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے اور اس زمانے میں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے تم آگ اور بدبختی کے دہانے پر کھڑے تھے اور اللہ نے تمھاری رہنمائی دینِ حق کی جانب کی اور اس عمیق ڈھلوان سے نجات دی" [2]

---

[1] سورۃ الحجرات ۔ آیت ۱۰ [2] سورۃ آلِ عمران ۔ آیت ۱۰۳

اسلام کی تعلیمات میں دینی بھائیوں کے لیے حقوق مقرّر کیے گئے ہیں اور تمام مسلمانوں کو ان کی ادائیگی کی تلقین کی گئی ہے۔

امام السجاد علیہ السّلام فرماتے ہیں:

وَاَمَّا حَقُّ مِلَّتِكَ عَامَّةً فَاِضْمَارُ السَّلَامَةِ وَنَشْرُ جَنَاحِ الرَّحْمَةِ وَالرِّفْقُ بِمُسِيْئِهِمْ وَتَاَلُّفُهُمْ وَاسْتِصْلَاحُهُمْ وَشُكْرُ مُحْسِنِهِمْ...... فَعَمِّهِمْ جَمِيْعًا بِدَعْوَتِكَ وَانْصُرْهُمْ جَمِيْعًا بِنُصْرَتِكَ وَاَنْزِلْهُمْ جَمِيْعًا مِنْكَ مَنَازِلَهُمْ كَبِيْرَهُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ وَصَغِيْرَهُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَلَدِ وَاَوْسَطَهُمْ بِمَنْزِلَةِ الْاَخِ فَمَنْ اَتَاكَ تَعَاهَدْتَهُ بِلُطْفٍ وَرَحْمَةٍ وَصِلْ اَخَاكَ بِمَا يَجِبُ لِلْاَخِ عَلٰى اَخِيْهِ[1]

"تمھارے دینی بھائیوں کا حق یہ ہے کہ تم ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے ان کی سلامتی طلب کرو۔ ان کے حق میں ہمیشہ مہربان رہو، جو اُن میں بُرے ہوں ان سے نرمی برتو، ان کی دلجوئی کرو اور ان کی اصلاح کی کوشش کرو۔ جو اُن میں نیک ہوں ان کے سپاس گزار رہو۔ لازم ہے کہ تم اپنے دینی بھائیوں کے لیے دعا کرو اور ان سے محبّت رکھّو اور ہر ایک کا اس کے حال کے مطابق خیال رکھّو۔ معمّر لوگوں کو بمنزلہ باپ، چھوٹوں کو بمنزلہ فرزند اور اپنے ہم عمروں کو بھائیوں کی طرح سمجھو تمھارا جو دینی بھائی تم سے ملنے آئے اس کا استقبال مہر و محبّت سے کرو اور اپنے دینی بھائیوں سے ایسا سلوک کرو جیسا کہ ایک بھائی

---

[1] بحار الانوار ۔ جلد ۷۴، صفحہ ۲۱ ، تحف العقول ۔ صفحہ ۲۷۰

اپنے بھائی سے کرتا ہے۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ وَهُوَ عَيْنُهٗ وَمِرْاٰتُهٗ وَدَلِيْلُهٗ لَا يَخُوْنُهٗ وَلَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يَخْدَعُهٗ وَلَا يَكْذِبُهٗ وَلَا يَغْتَابُهٗ [1]

"مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور بمنزلہ اس کی آنکھ کے ہے (اس کی خوبیاں اور برائیاں اسے دکھاتا ہے) وہ اس کے لیے ایک آئینے کی مانند ہے (اس کی برائیوں اور اچھائیوں کی نشاندہی کرتا ہے) اس کا رہنما ہے۔ مسلمان شخص ہرگز اپنے بھائی کی خیانت نہیں کرتا، اس پر ظلم روا نہیں رکھتا، اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے دھوکے اور فریب دہی سے کام نہیں لیتا، اُس سے جھوٹی بات نہیں کہتا اور اس کی عیب جوئی اور غیبت کو جائز نہیں سمجھتا۔"

مسلمان جو حقوق ایک دوسرے پر رکھتے ہیں ان کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

يَغْفِرُ زَلَّتَهٗ وَيَرْحَمُ عَبْرَتَهٗ وَيَسْتُرُ عَوْرَتَهٗ وَيُقِيْلُ عَثْرَتَهٗ وَيَقْبَلُ مَعْذِرَتَهٗ وَيَرُدُّ غِيْبَتَهٗ وَيُدِيْمُ نَصِيْحَتَهٗ وَيَحْفَظُ خُلَّتَهٗ.... [2]

"مسلمان کو چاہیئے کہ اپنے دینی بھائی کی لغزشوں سے چشم پوشی اور درگزر کرے، وہ پریشان ہو تو اس پر رحم کرے، اس کے راز پوشیدہ رکھے، اس کی غلطیوں کو نظر انداز کرے، اس کا عذر قبول کرلے، بدگو

---

[1] الکافی - جلد ۲ - صفحہ ۱۶۶ [2] بحار الانوار - کتاب العشرہ

اور عیب جُو اشخاص کے مقابلے میں اس کا دفاع کرے، اسے ہمیشہ نصیحت کرے، اس کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلّقات کی حفاظت کرے۔ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے، اس کی دعوت قبول کرے، اس کا ہدیہ قبول کرے، جو کچھ وہ عطا کرے اس کے مقابلے میں اس کا بدلہ دے، اس کی محبّت کے لیے شکر گزار ہو، اس سے اچھے انداز میں باتیں کرے، اس کے دوستوں سے محبّت رکھے، حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے تنہا نہ چھوڑے، جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہ اس کے لیے بھی پسند کرے اور جو کچھ اپنے لیے ناپسند کرے وہ اس کے لیے بھی ناپسند کرے۔"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

أَحِبَّ لِأَخِيكَ الْمُسْلِمِ مَا تُحِبُّهُ لِنَفْسِكَ وَإِذَا احْتَجْتَ فَسَلْهُ إِنْ سَأَلَكَ فَأَعْطِهِ لَا تَمَلَّهُ خَيْرًا وَلَا يَمَلُّهُ لَكَ، كُنْ لَهُ ظَهْرًا فَإِنَّهُ لَكَ ظَهْرٌ، إِذَا غَابَ فَاحْفَظْهُ فِي غَيْبَتِهِ فَإِذَا شَهِدَ فَزُرْهُ وَأَجِلَّهُ وَأَكْرِمْهُ فَإِنَّهُ مِنْكَ وَأَنْتَ مِنْهُ ...... (الکافی - جلد سوم - صفحہ ۲۶۳)

"اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو، تمھیں کسی چیز کی ضرورت پڑے تو اس سے مانگ لو، اور اگر اسے کسی چیز کی ضرورت پڑے تو اسے دینے سے انکار نہ کرو، اس کی خدمت کرنے اور اس پر احسان کرنے سے پہلوتہی اور اظہارِ ملال نہ کرو تاکہ وہ بھی تم سے نیکی کرنے میں پہلوتہی نہ کرے، اس کے مددگار بنو تاکہ وہ بھی تمھارا مددگار رہے، جب وہ موجود نہ ہو تو اس

کی آبرو کی حفاظت کرو، جب وہ سفر سے واپس آئے تو اُسے ملنے جاؤ، اس کی عزّت کرو، تم اس سے ہو اور وہ تم سے ہے، اگر وہ تم سے سختی سے پیش آئے تو اس سے قطع تعلّق نہ کرو بلکہ معذرت کرو، اگر اُسے کوئی فائدہ پہنچے تو اللہ کا شکر ادا کرو، اگر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو اس کی مدد کے لیے دوڑو، اگر دشمن اس سے فریب کاری کریں اور اس کے راستے میں جال بچھائیں تو اس کی مدد کرو، اور اس کے مصیبت میں گرفتار ہونے کا سدِّباب کرو۔"

اوپر جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے دینی بھائیوں کے ان حقوق کا نمونہ ہیں جن کے بارے میں اسلامی تعلیمات میں حکم دیا گیا ہے۔

ان عام احکامات کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے گرامی قدر پیشواؤں نے مسلمانوں کے ایک دوسرے کے بارے میں تمام وظائف میں سے ہر ایک کی جانب الگ الگ ابواب میں خُصوصی توجّہ دی ہے اور ان وظائف میں سے ہر ایک کے بارے میں تاکیدی احکامات دیے گئے ہیں۔

مواسات

مواسات کا مطلب دینی بھائیوں کی مدد کرنا اور انھیں مالی اعانت مہیّا کرنا ہے۔

دینی روایات میں اس اہم موضوع کو جو محروم طبقوں کی زندگی کی بہتری اور مسلمانوں کے مابین مہر و محبّت کے قیام کا موجب ہے بہت زیادہ اہمیّت دی گئی ہے اور اسے ہر مسلمان اور مومن کی لازمی صفت اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

امام الصادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

تَقَرَّبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی بِمُوَاسَاۃِ اِخْوَانِکُمْ [1]

"اپنے دینی بھائیوں کی اعانت اور مواسات کرکے اپنے آپ کو بارگاہِ خداوندی میں مقرّب بناؤ۔"

رسولِ اکرمؐ نے امیر المومنین امام علیؑ کے نام اپنی وصیّتوں کے ضمن میں فرمایا:

سَیِّدُ الْاَعْمَالِ ثَلَاثُ خِصَالٍ: اِنْصَافُکَ النَّاسَ مِنْ نَفْسِکَ، وَ مُوَاسَاۃُ الْاَخِ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ، وَ ذِکْرُکَ اللّٰہَ تَعَالٰی عَلٰی کُلِّ حَالٍ [2]

"تین چیزیں بہترین کام ہیں: اوّل یہ کہ تم تمام لوگوں کے ساتھ منصفانہ اور عادلانہ سلوک کرو، دوّم اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ مواسات برتتے ہوئے ان کی مالی امداد کرو اور سوّم تمام حالات میں تمھارا دل اللہ کی یاد میں مصروف رہے۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

مُوَاسَاۃُ الْاَخِ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ تَزِیْدُ فِی الرِّزْقِ [3]

"اللہ کی راہ میں دینی بھائیوں سے ہمدردی کرنا، ان کی مدد کرنا انسان کی روزی میں افزائش کا موجب ہے۔"

واقدی جو مامون کے زمانے کے عظیم دانشمندوں میں سے گزرا ہے کہتا ہے:

"میرے دو دوست تھے جن میں سے ایک ہاشمی تھا اور ہم تینوں کی دوستی اتنی پُرخلوص تھی کہ درحقیقت ہم ایک روح تین قالب تھے۔

---

[1] خصال صدوق۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۸ [2] بحار الانوار۔ جلد ۷۴۔ صفحہ ۳۹۲

[3] خصال۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۹۴

ایک دفعہ عید کے موقع پر میں مالی مشکلات سے دوچار ہوگیا۔ میری بیوی نے مجھ سے کہا: میں اور تم تو یہ سب سختیاں اور تکلیفیں برداشت کر سکتے ہیں لیکن ان بچوں کی وجہ سے میرا دل دُکھتا ہے کیونکہ یہ دوسرے بچوں کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے عید کے لیے نئے نئے لباس بنوائے ہیں جب کہ ان کے لباس پھٹے پرانے ہیں۔ اگر ہو سکے تو کوئی انتظام کرو اور رقم مہیا کرو تاکہ میں بچوں کے لیے لباس تیار کر سکوں۔ میں سوچ میں پڑ گیا لیکن کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر کار میں نے اپنے ہاشمی دوست کو خط لکھا اور اس سے درخواست کی کہ جہاں تک ہو سکے میری مدد کرے۔

میرے دوست نے ایک سربمہر تھیلی مجھے بھیج دی اور کہلا بھیجا کہ اس میں ہزار درہم موجود ہیں۔

ابھی میں نے تھیلی کھولی بھی نہ تھی کہ میرے دوسرے دوست کا بھیجا ہوا ایک آدمی آپہنچا اور اس نے بتایا کہ میرے دوست کے پاس کچھ نہیں اور اس نے مدد کی درخواست کی ہے۔ میں نے وہی سربمہر تھیلی اسے بھیج دی اور خود پریشان دل کے ساتھ مسجد میں چلا آیا اپنی بیوی سے شرم محسوس کرتے ہوئے رات میں نے مسجد میں ہی گزاری لیکن صبح جب گھر گیا تو خلافِ توقع وہ بڑی خندہ پیشانی سے میرے سامنے آئی اور جو احسان میں نے اپنے دوست پر کیا تھا اس پر بڑی مسرت اور خوشنودی کا اظہار کیا۔

دریں اثنا میرا ہاشمی دوست میرے گھر آپہنچا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا: مجھے سچ سچ بتاؤ کہ رقم کی جو تھیلی میں نے کل تمھیں بھیجی تھی

اس کا تم نے کیا کیا؟ اس پر میں نے اُسے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اس نے لحظہ بھر کے لیے سر جھکا لیا اور پھر کہنے لگا: کل جب تم نے پیغام بھیجا اور مجھ سے مدد کی درخواست کی تو اس وقت میرے پاس اس تھیلی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ تو میں نے تمھیں بھیج دی لیکن اپنے ضروری اخراجات کے لیے اپنے تیسرے دوست کو لکھا اور مدد مانگی۔ اس نے وہی میری والی سربمہر تھیلی مجھے بھیج دی۔ میں حیران تھا کہ ماجرا کیا ہے اور اب تم نے اس کی وضاحت کی ہے۔

واقدی کہتا ہے:

نو سو درہم ہم تینوں نے آپس میں تقسیم کر لیے اور جو سو درہم بچے وہ میری بیوی کو دے دیے گئے۔

یہ عجیب قصہ مامون نے بھی سُنا۔ اس نے مجھے بلا بھیجا اور حقیقتِ حال پوچھی۔ میں نے جو واقعہ گزرا تھا سچ سچ بیان کر دیا۔ مامون نے حکم دیا کہ ہم تینوں دوستوں میں سے ہر ایک کو دو ہزار دینار اور میری بیوی کو ایک ہزار دینار بطور انعام دیے جائیں۔"[1]

جو داستان آپ نے پڑھی وہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو مکتبِ قرآن کے تربیت یافتہ چند مسلمانوں کو پیش آیا۔ اسلامی تعلیمات کی بدولت وہ اعلیٰ اخلاق اور عظیم کردار کے مالک بن گئے اور مواسات اور بھائی چارے کی روح ان کے دل و دماغ میں رچ بس گئی۔ جب ہم صدرِ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس زمانے کے لوگوں میں اس روح کو انتہائی بلندیوں پر پاتے ہیں۔

جنگ اُحد میں جو اسلامی تاریخ کی سخت ترین جنگوں میں سے تھی مسلمانوں نے

---

[1] مُروجُ الذہب از مسعودی

بہت بڑی قربانیاں دیں۔ بہت سے مسلمانوں نے بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور کئی ایک زخمی اور نیم جان ہو کر زمین پر گر گئے۔ ان میں سے سات مسلمان ایک دوسرے کے پاس زخمی پڑے تھے اور زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ سبھی زخموں سے چور چور اور پیاس سے بے تاب تھے۔ جو شخص مجاہدین کو پانی پلانے پر مامور تھا وہ ان کے پاس پانی لے کر پہنچا لیکن پانی کی مقدار صرف ایک شخص کے لیے کافی تھی۔

وہ ان سات افراد میں سے ایک کے سرہانے آیا اور اُسے پانی پینے کو کہا۔ اس نے جواب میں کہا کہ یہ پانی میرے قریب پڑے ہوئے میرے بھائی کو پلا دو۔

اب وہ دوسرے کے پاس آیا۔ اس نے بھی پانی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ پانی میرے دوسرے بھائی کو پلا دو حتّیٰ کہ وہ چھٹے مجاہد کے پاس پہنچا لیکن اس نے بھی وہی جواب دیا۔ جب ساتویں کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ یہ پانی تم اس شخص کے پاس لے جاؤ جس کے پاس سب سے پہلے گئے تھے کیونکہ اُسے باقی سب سے زیادہ پیاس لگی ہے۔

جب وہ پانی لے کر واپس پہلے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ پھر وہ دوسرے اور تیسرے کے پاس آیا لیکن وہ بھی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکے تھے۔ القصّہ ساتوں کے ساتوں مجاہدین نے تشنہ لبی کے عالم میں دنیا سے کُوچ کیا اور یوں دوسروں کو مواسات اور ایثار کا عملی درس دے گئے۔[1]

یہ اس درس کا نمونہ تھا جو انھوں نے اسلام کے جلیل القدر پیغمبرؐ کے مکتب میں سیکھا تھا اور جس پر وہ زندگی کے تمام ادوار میں حتّیٰ کہ سخت ترین حالات میں بھی عمل پیرا رہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ جلد نہم۔ صفحہ ۲۶۰

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ باوجودیکہ ہم ایسا نجات بخش آیئن اور ایسی نورانی تعلیمات رکھتے ہیں ہماری حالت یہ ہے کہ بھائی چارے اور مواسات کی رُوح رفتہ رفتہ ہم میں سے ناپید ہو رہی ہے اور اس کی جگہ خود غرضی اور بے مہری لے رہی ہے جو کہ مغرب کی سوغات ہے۔ تاہم یہ نکتہ ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ یہ وضع اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی اور مسلمان کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اپنے دینی بھائیوں کی مشکلات اور پریشانیوں سے بے نیاز رہے اور بے اعتنائی برتے اور اس کی حیثیت محض ایک بے تعلق تماشائی کی سی ہو۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

مَنْ اَصْبَحَ لَا یَهْتَمُّ بِاُمُوْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَلَیْسَ بِمُسْلِمٍ[1]

"جو شخص اپنے دن کا آغاز کرے اور مسلمانوں کے امور کی اصلاح کا کوئی اہتمام نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

خِیَارُکُمْ سُمَحَاؤُکُمْ وَشِرَارُکُمْ بُخَلَاؤُکُمْ وَمِنْ صَالِحِ الْاَعْمَالِ الْبِرُّ بِالْاِخْوَانِ وَالسَّعْیُ فِیْ حَوَائِجِهِمْ وَفِیْ ذٰلِکَ مَرْغَمَةٌ لِلشَّیْطَانِ وَتَزَحْزُحٌ عَنِ النِّیْرَانِ وَدُخُوْلُ الْجِنَانِ[2]

"تم مسلمانوں میں بہترین افراد وہ ہیں جو سخی اور بخشنے والے ہوں اور بدترین افراد وہ ہیں جو بخیل اور تنگ نظر ہوں، صالح اعمال اور پسندیدہ کاموں میں سے ایک کام دینی بھائیوں کے حق میں نیکی اور ان کی حاجت برآری کی کوشش ہے اور یہ کام شیطان کو عاجز کر دیتا ہے اور اس کا

---

[1] الکافی - جلد ۲ - صفحہ ۱۶۴
[2] مجالس مفید - صفحہ ۱۷۹ - امالی طوسی - جلد اوّل

انجام دینے والا دوزخ سے دُور اور بہشت کے نزدیک ہوجاتا ہے۔"

ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بھوک کی شکایت کی۔آنحضرتؐ نے فوراً ایک شخص کو اپنے گھر بھیجا تاکہ اس شخص کے لیے کھانا لے کر آئے۔ آنحضرتؐ کی زوجہ نے اظہارِ تاسف کرتے ہوئے کہا کہ گھر میں کھانا موجود نہیں ہے۔ جب آپ کو اپنے گھر کی جانب سے مایوسی ہوئی تو آپ صحابۂ کرام سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

"تم میں سے کون ایسا ہے جو آج رات اس مہمان کو قبول کرے؟"

امام علی علیہ السّلام نے عرض کیا:

"یارسولؐ اللہ! میں اس کام کی ذمّے داری لیتا ہوں۔"

پھر آپ نے اس شخص کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے گھر لے گئے۔ اپنی زوجۂ گرامی حضرت فاطمہ زہرا علیہا السّلام سے دریافت کیا: گھر میں کتنا کھانا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا: "تھوڑا سا، جو فقط بچّوں کے لیے کافی ہے۔"

امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

"ہمیں چاہیئے کہ اپنے مہمان کو خود اپنے آپ اور بچّوں پر مقدّم رکھیں۔"

اس فیصلے پر عملدرآمد کی خاطر حضرت فاطمہؑ نے بچّوں کو سلا دیا اور امام علیؑ نے جو کھانا موجود تھا وہ لے جاکر مہمان کے آگے رکھ دیا اور چراغ کو ٹھیک کرنے کے بہانے اسے بجھا دیا۔

اس حالت میں کہ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا آپ نے مہمان کو کھانا کھانے کو کہا اور خود بھی دسترخوان کے پاس بیٹھ گئے اور کچھ کھائے بغیر مہمان کو یہ احساس دلایا کہ آپ خود بھی کھانے میں شریک ہیں۔

اس رات امام علیؑ اور حضرت فاطمہؑ نے اللہ کی خاطر مہمان کو کھانا کھلایا جس کے نتیجے میں وہ خود بھی بھوکے رہے اور اپنے پیارے بچّوں کو بھی بغیر کچھ کھلائے

پلائے سُلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے اس ایثار اور کریم النفسی کی تعریف فرمائی:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ [1]

"اپنے دینی بھائیوں کو اپنے آپ پر مقدّم رکھتے ہیں اگرچہ وہ خود دُکھ اور تکلیف میں ہی ہوں۔" [2]

ظاہر ہے کہ اس روش کو اپنانا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں اور شاہِ مرداں جیسا جوانمرد ہی اس قسم کی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

اسلام نے بھی اپنے پیرووں سے اس قسم کی روش کا تقاضا بطور ایک وظیفے کے نہیں کیا بلکہ جس چیز کو ایک حتمی اور ناقابلِ اجتناب وظیفہ قرار دیا ہے وہ بھائی چارہ اور مواسات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کے دینی بھائی پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہوں تو ان کی مدد کرے، اپنی دولت کا کچھ حصّہ محتاجوں اور ناداروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے مخصوص کر دے، جو مسلمان بیمار ہوں ان کی عیادت کرے، ان سے ہمدردی کا اظہار کرے اور ان کی دلجوئی کرے، جہاں تک ممکن ہو یتیم اور لاوارث بچّوں کی سرپرستی کرے اور رفاہِ عامّہ کے لیے تیار کی جانے والی عمارات کی تعمیر میں شرکت کرے وغیرہ۔

ایک یونانی کافی عرصے تک امام علی علیہ السّلام سے ملتا رہا اور اسلام کے بارے میں مطالعہ اور تحقیق کرتا رہا۔ جب اس کے مطالعات ختم ہو گئے اور اسلام کی حقانیّت اس پر واضح ہو گئی تو اس نے آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔ امام علیؑ نے اُسے اُس کی آئندہ ذمّے داریوں کے بارے میں جو ہدایات دیں ان کے ضمن میں فرمایا:

اٰمُرُكَ اَنْ تُوَاسِيَ اِخْوَانَكَ الْمُطَابِقِيْنَ لَكَ عَلٰى

---

[1] سورۃ الحشر۔ آیت ۹ [2] تفسیرِ صافی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۶۸۴

تَصْدِيْقِ مُحَمَّدٍ (ص) وَتَصْدِيْقِيْ [1]

"یعنی میں تجھے وصیّت کرتا ہوں کہ اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ جو پیغمبرِ اسلام ص کے اور میرے پیرو ہوں مواسات کرنا اور اس دولت کے ذریعے جو اللہ نے تجھے دی ہو ان کی مدد کرنا، ان کی ضرورتیں پوری کرنا، ان کی تکلیفیں رفع کرنا اور ان کے ساتھ دوستی اور محبّت کا برتاؤ کرنا۔"

امام علی الرّضا علیہ السّلام نے دینی بھائیوں کے حقوق کے بارے میں فرمایا ہے:

اِنَّ مِنْ حَقِّ الْمُؤْمِنِ عَلَى الْمُؤْمِنِ الْمَوَدَّةُ لَهُ فِيْ صَدْرِهٖ وَالْمُوَاسَاةُ لَهُ فِيْ مَالِهٖ وَالنُّصْرَةُ لَهُ عَلٰى مَنْ ظَلَمَهُ...... وَلَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَغُشُّهُ وَلَا يَخُوْنُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَغْتَابُهُ وَلَا يَكْذِبُهُ.... [2]

"جو حقوق ہر مومن اپنے دینی بھائی پر رکھتا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں کہ اُسے دل سے عزیز رکھّے اور اسے مالی امداد دے کر مواسات کرے اور اگر کوئی اس پر ظلم کرے تو اس کا ساتھ دے ..... ایک باایمان شخص ہرگز اپنے دینی بھائی پر ظلم نہیں کرتا، اسے فریب نہیں دیتا، اس کی خیانت نہیں کرتا، اس کی غیبت روا نہیں رکھتا اور اس سے جھوٹی بات نہیں کہتا......"

جو شخص اپنے دینی بھائی کو لباس دے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اسے بہشتی لباس دے گا اور جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر اپنے دینی بھائی کو قرض دے اللہ کی بارگاہ سے اسے صدقے کا ثواب ملے گا اور جو شخص اپنے دینی بھائی کا غم و اندوہ دور کرے اللہ تعالیٰ اس کے آخرت کے غموں میں سے ایک غم زائل فرما دے گا۔

---

[1] احتجاج طبرسی ۔ صفحہ ۱۱۴ [2] بحار الانوار ۔ جلد ۷۴ ۔ صفحہ ۲۳۳

صفوان جمال کہتا ہے:

"میں امام الصّادق علیہ السّلام کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ دریں اثنا مکّہ کا رہنے والا ایک شخص وارد ہوا اور عرض کیا کہ میری نقدی ختم ہو گئی ہے اور میرے پاس وطن واپس جانے کے لیے زادِ راہ نہیں ہے۔

امام علیہ السّلام نے مجھ سے فرمایا کہ جاؤ اور اپنے دینی بھائی کا کام درست کرنے کا اقدام کرو۔

میں فوراً اُٹھا اور کوشش کر کے اس شخص کے اخراجاتِ سفر کے لیے رقم فراہم کی اور اسے دے دی۔ پھر میں دوبارہ امام علیہ السّلام کی مجلس میں لوٹ آیا۔

امامؑ نے دریافت فرمایا: "تم نے اپنے بھائی کے کام کے سلسلے میں کیا قدم اُٹھایا؟"

میں نے عرض کیا: "اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور اس کا کام ہو گیا۔"

امام علیہ السلام نے فرمایا: "یاد رکھّو کہ اگر تم اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو تو میرے نزدیک یہ فعل اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک ہفتہ خانۂ کعبہ کا (استحبابی) طواف کرو۔" پھر آپ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"ایک شخص حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السّلام کے پاس آیا اور اپنی مشکل کے بارے میں آپ سے مدد کا خواستگار ہوا۔ حضرت نے فوراً جوتا پہنا اور اس کے ساتھ ہو لیے۔ راستہ چلتے ہوئے آپ ایک ایسے مقام سے گزرے جہاں امام حسین علیہ السّلام نماز پڑھ رہے تھے۔ امام حسن علیہ السّلام نے اس شخص سے پوچھا: 'تو نے (امام) حسین سے رجوع کرنے میں

کیوں غفلت برتی اور اپنی مشکل رفع کرانے کے سلسلے میں ان کے پاس کیوں نہ گیا؟'

اس نے کہا: 'فرزندِ رسول(ص)! میں اُن حضرت سے رجوع کرنا چاہتا تھا لیکن لوگوں نے بتایا کہ وہ اعتکاف میں ہیں اس لیے ان کے پاس نہ گیا۔'

امام مجتبیٰ(ع) نے فرمایا: 'لیکن اگر وہ تیری مدد فرماتے تو یہ چیز ان کے لیے ایک مہینے کے اعتکاف سے بہتر ہوتی۔' [1]

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَا قَضَیٰ مُسْلِمٌ لِمُسْلِمٍ حَاجَۃً اِلَّا نَادَاہُ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ عَلَیَّ ثَوَابُکَ وَلَا اَرْضیٰ لَکَ بِدُوْنِ الْجَنَّۃِ [2]

"جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرے خداوند تعالیٰ اس سے فرماتا ہے کہ تیرے اس فعل کا اجر میرے ذمّے ہے اور میں تیرے لیے بہشت کے علاوہ کوئی اجر کافی نہیں سمجھتا۔"

ایک شخص نے جس کا نام عبدالاعلیٰ تھا اور جو بزرگانِ شیعہ میں سے تھا کوفے سے مدینے جانے کا عزم کیا۔ امام الصّادق(ع) کے شیعوں نے وہ مسائل جن کے جوابات کی انھیں ضرورت تھی لکھ کر اسے دے دیے اور کہا کہ ان کے جوابات امام علیہ السّلام سے حاصل کر کے اپنے ساتھ لیتے آنا۔

انھوں نے ساتھ ہی ساتھ اس سے یہ بھی کہا کہ جب تم امام عالی مقام کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل کرو تو ان سے عرض کرنا کہ وہ حقوق بیان فرمائیں جو ایک

---

[1] الکافی - جلد دوّم - صفحہ ۱۵۸ [2] قرب الاسناد - صفحہ ۱۹

مسلمان اپنے دینی بھائی پر رکھتا ہے۔

عبدالاعلیٰ کہتا ہے کہ جب میں امام علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے سب سوالات کے جوابات دے دیے لیکن دینی بھائیوں کے حقوق کے بارے میں کچھ نہ فرمایا۔ اس کے بعد کئی دن تک میں امام علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا لیکن پھر بھی آپ نے اس امر کی جانب کوئی اشارہ نہ کیا۔

مدینے میں میرے قیام کی مدّت ختم ہوگئی اور میں الوداع کہنے کے لیے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"یا ابنِ رسولؐ اللہ! میرا اس دن کا سوال تو بغیر جواب کے رہ گیا۔"

آپ نے فرمایا: "میں نے جان بوجھ کر جواب نہیں دیا۔"

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

آپ نے فرمایا: "مجھے ڈر ہے کہ اگر میں بتاؤں اور تم اس پر عمل نہ کرو تو اللہ کے دین سے خارج ہو جاؤ گے۔" اس کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے امامؑ نے فرمایا:

"بلاشبہ اللہ نے جو سخت ترین چیزیں اپنے بندوں پر واجب فرمائی ہیں وہ تین ہیں: پہلی یہ کہ انسان اپنے اور دوسروں کے درمیان عدل اور انصاف کی رعایت کرے جس سے مراد یہ ہے کہ اپنے دینی بھائیوں سے ویسا ہی برتاؤ کرے جیسا وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے ساتھ کریں، دوسری یہ کہ اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ مواسات کرتے ہوئے اپنے مال کے ذریعے ان کی مدد کرے اور تیسری یہ کہ ہر حالت میں خدا کو یاد رکھے اور یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ ہر حالت میں خدا کو یاد رکھے اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلسل سبحان اللہ اور الحمدللہ پڑھتا رہے بلکہ مقصد

یہ ہے کہ جب کسی ناجائز کام میں ملوّث ہونے کا امکان ہو تو اللہ کو یاد رکھتے ہوئے گناہ کے ارتکاب سے باز رہے۔" [1]

یہ تعلیمات اسلام کے پیروؤں کی روحوں میں اس قدر رَچ بس گئی تھیں کہ ان کے طور طریقوں کا مقابلہ کسی دوسری قوم کے طور طریقوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ ان طور طریقوں کے کچھ نمونے ہم نے دیکھ لیے ہیں اور اس قسم کے بھائی چارے اور مواسات کی مثالوں سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اب جبکہ اسلام کے ظہور کو صدیاں گزر چکی ہیں اور بنی نوعِ انسان نے فنون اور صنائع کے میدان میں نام نہاد حیرت انگیز ترقی کر لی ہے صورتِ حال یہ ہے کہ نہ صرف ان اعلیٰ انسانی اخلاق کا ترقی یافتہ ممالک میں کوئی سُراغ نہیں ملتا بلکہ جو کچھ مشاہدے میں آتا ہے وہ ان کی عین ضِد ہے۔

ایک مصنّف اہلِ یورپ کے باہمی روابط کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:

"لوگوں کے باہمی تعلّقات اور روابط سرد مہرانہ ہیں اور مضبوط جذبات سے عاری ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی محبّت جو ایک جذباتی رابطہ اور زندگی کو منوّر کرنے والی چیز ہے صنعتی مشینوں کے پہیّوں کے درمیان پِس کر رہ گئی ہے۔ درحقیقت ایثار، کریم النّفسی اور ہمدردی کی کسی کو خبر تک نہیں اور شاید ہر شخص کے دوستوں کی تعداد ہاتھوں کی انگلیوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ اگرچہ جب میں (مصنف) ہسپتال میں داخل تھا میرے ملاقاتیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی پھر بھی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام جرمن مریضوں کے مقابلے میں جو اس وارڈ میں داخل تھے میری عیادت کرنے والے زیادہ تھے اور یہی بات ہسپتال

---

[1] الکافی - جلد دوّم - صفحہ ۱۷۰ - بحار الانوار - جلد ۷ - صفحہ ۲۴۳

کے کارکنوں کے لیے دلچسپ اور تعجّب انگیز تھی کیونکہ یہ شاذ ہی دیکھنے میں آتا تھا کہ کوئی جرمن اپنے اہلِ خاندان کی عیادت کے لیے بھی آیا ہو۔"

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک دلچسپ واقعہ ایک جیتے جاگتے گواہ کے طور پر پیش کریں تاکہ آپ نام نہاد متمدّن قوموں کی محبّت اور جذبات کا معیار سمجھ سکیں۔

چند سال قبل جرمنی کی یونیورسٹی کا ایک اُستاد ہیمبرگ کی جمعیّت اسلامی کے سرپرست کے ہاتھ پر مشرّف بہ اسلام ہوگیا۔ کچھ مدّت بعد یہ نومسلم کسی بیماری کی وجہ سے ایک ہسپتال میں داخل ہوا۔ جمعیّتِ اسلامی کے سرپرست نے اس کی بیماری کے بارے پتا چلنے پر ہسپتال میں اس کی عیادت کی لیکن توقّع کے خلاف اس نے دیکھا کہ پروفیسر کا چہرہ افسردہ اور غمگین ہے۔ لہٰذا اس نے اس کی افسردگی اور پریشانی کا سبب پوچھا۔

پروفیسر نے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی اور اپنے غم انگیز خیالات میں گم تھا اب اس نے زبان کھولی اور اپنا عجیب اور رنجیدہ ماجرا یوں بیان کیا :

"آج میری بیوی اور بیٹا مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ ہسپتال سے ملحقہ ڈویژن سے انھیں پتا چلا کہ میں سرطان میں مبتلا ہوں۔ جب وہ الوداع کہہ کر ہسپتال سے جانے لگے تو انھوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا :

"جو اطّلاع ہمیں ابھی ابھی ملی ہے اس کے مطابق تم سرطان کے مرض میں مبتلا ہو اور موت کے دروازے پر دستک دے رہے ہو تمھاری زندگی اب چند دن سے زیادہ نہیں ہے۔ اب ہم تمھیں آخری دفعہ الوداع کہہ رہے ہیں اور دوبارہ تمھاری عیادت کے لیے آنے سے معذرت چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد بیمار شخص نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا :

"مجھے پریشانی کا احساس اور روحانی کرب اس لیے ہرگز نہیں کہ مجھ پر

امید کے دروازے بند ہو گئے ہیں اور میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا ہوں بلکہ میں نے اپنی بیوی اور لڑکے کا جو بعید از انصاف اور غیر انسانی سلوک دیکھا ہے اس نے مجھے بے حد غمگین کیا ہے۔"

جمعیتِ اسلامی کے سرپرست نے جو اس کی تاسّف انگیز حالت سے بے حد متاثّر ہوا تھا کہا:

"چونکہ اسلام میں بیمار کی عیادت کی بے حد تاکید کی گئی ہے اس لیے مجھے جب بھی فرصت ملی میں تمھاری عیادت کو آؤں گا اور اپنا دینی فریضہ انجام دوں گا۔"

ان الفاظ سے اس کے غمگین چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔

مریض کی حالت بتدریج تشویشناک ہوتی گئی اور چند دن کے بعد اس نے داعئ اجل کو لبّیک کہا۔ دینی مراسم کی انجام دہی اور دفن کے لیے کچھ مسلمان ہسپتال گئے اور نومسلم کا جنازہ اُٹھا کر قبرستان لے گئے لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ دفن کرنے سے چند لمحے قبل اچانک ایک نوجوان وہاں آ پہنچا جس کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بڑی تیزی سے آیا اور پوچھا:

"پروفیسر کا جنازہ کہاں ہے؟"

لوگوں نے پوچھا: "کیا متوفّی سے تمھارا کوئی رشتہ ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"ہاں، وہ میرا باپ تھا۔ میں اس لیے آیا ہوں تاکہ اس کی لاش چیر پھاڑ کے لیے ہسپتال کے حوالے کر دوں کیونکہ اس کے فوت ہونے سے چند دن قبل میں نے اپنے باپ کی میّت تیس مارک کے عوض ہسپتال کو فروخت کر دی تھی۔"

اگرچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بہت اصرار کیا لیکن جب اُس نے حاضرین کا مخالفانہ رویّہ دیکھا تو مجبوراً اپنے ارادے سے باز رہا۔

بعد میں جب اس کے پیشے کے بارے میں باتیں ہوئیں تو اس جوان نے کہا کہ "صبح کے وقت میں ایک کارخانے میں کام کرتا ہوں اور پچھلے پہر بھی کتوں کی آرائش کا کام انجام دیتا ہوں۔"

اس حادثے سے جو ایک تلخ واقعہ ہے، پتا چلتا ہے کہ نام نہاد متمدّن معاشرے میں انسانی مہر و محبت اور احساسات کس طرح تباہ و برباد ہو کر رہ گئے ہیں۔

موجودہ دَور میں اخلاقی فضائل اور معاشرتی برائیوں کے سیلاب کے نقطۂ نگاہ سے بنی نوعِ انسان کا انحطاط ناقابلِ انکار ہے۔ بڑے بڑے مفکّر اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی چارہ جُوئی کی فکر میں ہیں اور اس ناگوار صورتِ حال کے جاری رہنے سے سخت پریشان ہیں۔ انھوں نے مرض کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور انھیں احساس ہو گیا ہے کہ خودسری اور پابندیوں کے فقدان کے خلاف ایک بنیادی جنگ اور ایمان اور فضیلت کی بنیاد پر ایک نئی دنیا کی تعمیر ضروری ہے۔

جو لوگ اس قسم کی زندگی میں غرق ہیں انھیں بھی پتا چل گیا ہے کہ ایسی زندگی ایک کھوکھلی زندگی ہے اور انسان کو خوش بختی کا تحفہ ہرگز نہیں دے سکتی۔ بہتر ہو گا کہ آپ اس امر کا دلچسپ اور واضح اعتراف امریکہ کے ایک سابق صدر کی زبان سے سُنیں جو اس نے حلف برداری کی رسم کی ادائیگی کے موقع پر کیا:

"مال و دولت کے معاملے میں ہم اپنے آپ کو امیر پاتے ہیں لیکن ہماری اخلاقی حالت کمزور ہے۔ اگرچہ ہم پُورا پُورا حساب لگا کر چاند تک پہنچ جاتے ہیں لیکن یہاں زمین پر ریزہ ریزہ کر دینے والے انتشار کا شکار ہیں۔ ہم جنگ میں گرفتار ہیں۔ صلح چاہتے ہیں۔ نِفاق

نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم اتفاق کے خواہشمند ہیں۔ ہم اپنے ارد گرد کھوکھلی زندگیاں دیکھتے ہیں اور اطمینان کی آرزو رکھتے ہیں۔ ہم جس روحانی بحران سے دوچار ہیں اس کے روحانی حل کے حاجتمند ہیں۔ ایسے حل کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو دیکھیں۔ جب ہم اپنے ضمیر کی آواز کو غور سے سُنیں گے تو ہمیں پتا چلے گا کہ وہ نیکی، عفّت، محبّت اور مہربانی جیسی سادہ اور بنیادی چیزوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

ان حقائق کی جانب توجہ دینے پر ہر انصاف پسند شخص بے اختیار مقنّنِ اسلام کی بارگاہ میں تعظیم بجالانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہی مقنّن جس نے انسان کی تمام جسمانی، روحانی اور جبلّی ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے حیات بخش قوانین کی تشریح فرمائی ہے جو انسان کی فطرت کی بنیاد سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس کی تمام خواہشات پوری کرتے ہیں۔ وہ قوانین جن پر صدیوں سے عمل ہو رہا ہے اور اس کے بڑے تسلّی بخش نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

وہ قوانین جو فقط تحریر ہی نہیں کیے گئے بلکہ ان پر ان کے پُورے معانی کے ساتھ عملدرآمد ہوا اور عملدرآمد کے وقت بھی انھیں کسی دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہم مغرب کے اربابِ عقل و دانش کے اعترافات پر جتنا غور کرتے ہیں اتنا ہی ان کی نفسیاتی اور معاشرتی بے سروسامانی کا احساس بڑھتا ہے اور ہم اسلام کے پاک اور آسمانی آئین کی زیادہ قدردانی اور تعریف کرتے ہیں۔

وہ چیز جو بحث کے خاتمے پر توجّہ طلب ہے یہ ہے کہ تمام مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو بغیر کسی تزئین اور آرائش کے

رواج دیں اور بالخصوص نوجوانوں کو ان آسمانی تعلیمات سے آگاہ کریں تاکہ بھائی چارے اور مواسات کی روح جو صدیوں سے مسلمانوں کے معاشرے میں موجود ہے قوی ہو اور اس اسلامی اخوّت اور برادری کے زیرِ سایہ ہم حقیقی سعادت اور نیک بختی کی راہ پر گامزن ہوسکیں۔

اسلام میں دوستی کا آئین

بچپن میں اور جوانی کے آغاز سے بڑھاپے کے دور تک انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل میں دوسروں کی دوستی اور رفاقت کا محتاج ہوتا ہے۔

اپنی اجتماعی فطرت اور مزاج کی بنا پر انسان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ معاشرے میں رہتے ہوئے دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دوستوں کی شراکت اور تعاون سے فائدہ اُٹھائے۔

جن لوگوں کو اچھے دوست میسّر ہوں وہ دنیا میں کبھی بھی تنہا اور بے یار و مددگار نہیں رہتے کیونکہ شفیق دوست خوشی اور غم کے وقت ان کے ہمدم اور معاون ہوتے ہیں۔

انسان فطرتاً دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے سے خوشی محسوس کرتا ہے اور جب تنہا ہو اور اس کا کوئی ہم نشین نہ ہو تو پریشان اور غمگین ہو جاتا ہے۔

امام علی علیہ السلام نے حقیقی دوستوں کو دنیا اور آخرت کے ذخائر قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

عَلَيْكُمْ بِالْإِخْوَانِ فَإِنَّهُمْ عُدَّةٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ [1]

"اپنے لیے دینی بھائیوں میں سے دوست حاصل کرو کیونکہ وہ اس دُنیا اور آخرت کے ذخائر ہیں۔"

ایک اور بیان میں آپ نے اچھے دوستوں کو بدن کے بہترین اعضاء کا ہم پایہ قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں:

مَنْ فَقَدَ اَخًا فِي اللّٰهِ فَكَأَنَّمَا فَقَدَ اَشْرَفَ اَعْضَائِهٖ [2]

"جو شخص اپنے ایک ایسے پاک دل دوست کو کھو دے جو اللہ کی خاطر اس سے دوستی رکھتا ہو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ اس نے اپنے بدن کے بہترین اعضا کھو دیے ہوں۔"

دوستی اور رفاقت کے سلسلے میں جو نکتہ ہمیشہ پیشوایانِ اسلام کی توجّہ کا مرکز رہا ہے یہ ہے کہ دوستی اور رفاقت اسی وقت قیمتی ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہو اور قابلِ اعتماد رفیق وہ ہے جس کے ساتھ دوستی کی بنیاد روحانیّت پر رکھی گئی ہو۔

جو دوستیاں دولت، رتبے یا خوبصورتی کی خاطر وجود میں آئیں وہ ان چیزوں کے رخصت ہونے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور کسی قسم کی مادّی شان و شوکت ایک مکمّل اور سعادت بخش دوستی کی پشت پناہ نہیں بن سکتی۔

ایک اور نکتہ جسے اسلام میں بہت اہمیّت دی گئی ہے وہ دوست کے انتخاب کا ہے۔ پیشوایانِ اسلام کے نظریے کے مطابق ہر شخص سے دوستی قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے دوستی قائم کرنا مضر اور خطرناک ہو سکتا ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ۔ جلد چہارم [2] غرر الحکم

بلاشبہ ہر دوست مادّی اور روحانی امور میں اپنے رفیق پر اثر انداز ہوتا ہے اور ارادی یا غیر ارادی طور پر ہر شخص میں دوسرے کے عقائد، افکار، اخلاق اور کردار سرایت کر جاتے ہیں۔

تجربہ بھی اس بات کا شاہد ہے کہ بہت سی دوستیاں افراد کے مقدر میں تبدیلی کا موجب بن گئیں اور ان کی زندگی کی راہوں کو بدل کر رکھ دیا۔

دوست ایک دوسرے کے عقائد و افکار اور اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ وَقَرِيْنِهٖ [1]

"ہر شخص کی روش اس کے دوست کے مذہب اور مسلک کے مطابق ہوتی ہے۔"

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا ہے:

لَا تَحْكُمُوْا عَلٰى رَجُلٍ بِشَيْءٍ حَتّٰى تَنْظُرُوْا اِلٰى مَنْ يُصَاحِبُ فَاِنَّمَا يُعْرَفُ الرَّجُلُ بِاَشْكَالِهٖ وَاَقْرَانِهٖ وَيُنْسَبُ اِلٰى اَصْحَابِهٖ وَاَخْدَانِهٖ [2]

"کسی شخص کی اچھائی اور برائی کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ نہ دو جب تک اس کے دوستوں کو نہ دیکھ لو کیونکہ ہر شخص اپنے جیسوں اور اپنے ہم نشینوں کے وسیلے سے پہچانا جاتا ہے اور اپنے رفیقوں اور دوستوں سے منسوب ہوتا ہے۔"

ایک مفکر کہتا ہے:

"مجھے بتا کہ تو کن لوگوں کو پسند کرتا ہے تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ تو خود کون

---

[1] وسائل الشیعہ - جلد چہارم [2] مستدرک الوسائل - جلد دوم

ہے اور عقل، ذوق اور اخلاق کے لحاظ سے کیا قیمت رکھتا ہے۔"

شائستہ لوگوں سے دوستی اور رفاقت انسان کی خوش بختی اور سعادت کا ایک بڑا عامل شمار ہوتی ہے اور غیر شائستہ لوگوں سے ہم نشینی اور رفاقت لوگوں کی بربادی اور بدبختی کا سبب سمجھی جاتی ہے۔

سقراط کہتا ہے:

"جو لوگ کسی اہمیت کے حامل ہیں ان میں سے کوئی تو دولت چاہتا ہے، کوئی حُسن اور کوئی رُتبے کا خواہاں ہے لیکن میرا اعتقاد یہ ہے کہ ایک اچھا دوست ان سب سے بہتر ہے۔"

ایک مشہور انگریز مصنّف کہتا ہے:

"دوستوں کے انتخاب میں احتیاط برتنی چاہیے کیونکہ ہماری بہت سی مصیبتیں غلط میل جول کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔"

انسان جب گہوارے سے عرصۂ حیات میں قدم رکھتا ہے تو وہ معاشرے کے میدان میں مختلف طبقوں کے لوگوں سے واقفیّت پیدا کرتا ہے اور اتّفاق سے ان میں سے کسی ایک گروہ کے ساتھ گھُل مل جاتا ہے۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فرومایہ لوگوں کے ساتھ آشنائی کے نتیجے میں وہ پستی اور رذالت کے غار میں گر جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ فرومایہ لوگ اپنے ملنے جلنے والوں کے حق میں کوئی بُرا ارادہ نہ رکھتے ہوں لیکن بچھّو کی طرح اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق ہمیشہ دوسروں کو ڈنک مارتے ہیں اور اپنے بُرے اخلاق کا زہر اُن کی روح میں گھول دیتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اپنی پاکدامنی اور نیکوکاری پر اس قدر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ بُرے لوگوں سے میل جول رکھنے سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اپنی شخصیت کو اس سے کہیں بلند سمجھتے ہیں کہ بُرے اخلاق ان پر اثر انداز ہو

سکیں اور اس حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں کہ اگر روئی آگ کے پاس رکھی جائے تو خود بخود جل اُٹھتی ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ بُرائی اس سے بھی زیادہ تیزی سے انسان کی روح میں تاثیر کر جاتی ہے۔ اس کی مثال بارُود کے ایک ڈھیر کی ہے جو ایک شرارے سے بھڑک اُٹھتا ہے اور اپنے شعلوں سے ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

جس شخص کو اپنی نیکو کاری پر ناز ہو اور وہ فرومایہ لوگوں سے میل جول سے پرہیز نہ کرے اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو اپنا گھر سیلاب کی گزرگاہ پر تعمیر کرے اور یہ سمجھتا ہو کہ سیلاب کی قوّت اس کے گھر کی بنیادوں پر اثر انداز نہ ہوگی۔

ایک قدیم عربی مثل ہے کہ "ایک بُرا ہم جولی لوہار کی مانند ہے جو اگر تمھیں اپنی آگ سے نہ بھی جلائے تب بھی اس کی بھٹّی کا دھواں تمھاری آنکھوں کو تکلیف پہنچاتا ہے"۔

ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ آپ اتنے متین اور شریف النّفس ہیں کہ بُروں سے ملاقات آپ کی روح پر کوئی اثر نہیں ڈالتی لیکن لوگ آپ کے بارے میں کیا کہیں گے؟ کیا وہ اس دلیل کی بنا پر آپ کو انھی کے زُمرے میں شمار نہیں کریں گے کہ آپ ان سے میل جول رکھتے ہیں؟

بہر حال یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اچّھے لوگوں سے میل جول خوش نصیبی کی شرائط میں سے ہے کیونکہ بہت سے لوگ فقط اس وجہ سے بدبختی سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے دوستوں کے انتخاب کے بارے میں مکمّل احتیاط نہیں برتتے۔

بُرے دوستوں سے خطرہ دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس قسم کی دوستی کی وجہ سے لوگوں کو قیامت کے دن بھی پشیمانی اٹھانی پڑے گی۔

جو لوگ قیامت کے دن عذابِ خداوندی میں گرفتار ہوں گے ان میں سے ایک گروہ کے بارے میں قرآنِ مجید یوں ارشاد فرماتا ہے:

"وہ آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش! ہم دنیا میں فلاں غیر صالح شخص سے دوستی اور رفاقت نہ کرتے۔ وہی تھا جس نے ہمیں گمراہی کے راستے پر ڈالا"۔ [1]

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

جُمِعَ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فِي كِتْمَانِ السِّرِّ وَ وَمُصَادَقَةِ الْأَخْيَارِ وَجُمِعَ الشَّرُّ فِي الْإِذَاعَةِ وَمُوَاخَاةِ الْأَشْرَارِ [2]

"دنیا اور آخرت کی بھلائی دو چیزوں میں جمع ہو جاتی ہے، ایک بھیدوں کو چھپا کر رکھنا اور دوسری اچھے لوگوں سے دوستی رکھنا۔ اسی طرح دنیا اور آخرت کی بدبختی بھی دو چیزوں میں مضمر ہے، ایک بھیدوں کا فاش کرنا اور دوسری بُرے لوگوں کی رفاقت اختیار کرنا"۔

شیخ مصلح الدین شرف الدین سعدی شیرازی کہتے ہیں:

"جو شخص بُروں کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے اگرچہ ان کی فطرت اس پر اثر انداز نہ بھی ہو تب بھی اس پر ان کے طور طریقے کا الزام آجاتا ہے اور اگر وہ شراب خانے میں نماز پڑھنے جائے تب بھی شراب خواری سے منسوب ہو جاتا ہے۔

رقم برخود بنادانی کشیدی — کہ ناداں را بصحبت برگزیدی

(تونے اپنی نادانی پر مہر ثبت کر دی۔ کیونکہ تونے نادان کو اپنی صحبت کے لیے چُن لیا)

طلب کردم ز دانائی یکے پند — مرا فرمود: با نادان مپیوند

[1] سورۂ الفرقان - آیات ۲۸ - ۲۹ [2] اختصاص

(میں نے ایک عقلمند آدمی سے نصیحت کرنے کو کہا تو اس نے کہا کہ نادان کے ساتھ تعلقات مت استوار کر)"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَسۡعَدُ النَّاسِ مَنۡ خَالَطَ کِرَامَ النَّاسِ [1]

"سب سے زیادہ خوش نصیب شخص وہ ہے جو کریم النفس اور صالح لوگوں سے دوستی رکھے اور راہ و رسم پیدا کرے۔"

جارج ہربرٹ کہتا ہے:

"نیک لوگوں سے ہم نشینی اختیار کرو تاکہ تمھارا شمار بھی اُنہی میں ہو۔"

ایک عقلمند ماں اپنے بچوں سے کہا کرتی تھی:

"جو غذا ہم کھاتے ہیں تو جس طرح اس سے ہمارا بدن غذائیت اور طاقت حاصل کرتا ہے اسی طرح ہماری روح بھی اچھے یا بُرے دوستوں کی صحبت سے نیکی اور پرہیزگاری یا خباثت اور شرارت اخذ کرتی ہے۔"

یہ محال ہے کہ جو لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں ان سے میل جول ہماری طبیعت پر گہرا اثر نہ چھوڑے کیونکہ تقلید کرنا انسانی فطرت ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اپنے دوستوں کی حرکات، آداب اور افکار کا اثر قبول کرتا ہے۔

ایک دانشمند کہتا ہے:

"مثل مشہور ہے کہ اشخاص کو ان کے دوستوں اور ملنے والوں سے پہچاننا چاہیے۔ تاہم ہوشیار، غافل سے، عالم، جاہل سے اور مہذب، غیر مہذب سے کبھی دوستی نہیں کرتا اور نہ ہی میل جول رکھتا ہے۔"

رذیل اور اوباش لوگوں سے ملنا جلنا انسان کے اندر ناپاک خیالات اور پست

---

[1] امالی صدوق۔ صفحہ ۱۴

خواہشات پیدا کرتا ہے اور اگر طویل مدت تک ان سے تعلقات رکھے جائیں تو یہ امر یقینی ہے کہ انسان کے اخلاق پست اور روبہ انحطاط ہو جاتے ہیں اور وہ انہی کے خراب ماحول کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

ایک دانشور نے کیا خوب کہا ہے:

"اس قسم کے لوگوں سے بات تک کرنا بھی مضر اور خطرناک ہے کیونکہ اگر بالفرض ان سے میل جول میں محض وقتی نقصان بھی ہو تب بھی وہ ہمارے دماغ میں ایسا بیج بو دیتا ہے جو جلد ہی نمو پا کر جڑیں پکڑ لیتا ہے۔"

ان لوگوں سے مصاحبت طاعون کا حکم رکھتی ہے جو فوراً انسان کے بدن میں سرایت کر جاتا ہے۔

خوش اخلاق اور لائق لوگوں سے میل جول روح کو بے حد تقویت پہنچاتا ہے اور اس کے برعکس جاہل اور برے لوگوں کی صحبت سب سے بڑی مصیبت اور خطرہ ہوتی ہے۔

ایک ہسپانوی مثل ہے کہ:

"اگر تم بھیڑیوں کے پاس جاؤ گے تو ان سے چیخنا چلانا ہی سیکھو گے۔"

پست اور خود غرض لوگوں کی صحبت بے حد نقصان دہ ہے کیونکہ ان کے اخلاقی اثرات انسان کی فکر کو تاریک اور محدود کر دیتے ہیں اور مردانگی اور اعلیٰ اخلاق کی روح کو کچل ڈالتے ہیں اور ان کے ساتھ میل جول جاری رہے تو انسان کا دل سخت ہو جاتا ہے اور اخلاقی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور اس کے عزم اور ارادے کی پختگی، ترقی اور برتری کی حس اس کی طبیعت سے معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ان لوگوں سے راہ و رسم اور دوستی جو ہم سے زیادہ عقلمند، فاضل اور تجربے کار ہیں، بڑی قیمتی چیز ہے کیونکہ ان کی صحبت انسان کے بدن میں ایک تازہ روح پھونک

دیتی ہے اور ہمیں زندگی کے آداب سکھاتی ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ وہ ہمیں اپنی عقل و دانش اور تجربوں میں شریک کر لیتے ہوں۔

لہٰذا اخلاق کی تعمیر کے لیے فعال اور عقلمند لوگوں کی مصاحبت اور دوستی سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر اور مفید نہیں کیونکہ ان سے ملنا جلنا ہماری روحانی قوتوں کو بڑھاتا ہے اور ہماری قوّتِ ارادی کو مضبوط تر کرتا ہے اور دنیا میں ہمارے مقصد کو بلند تر کرتا ہے اور ہمیں اپنی زندگی کے کاروبار انجام دینے اور دوسروں کی مدد کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

ہم نشینی اور مصاحبت کے بارے میں شیخ سعدی یوں کہتے ہیں:

"گِلے خوشبوئے در حمّام روزے   رسید از دست محبوبے بدستم

(ایک دن حمّام میں کچھ خوشبو دار مٹّی ایک محبوب کے ہاتھ سے میرے ہاتھ آئی)

بدو گفتم کہ مُشکے یا عبیرے   کہ از بوئے دلآویزِ تو مستم

(میں نے اُس سے کہا کہ تو مُشک ہے یا عبیر کیونکہ تیری دلآویز خوشبو سے میں مست ہو رہا ہوں)

بگفتا من گِلے ناچیز بودم   ولیکن مُدّتے باگُل نشستم

(اس نے کہا کہ میں تو ایک ناچیز مٹّی تھی لیکن ایک مدّت تک گلاب کے پھول کی ہم نشین رہی)

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(میرے ساتھی کے جمال نے مجھ میں اثر کیا ورنہ میں تو وہی ناچیز مٹّی ہوں)"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"میرے والدِ بزرگوار نے اپنے مواعظ کے سلسلے میں مجھے فرمایا:

یَا بُنَیَّ مَنْ یَصْحَبْ صَاحِبَ السُّوْءِ لَا یَسْلَمْ وَمَنْ یَدْخُلْ مَدَاخِلَ السُّوْءِ یُتَّهَمْ وَمَنْ لَا یَمْلِكُ لِسَانَهٗ یَنْدَمْ [1]

"اے جانِ پدر! جو شخص بُرے لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے وہ ان کی گزند سے محفوظ نہیں رہتا اور جو شخص بدنام جگھوں پر جاتا ہے وہ بدنام ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا وہ پشیمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

امام زین العابدین علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اُنْظُرْ خَمْسَةً فَلَا تُصَاحِبْهُمْ وَلَا تُحَادِثْهُمْ وَلَا تُرَافِقْهُمْ فِیْ طَرِیْقٍ...... اِیَّاكَ وَمُصَاحَبَةَ الْكَذَّابِ...... وَاِیَّاكَ وَمُصَاحَبَةَ الْفَاسِقِ...... وَاِیَّاكَ وَمُصَاحَبَةَ الْبَخِیْلِ...... وَاِیَّاكَ وَمُصَاحَبَةَ الْاَحْمَقِ...... وَاِیَّاكَ وَمُصَاحَبَةَ الْقَاطِعِ لِرَحِمِهٖ [2]

"پانچ قسم کے لوگوں کی ہم نشینی اختیار نہ کرو، ان سے گفتگو نہ کرو اور کسی راہ میں بھی ان کے رفیق نہ بنو۔

(۱) جھوٹوں سے اجتناب کرو کیونکہ وہ سراب کی مانند ہیں جو بے حقیقت باتوں کے ذریعے مسائل کو دگرگوں کر کے دکھاتے ہیں، دُور کو اپنی جھوٹی باتوں سے نزدیک اور نزدیک کو دُور دکھاتے ہیں اور تمھیں معاملات کی حقیقت سے منحرف کر دیتے ہیں۔

---

[1] خصال - جلد اوّل - صفحہ ۸۰ [2] بحار الانوار - جلد ۴۷

(۲) فاسق اور بدکار لوگوں سے دُور رہو کیونکہ ان کا ساتھ بھروسے کے قابل نہیں اور وہ تمھیں ایک لقمے یا اس سے بھی کم کے عوض بیچ ڈالیں گے۔

(۳) بخیل لوگوں سے الگ رہو کیونکہ یہ لوگ ضرورت اور مشکل کے وقت تمھیں ذلّت اور خواری کے گڑھے میں دھکیل دیں گے۔

(۴) احمق لوگوں سے گریز کرو کیونکہ ہوسکتا ہے وہ تمھیں فائدہ پہنچانا چاہیں لیکن اپنی نادانی اور حماقت کی وجہ سے تمھارے لیے نقصان کا موجب بن جائیں۔

(۵) جو لوگ قطع رحمی کے مرتکب ہوں یعنی اپنے اقربا سے قطع تعلق کرلیں اور ان سے بُرا سلوک کریں ان سے پرہیز کرو کیونکہ ان لوگوں کو قرآنِ مجید میں اللہ کی لعنت اور نفرین کا مورد قرار دیا گیا ہے۔"

امام علیؑ نے اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰؑ کو جو وصیتیں کیں ان کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

إِيَّاكَ وَمَوَاطِنَ التُّهْمَةِ وَالْمَجْلِسَ الْمَظْنُونَ بِهِ السُّوءُ فَإِنَّ قَرِينَ السُّوءِ يُغَيِّرُ جَلِيسَهُ [۱]

"بدنام مقامات سے پرہیز کرو اور جو مجالس بدگمانی کا مورد ہوں ان سے دُور رہو اور یہ جان لو کہ بُرا دوست اپنے دوست کو دھوکا دیتا ہے اور اسے بُرے کاموں کا شوق دلاتا ہے اور بالآخر اسے ان کاموں میں آلودہ کر دیتا ہے۔"

۱۔ وسائل الشیعہ۔ جلد سوّم

امام الصادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اَلْاِخْوَانُ ثَلٰثَةٌ فَوَاحِدٌ كَالْغِذَاءِ الَّذِیْ یُحْتَاجُ اِلَیْهِ كُلَّ وَقْتٍ فَهُوَ الْعَاقِلُ، وَالثَّانِیْ فِیْ مَعْنَی الدَّاءِ وَهُوَ الْاَحْمَقُ، وَالثَّالِثُ فِیْ مَعْنَی الدَّوَاءِ فَهُوَ اللَّبِیْبُ [1]

"دلی دوست جو انسان سے بھائی کی طرح وابستہ ہوتے ہیں تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ دوست جو غذا کی مانند زندگی کے قطعی لوازم میں شمار ہوتا ہے اور انسان کو ہر حالت میں اس کی ضرورت ہوتی ہے وہ عقلمند رفیق ہوتا ہے۔ دوّم وہ شخص جس کا وجود بمنزلہ دُکھ اور بیماری کے ہے اور وہ احمق رفیق ہوتا ہے اور سوّم وہ دوست جس کا وجود ایک صحت بخش دوا کی مانند ہے اور وہ رفیقِ لبیب یعنی بے حد عقلمند دوست ہوتا ہے۔"

عقلمند دوست انسان کو نازک موقعوں پر بڑے بڑے خطروں سے بچاتے ہیں اور جن لوگوں کو ایسے دوست میسّر ہوں وہ ایک بہت بڑی نعمت اور بڑے قیمتی سرمائے سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

امام علی ابن ابی طالبؑ نے متلوّن مزاج لوگوں سے دوستی قائم کرنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَلَا خَیْرَ فِیْ وُدِّ امْرِءٍ مُتَلَوِّنٍ
اِذَا الرِّیْحُ مَالَتْ مَالَ حَیْثُ تَمِیْلُ
جَوَادٌ اِذَا اسْتَغْنَیْتَ عَنْ اَخْذِ مَالِهٖ
وَعِنْدَ احْتِمَالِ الْفَقْرِ عَنْكَ بَخِیْلُ

---

[1] تحف العقول

فَمَا أَكْثَرَ الْإِخْوَانُ حِيْنَ تَعُدُّهُمْ
وَلٰكِنَّهُمْ فِي النَّائِبَاتِ قَلِيْلٌ [1]

"متلوّن اور دھوکے باز لوگوں کی دوستی میں بھلائی نہیں کیونکہ وہ جس رُخ کی ہوا چلے اُسی رُخ کو ہو لیتے ہیں جب تمھیں ان کی مدد کی ضرورت نہ ہو وہ بڑے سخی اور فیّاض ہوتے ہیں لیکن اگر تم کسی دن ان کے محتاج ہو جاؤ تو بخیل اور سخت گیر بن جاتے ہیں۔ بلاشبہ دوستوں کا شمار کرتے وقت ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن وہ دوست جو پریشانی اور مشکل کے وقت کام آئیں بہت کم ہوتے ہیں۔"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اِحْذَرْ مِنَ النَّاسِ ثَلَاثَةً اَلْخَائِنَ وَالظَّلُوْمَ وَالنَّمَّامَ لِاَنَّ مَنْ خَانَ لَكَ خَانَكَ وَمَنْ ظَلَمَ لَكَ سَيَظْلِمُكَ وَمَنْ نَمَّ اِلَيْكَ سَيَنُمُّ عَلَيْكَ [2]

"تین قسم کے لوگوں یعنی خائن، ظالم اور چغلخور کی دوستی اور رفاقت سے اجتناب کرو کیونکہ جو شخص تمھارے فائدے کی خاطر دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ ایک دن تمھیں بھی دھوکا دے گا اور جو شخص تمھاری خاطر لوگوں پر ظلم کرے وہ ایک دن تم پر بھی ظلم کرے گا اور جو شخص دوسروں کی چُغلی تمھارے پاس کھائے وہ جلد ہی تمھاری چُغلی دوسروں کے پاس بھی کھائے گا۔"

لوگوں میں سے اپنے لیے شائستہ دوستوں کا انتخاب کرنے کے لیے انسان

---

[1] دیوان امیرالمومنینؑ
[2] تحف العقول

کو چاہیئے کہ کافی چھان بین کرے۔

مارک اورل کہتا ہے:

"جب تم کسی سے دوستی کرنا چاہو تو سب سے پہلے یہ دیکھو کہ وہ کتنی عقل کا مالک ہے؟ نیکی اور بدی کے بارے میں اس کے خیالات کیا ہیں؟ عزّت اور ذلّت کی اس کے نزدیک کیا اہمیّت ہے؟ نیک بختی اور بدبختی اس کے نزدیک کیا چیزیں ہیں؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بعد میں جب تم اس سے کوئی بات سنو تو حیرت زدہ نہ رہ جاؤ کیونکہ پھر تم دیکھو گے کہ اس کے تمام کام اس کے اقوال کے مطابق ہوں گے اور اس کی عقل سے ہم آہنگ ہوں گے۔"

تجربے کار اور عقلمند لوگ دوستوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے ہیں اور اگر کسی سے دوستی پیدا کرنا اور اس کا سچّا دوست بننا چاہیں تو عقل و ہوش سے کام لیتے ہیں اور جلد بازی اور بے جا احساسات کو اس امر پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ شروع شروع میں اس سے مانوس ہوتے ہیں تاکہ اس کے طرزِ فکر، اخلاق اور گزشتہ زندگی کے حالات و واقعات سے آگاہ ہو سکیں۔ پھر اُسے مختلف طریقوں سے آزماتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ وہ دوستی کی تمام شرائط پوری کرتا ہے اور اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں تو پھر اس سے دوستی قائم کرتے ہیں۔ ایسی دوستی تمام خطرات سے پاک مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَنِ اتَّخَذَ اَخاً بَعْدَ حُسْنِ الِاخْتِبَارِ دَامَتْ صُحْبَتُهٗ وَتَاَكَّدَتْ مَوَدَّتُهٗ [1]

---

[1] غرر الحکم

"جو شخص صحیح آزمائش کے بعد دوستی اور رفاقت کی بنیاد ڈالتا ہے اس کی رفاقت پائیدار اور دوستی مستحکم ہوتی ہے۔"

رسول اکرمؐ نے ابنِ مسعود کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

فَلْيَكُنْ جُلَسَاؤُكَ الْاَبْرَارُ وَاِخْوَانُكَ الْاَتْقِيَاءُ وَالزُّهَّادُ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ فِىْ كِتَابِهٖ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ [1]

"تمھارے ہم نشین اور دوست صالح اور نیک ہونے چاہئیں اور تمھیں چاہیئے کہ زاہد اور پرہیزگار لوگوں کی جانب بھائی چارے اور رفاقت کا ہاتھ بڑھاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سب دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے بجز پرہیزگار لوگوں کے جن کی دوستی پائیدار ہوگی۔"

اسلامی تعلیمات میں ایک دوست کی ان تمام حدود اور خصوصیات کے معیار کا ذکر کیا گیا ہے جو خود بخود دوستوں کے انتخاب اور آزمائش کے سلسلے میں انسان کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔

امام الصّادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اَلصَّدَاقَةُ مَحْدُوْدَةٌ وَمَنْ لَمْ تَكُنْ فِيْهِ تِلْكَ الْحُدُوْدُ فَلَا تَنْسِبْهُ اِلٰى كَمَالِ الصَّدَاقَةِ.......

اَوَّلُهَا اَنْ تَكُوْنَ سَرِيْرَتُهٗ وَعَلَانِيَتُهٗ لَكَ وَاحِدَةً،

وَالثَّانِيَةُ اَنْ يَرٰى زَيْنَكَ زَيْنَهٗ وَشَيْنَكَ شَيْنَهٗ،

وَالثَّالِثَةُ لَا يُغَيِّرُهٗ عَلَيْكَ مَالٌ وَلَا وِلَايَةٌ،

---

[1] مکارم الاخلاق طبرسی۔ صفحہ ۵۲۸

وَالرَّابِعَةُ اَنْ لَا يَمْنَعَكَ شَيْئًا مِمَّا تَصِلُ اِلَيْهِ مَقْدُرَتُهُ،
وَالْخَامِسَةُ اَنْ لَا يُسْلِمَكَ عِنْدَ النَّكَبَاتِ [1]

" دوستی اور رفاقت کی کچھ حدود اور شرائط ہیں۔ جو شخص ان میں سے بعض شرائط پوری کرتا ہو وہ صحیح معنی میں رفیق نہیں ہے اور جو ان میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ کرتا ہو اس پر رفیق کے نام کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔......

پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا ظاہر اور باطن یکساں ہو اور تمھارے متعلق وہ جس چیز کا اظہار کرے وہی اس کے دل میں بھی ہو،

دوّم یہ کہ تمھاری بھلائی کو اپنی بھلائی اور تمھارے نقصان کو اپنا نقصان سمجھے، تمھاری آبرو کو اپنی آبرو اور تمھاری رسوائی کو اپنی رسوائی تصوّر کرے

سوّم یہ کہ اگر اس کی مالی حالت بہتر ہو جائے یا دولت اس کے ہاتھ آجائے یا وہ کسی رتبے پر پہنچ جائے تو تم سے اپنا رویّہ تبدیل نہ کرے۔

چہارم یہ کہ حتّی المقدور تمھاری مدد کرنے اور تمھارا ساتھ دینے میں کوئی مضائقہ نہ کرے۔

پنجم یہ کہ اگر تم پر مصیبت اور گردش کا وقت آئے تو تمھیں بھول نہ جائے اور تنہا نہ چھوڑ دے۔"

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَنْ غَضِبَ عَلَيْكَ مِنْ اِخْوَانِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يَقُلْ فِيْكَ شَرًّا فَاتَّخِذْهُ لِنَفْسِكَ صَدِيْقًا [2]

" تمھارے جاننے والوں میں سے جس شخص کو تم پر تین بار غصّہ آیا ہو

---

[1] امالی صدوق۔ صفحہ ۳۹۷   [2] سفینۃ البحار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۶

لیکن اس نے تمہارے بارے میں کوئی ناروا بات نہ کہی ہو تو تم اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتے ہو اور اس کے ساتھ رفاقت کی بنیاد رکھ سکتے ہو۔"

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

لَا يَكُونُ الصَّدِيقُ صَدِيقًا حَتّٰى يَحْفَظَ اَخَاهُ فِي ثَلَاثٍ فِي نَكْبَتِهِ وَغَيْبَتِهِ وَوَفَاتِهِ [1]

"کسی شخص کو حقیقی دوست نہیں کہا جا سکتا بجز اس کے کہ وہ اپنے دوست کی مصیبت کے وقت اور اس کے غائب ہو جانے کی صورت میں اور اس کے مر جانے کے بعد اُس کی آبرو کی حفاظت کرے۔"

رفاقت میں اعتدال اور میانہ روی ایک ایسا اہم نکتہ ہے جسے ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ بے اعتدالی کا نتیجہ ناقابلِ تلافی نقصان کی صورت میں نکلے جو انسان کو تباہی سے دوچار کر دے۔

دوستی کے دوران میں دوست پر اس حد تک اعتماد کرنا چاہیے کہ اگر بعد میں رنجیدگی کی بنا پر ایک دوسرے سے جدائی بھی ہو جائے تو وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَّا، عَسٰى اَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَّا وَابْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَّا [2]

"جس دوست سے تمھیں دلی تعلّق ہو اس کے ساتھ دوستی کا اظہار اعتدال کی حد میں اور مصلحت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کرو کیونکہ ممکن ہے ایک دن وہ تمہارا دشمن بن جائے اور جس شخص سے تمہاری دوستی

---

[1] نہج البلاغہ   [2] تحف العقول

نہ ہو اس سے سرد مہری برتنے میں بھی اعتدال سے کام لو کیونکہ ممکن ہے کہ ایک دن یہ کدورت چھٹ جائے اور وہ تمھارا دوست بن جائے۔"

شیخ سعدی جنھوں نے اپنے اشعار اور تصانیف میں پیشوایانِ اسلام ائمۂ طاہرین علیہم السّلام کے ارشادات سے کافی استفادہ کیا ہے کہتے ہیں:

"تو اپنا ہر راز دوست کو نہ بتا کیونکہ کیا خبر وہ کسی وقت تیرا دشمن بن جائے اور ہر وہ تکلیف جو تو دشمن کو پہنچا سکتا ہو مت پہنچا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ تیرا دوست بن جائے۔"[1]

ایک انگریز مصنّف کہتا ہے:

"دوستوں کے ساتھ اس طرح رہو کہ اگر وہ تمھارے دشمن ہو جائیں تو تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے اور دشمنوں سے ایسا سلوک کرو کہ اگر وہ تمھارے دوست بن جائیں تو تمھیں ان کے سامنے شرمسار نہ ہونا پڑے۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس اصول پر عمل نہیں کرتے اور نتیجۃً ہمیشہ مضطرب اور پریشان رہتے ہیں۔ وہ اپنے خفیہ سے خفیہ راز بھی دوستوں کو بتا دیتے ہیں پھر ہوتا یہ ہے کہ جونہی دوستی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور نوبت دشمنی تک پہنچ جاتی ہے تو وہی دوست جو کل تک اس شخص کے ساتھ مثل یک جان دو قالب تھا اس کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اور اُس حربے کے ساتھ جو اس نے پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اس سے جی کھول کر بدلہ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بڑے سردار نے جو میدانِ جنگ کی طرف جا رہا تھا لوئی چہاردہم سے کہا تھا کہ آپ میرے دوستوں کے شر سے میری حفاظت کریں، دشمنوں کا مجھے کوئی خوف نہیں۔"

[1] گلستان - باب ۸

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اِبْذِلْ لِصَدِيقِكَ كُلَّ الْمَوَدَّةِ وَلَا تَبْذِلْ لَهُ كُلَّ الطُّمَانِيْنَةِ وَاَعْطِهِ كُلَّ الْمُوَاسَاةِ وَلَا تُفْضِ اِلَيْهِ بِكُلِّ الْاَسْرَارِ [1]

"اپنے دوست پر ساری محبّت نچھاور کر دو لیکن اس پر مکمّل اعتماد نہ کرو۔ اُس کے ساتھ ہر لحاظ سے مواسات برتو اور اس کی مدد کرو لیکن اسے اپنے تمام بھیدوں سے آگاہ نہ کرو۔"

اوّل تو قابلِ اعتماد دوستوں کا حصُول ہی مشکل ہے لیکن اس سے زیادہ مشکل چیز ان کے ساتھ دوستی کو برقرار رکھنا ہے۔

اگر دوستی میں حقوق اور فرائض کا لحاظ نہ رکھّا جائے تو بہت جلد یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اَعْجَزُ النَّاسِ مَنْ عَجَزَ عَنِ اكْتِسَابِ الْاِخْوَانِ وَاَعْجَزُ مِنْهُ مَنْ ضَيَّعَ مَنْ ظَفَرَ بِهِ مِنْهُمْ

"کمزور ترین شخص وہ ہے جو اپنے لیے دوست مہیّا نہ کر سکے اور اس سے زیادہ کمزور وہ ہے جو اپنے حاصل کردہ دوستوں کو کھو دے۔"

شیکسپیئر کہتا ہے:

"اپنے دوست کی نگہداشت اپنی جان کی طرح کرو۔"

حکیم سنائی نے کہا ہے:

"بد کسے داں کہ دوست کم دارد زاں بتر چوں گرفت بگذارد

---

[1] کنز الفوائد۔ کراچکی

(اس شخص کو بُرا سمجھو جس کا کوئی دوست نہ ہو اور اس سے بُرا اسے سمجھو جسے دوست مل جائے تو وہ اسے کھو دے)"

انسان کے دوستوں کے کنارہ کش ہونے اور محبّت کا رشتہ ٹوٹ جانے کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک دوست کو پریشان اور آزردہ کرنا ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

إِذَا احْتَشَمَ الْمُؤْمِنُ أَخَاهُ فَقَدْ فَارَقَهُ [1]

"جب انسان اپنے دوست کو رنجیدہ اور خشمگین کر دے تو وہ جُدائی اور مفارقت کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔"

دوسری چیز جو دوستوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کا موجب بنتی ہے چُغل خوروں کی باتیں قبول کرنا ہے۔

بلا شبہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کے مخلصانہ اور دوستانہ تعلّقات نہیں بھاتے اور وہ ہمیشہ ان کے مابین پھوٹ ڈالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ سچّی جھوٹی باتیں ایک دوسرے کے پاس جا کر لگاتے ہیں اور اس طرح اُنھیں ایک دوسرے سے بد دل کر دیتے ہیں۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

مَنْ أَطَاعَ الْوَاشِيْ، ضَيَّعَ الصَّدِيْقَ [2]

"جو شخص چُغل خوروں کی باتوں کی طرف توجّہ دے گا وہ اپنے عزیز دوست کو کھو بیٹھے گا۔"

چُغل خوروں کی باتوں کے مقابلے میں لوگوں پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ انھیں جھٹلائیں اور ان کی باتوں کی طرف توجّہ نہ دیں تاکہ وہ بھی اپنے ناشائستہ کام

---

[1]، [2] نہج البلاغہ

سے متنبہ ہوں اور انسان اپنے دوست سے بھی محروم نہ ہونے پائے۔

ایک اور چیز جو دوستی کے خاتمے کا باعث بن سکتی ہے وہ دوستوں کی ہر بات میں مین میخ نکالنا اور ان کی معمولی غلطیوں اور لغزشوں کو اہمیت دینا ہے۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ زندگی میں ہر ایک سے غلطیاں اور لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے دینی بھائیوں اور دوستوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرے۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اِقْبَلْ عُذْرَ اَخِيْكَ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ عُذْرٌ فَالْتَمِسْ لَهُ عُذْرًا [1]

"اپنے دوست کا عُذر (اگر اس سے کوئی لغزش سرزد ہو تو) قبول کر لو اور اگر وہ اپنی لغزش کے لیے کوئی عذر پیش نہ کر سکے تو تم خود اس کے لیے کوئی عذر گھڑ لو۔"

ایک دانشمند کہتا ہے:

"خواہ دوستوں کا عذر بیجا ہو اور ان کا استدلال منطقی نہ بھی ہو تب بھی ان کا عذر قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ جب وہ اپنے کام سے پشیمان ہوتا ہے اور معذرت طلب کرتا ہے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے دوستی اور اس کے قائم رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ جب اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے تو اُسے پکڑ لے۔"

شیخ سعدی نے کہا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ

ز دوست، دوست نرنجد بہیچ تقصیرے
اگر برنجد و گوید کہ دوستم، غلط است

(دوست، دوست سے کسی غلطی پر رنجیدہ نہیں ہوتا اور اگر وہ رنجیدہ ہو جائے اور کہے کہ میں دوست ہوں تو غلط کہتا ہے)

ایک اور چیز جو جدائی کا موجب بنتی ہے اور دوستی کے لیے بلائے عظیم ہے وہ دوستوں سے ٹھٹھا مذاق کرنا، ان کا تمسخر اُڑانا، انھیں حقیر سمجھنا اور ان کا مُنہ چڑانا ہے۔

ایک دن حارث بن اعور نے جو امام علی علیہ السّلام کے اصحاب میں سے تھا آپ کے سامنے اپنے حد درجہ اخلاص اور دلی ارادت کے بارے میں عرض کیا اور کہا کہ یا امیر المؤمنین! میں آپ کو دوست رکھتا ہوں۔

جب اس نے دوستی کا ذکر چھیڑا تو امیر المومنینؑ نے مندرجہ ذیل چند جملوں میں اُن کاموں کی تشریح فرمائی جو دوستوں کو ایک دوسرے کے بارے میں انجام نہیں دینے چاہئیں۔ [1]

اگر تم کسی کو دوست رکھتے ہو تو:

(۱) ← اس سے مخالفت اور دشمنی نہ کرو۔
(۲) ← اس کا مذاق نہ اڑاؤ۔
(۳) ← اس سے جھگڑا نہ کرو۔
(۴) ← اس کے ساتھ نامناسب شوخی نہ کرو۔
(۵) ← اسے پست اور حقیر نہ سمجھو۔
(۶) ← اس پر برتری اور فوقیّت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔

---

[1] خصال۔ صدوق۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۹۶

یہ کام دوستی کے مقام سے مناسبت نہیں رکھتے اور دوستوں کے تعلقات بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک دانشمند کا کہنا ہے:

"بیشتر لوگ تمسخر پر مبنی باتیں سننے پر نقصان برداشت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔"

لاطینی زبان کی ایک مثل ہے:

"تمسخر دوستی کا خون کر دیتا ہے۔"

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

- دوست ایک دوسرے پر ناقابلِ تردید اثر چھوڑتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشحالی یا بدحالی کے زمانے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔
- دوستی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد ایمان اور تقویٰ پر ہو اور وہ روحانیّت سے قوّت حاصل کرے اور دوسری دوستیاں اعتماد اور اطمینان کے قابل نہیں ہوتیں۔
- بدکردار اور فاسد لوگوں کی دوستی سے اجتناب برتنا چاہیے کیونکہ ایسی دوستی خواہ مخواہ انسان کو برائیوں میں ملوّث کر دیتی ہے۔
- دوستی کی کچھ حدود ہیں اور ضروری ہے کہ رفاقت کی داغ بیل ڈالنے سے پہلے لازمی آزمائشیں عمل میں لائی جائیں تاکہ بعد میں پشیمان نہ ہونا پڑے۔
- حقیقی دوستوں کی قدر کرنی چاہیے اور دوستی برقرار رکھنے کے لیے انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسلام میں پاکیزگی اور صفائی

اسلامی تعلیمات کا ایک اہم ترین اور دلکش حصہ وہ ہے جس کا تعلق پاکیزگی اور صفائی سے ہے۔

موجودہ دور میں تجربی علوم کی ترقی، تجربہ گاہوں کے وسائل اور گوناگوں سازوسامان کی تیاری سے صفائی کے مسئلے کی اہمیت بخوبی روشن ہوگئی ہے اور اس کا انسان کی صحت سے براہِ راست تعلق واضح ہوگیا ہے۔

عصرِ حاضر میں انسان نے جراثیم اور وائرس کا پتا چلا لیا ہے اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے امراض سے بھی واقف ہوگیا ہے۔

ایک صدی پہلے تک انسان کو بہت سے ایسے مسائل کے بارے میں کوئی علم نہ تھا جنھیں وہ اب عام اور معمولی سمجھتا ہے اور اگر آجکل کے دانشمند صفائی کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں تو یہ کوئی عجیب اور چونکا دینے والی چیز نہیں ہے۔

انھوں نے غیر مرئی دشمنوں کو مسلح آنکھوں اور قوی خوردبینوں سے دیکھا ہے

اور ان میں سے ہر ایک پر بہت سے تجربات کیے ہیں اور اب وہ لوگوں کو ان کے وجود اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سولھویں صدی عیسوی تک اہل یورپ نہ صرف یہ کہ ان مسائل سے واقف نہیں تھے بلکہ ان کی زندگی پاکیزگی اور صفائی سے اس قدر عاری تھی کہ ہر قاری ان کے حالات کا مطالعہ کر کے حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

یورپ کے شہروں میں لوگوں کو حمّام کے بارے میں کوئی علم نہ تھا اور وہ حمّام کی تعمیر کی مخالفت کرتے تھے اور عیسائی پادری بھی اس کی تعمیر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

گھروں میں بیت الخلا نہیں ہوتے تھے اور لوگ اپنی کثافت گلیوں اور سڑکوں پر پھینکا کرتے تھے۔

ان حقائق کے بارے میں یورپ کے بڑے بڑے محققین اور مصنفین نے لکھا ہے۔ مشہور مصنّف ول ڈیورنٹ اپنی کتاب تاریخ تمدّن میں یورپ کی حالت کے متعلق یوں رقمطراز ہے:

"ابتدائی دور کے عیسائی رومی گرم حمّاموں کو مذموم سمجھتے تھے اور اس قسم کے مراکز کو بے راہ روی اور جنسی افراتفری کے گڑھے خیال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ عیسائیت کی تعلیمات بالعموم جسم کی مذمّت اور اس کے ترک کرنے کے بارے میں تھیں اس لیے حفظانِ صحّت کے اصولوں پر عملدر آمد کسی صلے کا حامل نہیں ہو سکتا تھا۔"

ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے:

"تیرھویں صدی میں اہلِ پیرس اپنے بول دان آزادانہ طور پر کھڑکیوں سے نیچے گزرگاہوں پر خالی کر دیتے تھے اور بے چارے راستہ چلنے

والے کو جو واحد ضمانت حاصل تھی وہ صاحبِ خانہ کی تنبیہ تھی جو بلند آواز سے کہتا تھا: (Gar'l'eau) یعنی "تو بھیگ نہ جائے"۔ اس قسم کے غیر متوقع اتفاقات ایک طرح کا عامیانہ مذاق بن جاتے تھے اور یہ صورت مولیر (Moliere) کے زمانے تک موجود تھی۔ عوامی بیت الخلا کا شمار ابھی تک تکلّفات میں تھا۔ ۱۲۵۵ء میں چند عوامی بیت الخلا سن جیمین یانو (San Gimignano) میں موجود تھے لیکن ابھی فلورنس میں ان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لوگ صحنوں میں، سیڑھیوں پر، بالاخانوں کے اوپر سے پیشاب کرتے تھے حتّٰی کہ شاہی محلوں میں بھی بیت الخلا نہیں تھے۔ ۱۵۳۱ء (سولھویں صدی) میں طاعون پھوٹ پڑنے پر ایک خصوصی فرمان کے ذریعے مالکانِ مکان اور منتظمینِ خانہ کو تنبیہ کی گئی کہ ہر گھر کے لیے ایک بیت الخلا تعمیر کریں لیکن لوگوں کی اکثریت نے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہ کیا"۔

صلیبی جنگوں نے جو طویل عرصے تک عیسائیوں اور سرزمینِ مشرق کے مسلمانوں کے مابین جاری رہیں عیسائیوں کو حمّام اور اس کی صفائی اور اہمیت سے روشناس کرایا۔

ول ڈیورنٹ، تاریخِ تمدن میں ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

"صلیبی جنگوں کے ثمرات میں سے ایک مسلمانوں کے گرم حمّاموں کی تقلید میں یورپ میں بھاپ والے عوامی حمّاموں کا رواج تھا۔ کلیسا عوامی گرم حمّاموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا"۔

موجودہ زمانے میں بھی بہت سے یورپین ملکوں میں بیت الخلا میں پانی سے بدن دھونے کی بجائے کاغذ کے بنے ہوئے تولیے استعمال کیے جاتے ہیں اور پاؤں اور بدن کی بدبو کو (Eau de Cologne) اور اس سے ملتی جلتی چیزوں کے ذریعے

چھپایا جاتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ پندرھویں صدی سے لے کر موجودہ زمانے تک یورپین ممالک کی حالت کی ایک جھلک تھی۔

اب ہم کچھ پیچھے جا کر پہلی چودہ صدیوں کی تیرہ و تاریک دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بشریت جہالت کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور تمدن اور علم و دانش سے بالکل بے بہرہ تھی۔ یہی وہ دور تھا جب پیشوایانِ اسلام نے وہ تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کیں جن کا سرچشمہ وحیِ الٰہی تھا۔

انھوں نے "اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ" کا اصولِ عمل اہلِ عالَم کے کانوں تک پہنچایا اور "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" کو جسم اور رُوح کی پاکیزگی کی جانب پہلے قدم کے طور پر پیش کیا۔

امام علی علیہ السّلام لوگوں کو صفائی کی ترغیب دلاتے تھے اور فرماتے تھے:

نِعْمَ الْبَيْتُ الْحَمَّامُ يُذَكِّرُ فِيْهِ النَّارُ وَيَذْهَبُ بِالدَّرَنِ [1]

"حمّام ایک اچھا مکان ہے جس کی گرمی انسان کو اللہ تعالیٰ کی آتشِ غضب کی یاد دلاتی ہے اور بدن کی میل بھی زائل کر دیتی ہے۔"

اسلامی احکام میں استحبابی غسل کو بڑی اہمیّت دی گئی ہے اور تقریباً تمام عیدوں اور متبرّک دنوں میں انھیں مستحبّی اعمال کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔

شہداء کے متبرّک روضوں کی زیارت کے سلسلے میں سب سے پہلے غسل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ احکام ان ممالک میں صادر کیے گئے ہیں جہاں پانی کے لحاظ سے لوگوں کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے حتّٰی کہ موجودہ زمانے میں بھی وہ بڑی محنت

---

[1] وسائل الشیعہ

اور مشقّت سے کنوؤں سے پانی کھینچتے ہیں اور اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

اسلام کے انہی تاکیدی احکام کی بنا پر قرونِ وسطیٰ میں بھی جب اہلِ یورپ مکمّل گندگی میں زندگی بسر کر رہے تھے مسلمان قابلِ توجّہ صفائی اور پاکیزگی سے بہرہ ور تھے۔

"زندگی مسلمانان در قرونِ وسطیٰ" نامی کتاب میں جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے فارسی میں کیا گیا ہے مصنّف نے دسویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک کے اسلامی ممالک کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"اسلام کے ظہور کے بعد عوامی حمّاموں کے استعمال کا رواج پڑ گیا اور ابھی زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ بہت سے مسلمانوں نے بڑے بڑے حمّام تعمیر کرائے۔ شہروں میں ہر کوچے میں ایک یا دو حمّام تھے۔ قصبوں اور دیہات میں حمّام عموماً مسجدوں کے قریب ہوتے تھے۔ بارھویں صدی میں بغداد میں تقریباً پانچ ہزار اور قاہرہ میں ۱۱۷۰ حمّام تھے"

مسلمانوں کی اسلامی احکامات کی جانب توجّہ اس امر کا موجب بنی کہ وہ دنیا کی پاکیزہ ترین قوم بن جائیں۔

اسلام تاکید کرتا ہے کہ مسلمان مسجدوں میں داخل ہوتے وقت جو کہ لوگوں کے اجتماع کا مقام ہیں، بہترین لباس پہنیں، خوشبو لگائیں اور پیاز، لہسن اور بدبودار سبزیاں کھانے سے پرہیز کریں۔ گھروں سے نکلنے سے پہلے اپنی وضع قطع درست کریں، بالوں میں کنگھی کریں اور اپنے لباس اور شکل و صورت کے بارے میں اطمینان کے لیے آئینے سے استفادہ کریں۔

اسلامی تعلیمات میں صفائی کی تمام ترجزئیات کی جانب توجّہ دی گئی ہے اور ان کے بارے میں ضروری رہنمائی بھی فراہم کی گئی ہے۔

محدثین لکھتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص) يَحُثُّ اُمَّتَهٗ عَلَى النَّظَافَةِ وَ يَاْمُرُهُمْ بِهَا [1]

"رسولِ اکرمؐ اپنے پیروؤں کو صفائی اور پاکیزگی کا حکم دیتے تھے اور اس بارے میں انھیں شوق اور رغبت دلاتے تھے۔"

رسولِ اکرمؐ کا ایک اور ارشاد جو زندۂ جاوید اور حسین وجمیل اصولِ عمل کا رتبہ رکھتا ہے یہ جملہ ہے:

اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ وَ الْاِيْمَانُ فِى الْجَنَّةِ [2]

"پاکیزگی ایمان کا جزو ہے اور ایمان بہشت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔"

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اَلطُّهُرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ [3]

"پاکیزگی اور صفائی نصف ایمان ہے۔"

ہم یہاں ان فرائض سے بحث نہیں کر رہے جن کا براہِ راست تعلق لوگوں کی لازمی پاکیزگی سے ہے۔ جسے مسلمان ایک عبادت کے طور پر رتی بھر لاپروائی اور غفلت برتے بغیر انجام دیتے ہیں۔

مثلاً وضو کا مسئلہ جسے مسلمان دن رات میں کئی بار انجام دیتے ہیں اور جس کے ذریعے سر سے پاؤں تک مکمل صفائی وجود میں آتی ہے یا واجب غسل جو مسلمان مرد اور عورتیں وقتاً فوقتاً ایک فریضے کے طور پر انجام دیتے ہیں اور پورا بدن دھوتے ہیں اور اسی طرح نہ ہمیں یہاں مسلمانوں کی ان ذمے داریوں سے بحث کرنا مقصود ہے جو ان

---

[1] کنز الفوائد۔ کراجکی
[2] مستدرک الوسائل۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۱
[3] دعائم الاسلام۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۰۰

پر بدن اور لباس کی مکمّل تطہیر اور نجاستوں سے پرہیز برتنے کے سلسلے میں عائد ہوتی ہیں۔

سرِدست ہم ان احکام سے بحث کر رہے ہیں جو خاصتاً ہدایت اور رہنمائی کا پہلو رکھتے ہیں اور جن میں صفائی کی جزئیات کی جانب توجّہ دی گئی ہے۔

اسلام نے بدن اور لباس پاکیزہ رکھنے کے بارے میں بڑی تاکید کی ہے اور لوگوں کو ان کی صفائی کی دعوت دی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

مَنِ اتَّخَذَ ثَوْبًا فَلْيُنَظِّفْهُ [1]

"انسان کو چاہیے کہ جو کپڑا اس کے زیرِ استعمال ہو اسے ہمیشہ پاکیزہ رکھے۔"

رنگین اور بالخصوص سیاہ رنگ والے لباس میں میل نمایاں نہیں ہوتی۔ اس کے نتیجے میں ممکن ہے کہ انسان مدّت تک میلا لباس پہنے رکھے اور اسے اس بات کا احساس نہ ہو۔

پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ مِنْ لِبَاسِكُمْ شَيْئٌ اَحْسَنُ مِنَ الْبَيَاضِ فَالْبِسُوْهُ [2]

"تمھارے لباسوں میں سے کوئی بھی سفید لباس سے بہتر نہیں۔ تم پہننے کے لیے سفید لباس کا انتخاب کیا کرو۔"

کپڑوں کے دھونے اور پاک کرنے کے بارے میں ائمّہ طاہرین علیہم السّلام سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

نِقَاءُ الثَّوْبِ يَكْبِتُ الْعَدُوَّ وَغَسْلُ الثِّيَابِ يُذْهِبُ

---

[1]، [2] مکارم الاخلاق۔ صفحہ ۱۱۷

اَلْهَمَّ وَالْحُزْنَ [1]

" لباس کی پاکیزگی انسان کے دشمن کو خوار کرتی ہے اور کپڑوں کا دھونا غم واندوہ کو زائل کرتا ہے۔"

رہائش گاہ کے بارے میں اسلام کی تعلیمات میں تاکید کی گئی ہے کہ مسلمان ان کی صفائی کا اہتمام کریں اور ان کی پاکیزگی کا خیال رکھیں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اِكْنِسُوْا اَفْنِيَتَكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ [2]

" اپنے گھر کے سامنے کی جگہ جھاڑو دو اور اسے صاف رکھّو اور یہودیوں کی طرح گندے نہ رہو۔"

امیرالمومنین امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

تَرْكُ نَسْجِ الْعَنْكَبُوْتِ فِى الْبَيْتِ يُوْرِثُ الْفَقْرَ........

وَتَرْكُ الْقُمَامَةِ فِى الْبَيْتِ يُوْرِثُ الْفَقْرَ....... [3]

" مکڑی کا جالا کمرے میں رہنے دینا ناداری لاتا ہے اور کوڑا کرکٹ گھر میں رکھنا انسان کو تہی دستی کی جانب کھینچتا ہے۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

عِشْرُوْنَ خِصْلَةً تُوْرِثُ الْفَقْرَ...... وَوَضْعُ الْقِصَاعِ وَالْاَوَانِى غَيْرَ مَغْسُوْلَةٍ وَتَرْكُ بُيُوْتِ الْعَنْكَبُوْتِ وَوَضْعُ اَوَانِى الْمَآءِ غَيْرَ مُغَطَّاةِ الرُّؤُسِ....... [4]

" ... جن برتنوں میں کھانا کھایا گیا ہو انھیں بغیر دھوئے گندہ چھوڑ دینا،

---

[1] دعائم الاسلام — [2] مکارم الاخلاق ۔ صفحہ ۱۲۵

[3] مشکوٰۃ الانوار — [4] جامع الاخبار

مکڑی کا جالا گھر میں رہنے دینا اور جن برتنوں میں پانی ہو انھیں بغیر ڈھکے چھوڑ دینا ناداری لاتا ہے "

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

لَا تُبِيتُوا الْقُمَامَةَ فِي بُيُوتِكُمْ فَإِنَّهَا مَقْعَدُ الشَّيْطَانِ [1]

" رات کو کوڑا کرکٹ اپنے گھر میں نہ رہنے دو کیونکہ وہاں شیطان کا مقام ہوتا ہے "

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ کوڑا کرکٹ کیونکر شیطان کا مقام ہو سکتا ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں چاہیئے کہ پہلے شیطان کے لغوی معنی سمجھیں اور پھر یہ دیکھیں کہ قرآنِ مجید اور پیشوایانِ اسلام کے اقوال میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

لغت میں شیطان کے کئی معنی ہیں جن میں سے ایک معنی ہر باغی اور سرکش جاندار کے ہیں خواہ وہ انسان ہو یا جن اور خواہ چھوٹا جاندار ہو یا بڑا۔ [2]

قرآن مجید میں بھی لفظ شیطان مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اوّل ابلیس کے بارے میں جو انسانوں کو ورغلانے والا ہے۔ [3]

دوّم منافقین کے متعلق جو بظاہر اسلام قبول کرلیں اور درپردہ دین کے دشمنوں سے تعاون کریں۔ [4]

سوّم وہ اشخاص جن کا شمار انبیائے کرامؑ کے دشمنوں میں ہو۔ [5]

اور چہارم منحرف ہو جانے والے اور گمراہ لوگ جنھیں حزب شیطان کہا جاتا ہے۔ [6]

---

[1] مکارم الاخلاق۔ صفحہ ۱۹۰ [2] المنجد، شطن [3] سورۃ ابراہیم۔ آیت ۲۲
[4] سورۃ البقرۃ آیت ۱۲ [5] سورۃ الانعام۔ آیت ۱۱۲ [6] سورۃ المجادلہ۔ آیت ۱۹

پس ہر وہ موجود جو لوگوں کیلیے انحراف اور بدبختی کے اسباب فراہم کرے اور انھیں فساد اور بدنصیبی کی طرف کھینچے، شیطان ہے۔ خواہ وہ انسان کی شکل میں ہو یا سانپ کی شکل میں، خواہ بہت ہی چھوٹے موجودات اور جراثیم کی شکل میں ہو۔

لہٰذا اگر بعض صورتوں میں ہم لفظ "شیطان" کا اطلاق بیماری کے جراثیم اور وائرس پر کریں تو لغت کے اعتبار سے ایسا کرنا بالکل درست ہوگا۔ ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم یہ کہیں کہ بعض جگہیں یا انسان کے بدن کے بعض نقاط شیطان کی پرورش کی جگہیں اور مقامات ہیں اور ان مقامات سے ہمارا مقصد وہ مجالس ہوں جن میں غیبت اور سازش ہوتی ہو اور فتنہ و فساد کے مشورے ہوتے ہوں اور بدن کے بعض نقاط سے مراد بغل کا اندرونی حصّہ اور مونچھ کے بال اور ناخنوں کا نچلا حصّہ ہو تو دونوں صورتوں میں ہم کوئی غلط بات نہیں کہیں گے کیونکہ سازش اور فساد کی مجالس میں ہمیشہ شیطان موجود ہوتے ہیں جو دوسروں کو برباد کرنے کے منصوبے بناتے ہیں اور مونچھوں اور بغلوں اور ناخنوں کے زیریں حصّوں میں ایک دُوسری قسم کے شیطان یعنی مضرِ صحّت جراثیم اپنا اڈّہ جما لیتے ہیں۔

اہلِ بیت علیہم السّلام کے اقوال میں لفظ شیطان جرثومے کے معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ چونکہ چودہ صدیاں پیشتر لوگ جراثیم سے واقف نہ تھے اور ان کا فہم بھی ان مسائل کے ادراک سے عاجز تھا لہٰذا رہبرانِ اسلام نے، جنھیں لوگوں کی زبان میں اور ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق گفتگو کرنا تھی، اس بے حد چھوٹی مخلوق کو اسی نام سے متعارف کرایا جس سے لوگ بہت واقف تھے اور جسے وہ اپنا خطرناک دشمن سمجھتے تھے۔

پس یہ بات قطعی طور پر واضح ہو گئی کہ اگر رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ جو کوڑا کرکٹ گھر کے مختلف حصّوں سے دن بھر میں جمع ہو جائے اُسے فوراً باہر پھینک دو

اور اسے رات کو اپنے گھر میں نہ رہنے دو کیونکہ یہ شیطان کا مقام ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ کوڑا گھر میں رہ گیا تو نقصان دہ جراثیم جو بیماری اور تکلیف کا بہت بڑا سبب ہیں وہاں اپنا ٹھکانا بنالیں گے اور پھلیں پھولیں گے اور اگر امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ مکڑی کا جالا اور کوڑا کرکٹ گھر میں رہنے دینا ناداری کا موجب ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جراثیم ایسے مقامات پر اپنا گھر بنا لیتے ہیں اور بڑھتے رہتے ہیں اور اہل خانہ کو بیمار کر دیتے ہیں۔ غریبی اور ناداری کا ایک بڑا سبب صحت کی خرابی اور بیماری ہے جو انسان کو کام کاج کے قابل بھی نہیں چھوڑتی اور اس پر دوا دارو کے اخراجات کا بوجھ بھی ڈال دیتی ہے اور عموماً یوں ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کام کاج نہ کر سکے اور اس کے اخراجات بھی کئی گُنا بڑھ جائیں تو وہ ناداری اور تہی دستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اَسْتَرَ وَ اَخْفٰی مَا یُسَلِّطُ الشَّیْطَانَ مِنِ ابْنِ آدَمَ اَنْ صَارَ یَسْکُنُ تَحْتَ الْاَظَافِیْرِ۔ [1]

"سب سے خفیہ راستہ جس کی جانب سے شیطان، انسان پر مسلّط ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ ناخنوں کے نیچے اپنا اڈہ جمالے"۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

لَا یَطُوْلَنَّ اَحَدُکُمْ شَعْرَ اِبْطَیْهِ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَتَّخِذُهٗ مَخْبَأً یَسْتَتِرُ بِهٖ۔ [2]

"اپنی بغلوں کے نیچے کے بال ہرگز نہ بڑھنے دو کیونکہ شیطان اس مقام کو اپنی پناہ گاہ قرار دیتا ہے اور وہاں اپنا گھر بنا لیتا ہے"۔

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۳۳ [2] وسائل الشیعہ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۳۶

تجربہ گاہوں میں جراثیم کی اقسام کی تشخیص کے لیے یا ان کے خلاف جنگ کی غرض سے انھیں ایسے مخصوص برتنوں میں ڈال دیتے ہیں جن میں ان کی مرغوب غذا رکھی ہوتی ہے اور پھر ان برتنوں کو تاریک اور مرطوب مقام پر رکھ دیتے ہیں جو جراثیم کی نشوونما کے لیے مثالی ہوتا ہے۔ یوں تھوڑی سی مدّت میں جراثیم قوی ہو جاتے ہیں اور بہت زیادہ تولیدِ مثل کرتے ہیں۔

یہ طریقِ کار ایک نیا موضوع ہے اور ابھی اسے اختیار کیے ہوئے ایک صدی بھی نہیں گزری لیکن پیشوایانِ اسلام نے اس کی وضاحت چودہ سو سال پہلے فرما دی تھی۔

جراثیم کی نشوونما کے لیے ناخنوں کا نچلا حصّہ بڑا موزوں مقام ہے کیونکہ ہاتھوں کے غذا وغیرہ کے اتّصال کی وجہ سے جراثیم کو اپنی خوراک کا کچھ مواد دستیاب ہو جاتا ہے اور ہاتھوں کی رطوبت اور بدن کی طبعی حرارت بھی ان کی نشوونما اور افزائش میں مدد دیتی ہے اور ان کی وجہ سے انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اگر بغلوں کے بال بڑھ جائیں تو وہ بھی جراثیم کی نشوونما اور افزائش کی تمام شرائط پوری کر دیتے ہیں اور چونکہ ان پر سورج کی دھوپ بھی نہیں پڑتی اور انھیں دھویا بھی گاہے بگاہے ہی جاتا ہے اس لیے نقصان کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

امام علیؑ کی ایک اور روایت ہم تک پہنچی ہے جس میں اس موضوع کی جانب زیادہ روشن اور واضح اشارہ ہوا ہے۔

لَا تُؤْوُوا مِنْدِيلَ الْغَمَرِ فِي الْبَيْتِ فَإِنَّهُ مَرْبِضُ الشَّيْطَانِ[1]

پیشوائے اسلام فرماتے ہیں:

"چکنے اور گوشت والے کپڑے گھر میں نہ رکھو کیونکہ وہ شیطان کی

---

[1] وسائل الشیعہ

جائے آرام اور پناہ گاہ ہے۔"
چکنے اور گوشت والے کپڑے اور تھیلے کی تاریک اور مرطوب سلوٹوں کی اندرونی تہوں میں جن پر کھانے پینے کی کوئی چیز بھی چپکی ہوئی ہو جراثیم کی خوراک، استراحت، رطوبت اور تاریکی کے تمام وسائل مہیا ہوتے ہیں اور یہ مقام ان کی نشو ونما کے لیے بہترین تصور ہوتا ہے۔

ایسی اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں رہبرانِ اسلام نے جراثیم کے وجود کا اشارتاً ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

لَا یُکَلِّمُ الرَّجُلُ مَجْذُوْمًا اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ بَیْنَهُمَا قَدْرُ رُمْحٍ [1]

"کسی کو ایک ایسے شخص سے جو کوڑھ میں مُبتلا ہو گفتگو نہیں کرنی چاہیئے بجز اس کے کہ ان کے درمیان ایک نیزے (تقریباً ڈیڑھ میٹر) کے برابر فاصلہ ہو۔"

طبِّ جدید میں بیکٹیریالوجی (جراثیم شناسی) کے ماہرین نے ثابت کر دیا ہے کہ کوڑھ کے جراثیم کوڑھی سے ڈیڑھ میٹر کے فاصلے تک مسافت طے کرتے وقت ہوا میں کمزور اور کم ہو جاتے ہیں۔

جس زمانے میں امام علیہ السّلام لوگوں کو کوڑھیوں کے قریب جانے سے منع فرما رہے تھے کسی کو یہ علم نہ تھا کہ اس بیماری کی وجہ بے حد ننھے سے موجودات ہیں اور ممکن ہے کہ وہ بیمار شخص سے دوسروں کے اندر سرایت کر جائیں۔

مائیکرو اسکوپ کی ایجاد سے پہلے ان ننھے جانوروں کے وجود کے بارے میں صحیح اطّلاعات میسّر نہ تھیں۔ امراض کی وجوہات کی تشخیص نہیں ہوئی تھی اور بیماریوں

---

[1] طبِ کبیر

کے علاج معالجے کے سلسلے میں جو کوششیں کی جاتی تھیں وہ عموماً غلط ہوتی تھیں۔

مائیکرواسکوپ آنتون وان لی ون ہوک کے وسیلے سے ایجاد ہوئی۔ لی ون ہوک ان پہلے اشخاص میں سے تھا جو ان چھوٹے موجودات کو دیکھنے پر قادر ہوئے جنھیں عام آنکھ سے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ۱۶۸۳ء میں بیکٹیریا کے وجود کے بارے میں اپنی دریافت کا اعلان کیا۔ تقریباً ۲۰۰ سال بعد یعنی ۱۸۶۹ء میں فرانسیسی دانشمند لوئی پاسچر نے یہ ثابت کر دیا کہ ننھے منّے موجودات جنھیں مائیکرواسکوپ کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے بیماریوں کو جنم دیتے اور وہ پہلا شخص تھا جس نے ان دشمنوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔

پاسچر، جسے بہتر وسائل حاصل تھے اور جو سائنسی کاموں کے انجام دینے کی غیر معمولی استعداد رکھتا تھا جراثیم کے ذریعے بیماریاں پیدا ہونے کے اسباب کی جستجو میں مصروف ہو گیا۔

اگر ہم منصفانہ فیصلہ کرنا چاہیں تو ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان مسائل کے سلسلے میں رہبرانِ اسلام کے بیانات کا سرچشمہ وحیِ الٰہی کے علاوہ اور کوئی نہیں اور اس زمانے کے عام انسان ان چیزوں کو جاننے کی استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اب اسی بحث کے سلسلے میں امام علیؑ کے اِس قول کی جانب توجّہ فرمائیے:

لَا تَشْرَبُوا الْمَآءَ مِنْ ثُلْمَةِ الْإِنَآءِ وَلَا مِنْ عُرْوَتِهِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَقْعُدُ عَلَى الْعُرْوَةِ وَالثُّلْمَةِ۔ [1]

"جس برتن سے تم پانی پی رہے ہو (اگر وہ ٹوٹا ہوا ہو تو) اُس کی ٹوٹی ہوئی جگہ سے اور اسی طرح اس کے دستے کی طرف سے پانی مت پیو۔ کیونکہ ان دو جگہوں میں شیطان رہتا ہے۔"

---

[1] المحاسن۔ صفحہ ۵۷۸

اس روایت میں بھی برتن کے ٹوٹے ہوئے مقام اور دستے کے جوڑ کی جگہ آلودگی اور جراثیم کی پیدائش کی جانب اشارہ ہے۔

اہلبیت علیہم السّلام کے اقوال میں ہاتھوں کی پاکیزگی اور صفائی کے بارے میں (بالخصوص کھانا کھاتے وقت) بے حد تاکید اور سفارش کی گئی ہے۔

فقط ہاتھ ہی وہ اعضاء ہیں جو ہم سے بھی اور ہمارے دشمنوں سے بھی اتّصال رکھتے ہیں اور وہ اس معنی میں کہ وہ ہماری آنکھوں اور مُنہ کے اندرونی حصّوں میں بھی داخل ہوتے ہیں اور باہر کی آلودہ چیزوں سے بھی ارتباط رکھتے ہیں۔ وہ کبھی تو ہمارے مُنہ میں روٹی کا لُقمہ اور پھل ڈالتے ہیں اور کبھی موٹر کار کے ہینڈل، جوتوں کے تسموں اور میز کرسی وغیرہ کو چھُوتے ہیں۔ ہاتھوں کی اس مخصوص وضع کی بنا پر اُن کے آلودہ ہونے کا کافی احتمال ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے ہمارے آلودہ ہونے کا احتمال بھی اسی نسبت سے بڑھ جاتا ہے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

مَنْ غَسَلَ یَدَہٗ قَبْلَ الطَّعَامِ وَبَعْدَہٗ عَاشَ فِیْ سَعَۃٍ وَعُوْفِیَ مِنْ بَلْوَیٰ فِیْ جَسَدِہٖ [1]

"جو شخص کھانا شروع کرنے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد اپنے ہاتھ دھوئے وہ اپنی زندگی آرام اور خوشحالی میں گزارے گا اور بیماریوں اور جسمانی تکالیف سے بھی محفوظ رہے گا۔"

ایک اور نکتہ جس پر اس سلسلے میں نگاہ پڑتی ہے یہ ہے کہ جب پیشوایانِ اسلام کھانا کھانے کی غرض سے ہاتھ دھوتے تھے تو پھر کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے حتّٰی کہ اپنے ہاتھوں کو رومال یا تولیے سے بھی خشک نہیں کرتے تھے کیونکہ تولیے اور رومال

---

[1] وسائل الشیعہ - جلد ۱۶ - صفحہ ۵۷۲

میں بھی آلودگی کا احتمال ہوتا ہے۔

عَنْ مُرَازِمٍ قَالَ رَأَيْتُ أَبَا الْحَسَنِ (ع) إِذَا تَوَضَّأَ قَبْلَ الطَّعَامِ لَمْ يَمَسَّ الْمِنْدِيلَ وَإِذَا تَوَضَّأَ بَعْدَ الطَّعَامِ مَسَّ الْمِنْدِيلَ [1]

"مرازم نے کہا کہ میں نے امام موسیٰ بن جعفر علیہ السّلام کو دیکھا کہ آپ جب بھی کھانا کھانے کے لیے ہاتھ دھوتے تھے تو تولیے سے خشک نہیں کرتے تھے لیکن کھانا کھانے کے بعد تولیہ استعمال فرماتے تھے۔"

ایک دفعہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کسی ضیافت میں شریک تھے۔ کھانا کھانے سے پہلے آپ نے ہاتھ دھوئے۔ خادم تولیہ لے کر آیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم نے انہی چیزوں سے ہاتھ دھوئے ہیں [2] یعنی ہاتھ اس لیے دھوئے ہیں کہ وہ خارجی چیزوں سے ٹکراتے ہیں اور اب یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی چیز حتّیٰ کہ تولیے سے بھی ٹکرائیں۔

ایک اور موضوع جس کی جانب توجّہ دینا لازمی ہے وہ مُنہ اور دانتوں کی صفائی ہے۔

مُنہ کے اندر بہت سے جراثیم ہوتے ہیں جن کی تعداد ایک شہر کی آبادی سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ جراثیم مقامی زخموں اور خرابیوں کی موجودگی یا عام جسمانی کمزوری سے استفادہ کر کے بدن اور دانتوں کو بے حد نقصان پہنچاتے ہیں اور بہت سی بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔ ان میں سے بعض جراثیم کی وجہ سے دانتوں میں کیڑا لگ جاتا ہے اور بعض دوسروں کی وجہ سے پائیوریا کی بیماری ہو جاتی ہے اور ان بیماریوں کے بے حد خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بعض ایسے جراثیم بھی ہوتے ہیں جو مسوڑھوں میں ورم پیدا کر دیتے ہیں (یہ جراثیم ہوا، خوراک، ہاتھوں اور دوسری چیزوں سے

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۶۔ صفحہ ۵۷۷ [2] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۶۔ صفحہ ۵۷۲

اتّصال کے ذریعے مُنہ میں داخل ہوتے ہیں اور پھر اپنی نشو ونما کے لیے مناسب حالات پیدا کر لیتے ہیں۔ صحّت مند لوگوں میں قوّت مدافعت زیادہ ہوتی ہے اور ان کا جسم جراثیم کے حملے کے مقابلے میں اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو تو قوّتِ مدافعت کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے اور بیماریاں وجود میں آ جاتی ہیں۔

پیشوایانِ اسلام نے تاکید فرمائی ہے کہ کھانے کے بعد دانتوں کی اندرونی تہوں کو لازمی طور پر خلال کے ذریعے غذائی مواد سے پاک کیا جائے۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

تَخَلَّلُوْا عَلٰى اَثَرِ الطَّعَامِ فَاِنَّهٗ مُصِحَّةٌ لِلْفَمِ وَالنَّوَاجِذِ[1]

"کھانا کھانے کے بعد خلال کرو کیونکہ ایسا کرنا مُنہ کو صحّت مند رکھتا ہے اور دانتوں کو خرابی اور تباہی سے محفوظ رکھتا ہے۔"

غذا کے جو ریزے خلال کے ذریعے دانتوں کی ریخوں سے خارج ہوں انھیں نگلنا نہیں چاہیئے بلکہ بڑی احتیاط سے مُنہ سے خارج کر دینا چاہیئے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

لَا يَزْدَرِدَنَّ اَحَدُكُمْ مَا يَتَخَلَّلُ بِهٖ فَاِنَّ مِنْهُ يَكُوْنُ الدُّبَيْلَةُ[2]

"غذا کے جو ریزے خلال کے ذریعے دانتوں کی ریخوں سے باہر آئیں اُنھیں مت کھاؤ کیونکہ یہی اندرونی زخموں کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔"

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

---

[1] مستدرک۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۰۰ [2] فروع الکافی۔ جلد ششم۔ صفحہ ۳۷۸

مَنْ اَکَلَ فَمَا تَخَلَّلَ فَلَا یَاْکُلْ [1]

"جو شخص کھانا کھانے کے بعد خلال کرے اُسے چاہیئے کہ جو کچھ خلال کے ذریعے باہر آئے اُسے نہ نگلے۔"

دانتوں کی ریخیں خلال کے ذریعے صاف ہوجاتی ہیں اور مُنہ اور دانتوں کے دوسرے حصّے مسواک کے ساتھ اچھّی طرح دھونے اور صاف کرنے چاہئیں۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اَلسِّوَاکُ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ [2]

"دانتوں کو مسواک کرنا انبیائے کرامؑ کا طریقہ ہے۔"

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاکِ مَعَ کُلِّ صَلٰوۃٍ [3]

"اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ میرے پیرو مشقّت اور زحمت سے دوچار ہو جائیں گے تو میں ان پر واجب کردیتا کہ ہر نماز ادا کرتے وقت (یعنی دن رات میں پانچ مرتبہ) مسواک کیا کریں۔"

مسواک کرنے کے طریقے کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے وہی احکام دیے ہیں جنھیں آج کل کے دانتوں کے ڈاکٹر بہترین قرار دیتے ہیں۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

اِسْتَاکُوْا عَرْضًا وَلَا تَسْتَاکُوْا طُوْلًا [4]

"مسواک دانتوں کی قطار کی لمبائی میں نہ پھیرو بلکہ اوپر سے نیچے

---

[1] مستدرک۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۷۷ [2] وسائل الشّیعہ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۴۶

[3] علل الشرایع۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۷۷ [4] مستدرک۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۴

کی جانب کھینچو" تاکہ دانتوں کی ریخیں بھی صاف ہوجائیں اور ان کے گوشوں میں بھی کوئی چیز باقی نہ رہے۔

صفائی کے بارے میں ایک حکم جو بڑی اہمیت کا حامل ہے ناک اور مُنہ کا دھونا ہے۔

جب جراثیم کی دریافت کا اعلان ہوا تو لوگ انھیں دیکھنے کے لیے گرتے پڑتے تجربہ گاہ پہنچے۔ انھوں نے ایک جانب تو خود اپنی آنکھوں سے ان مُضر اور بیماریاں پیدا کرنے والے حیوانات کو مائیکرواسکوپ کے ذریعے دیکھا اور دوسری جانب یہ بھی دیکھا کہ جوش دینے یا حرارت سے جراثیم مر کر ختم ہوگئے۔ وہ لوگ اس غرض سے آئے تھے کہ عمرِ جاودانی حاصل کرلیں یا کم ازکم جراثیم کے شر سے محفوظ رہیں۔ انھوں نے اپنی غذا، لباس، ٹوپیاں حتیٰ کہ لحاف بھی ان چیزوں میں ڈال دیے جو اشیاء کو متعدّی جراثیم سے پاک کرتی ہیں اور انھیں موردِ استفادہ قرار دیا۔ بعد میں ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہوا کا گردوغبار کافی تعداد میں جراثیم ان کے بدلوں تک پہنچاتا ہے اور ہوا کو متعدّی جراثیم سے پاک کرنا بھی آسان نہیں اور دوسری جانب غذا کو اُبالنے سے ان میں سے زندگی کے لیے ضروری مواد کا فقدان ہوگیا اور اچانک محکمۂ اموات نے زیادہ بڑے اعداد و شمار کی نشاندہی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ حیاتین کی کمی کی وجہ سے اموات کی شرح زیادہ ہوگئی ہے۔

ایسا نہ ہو کہ ہم اصل موضوع سے ہٹ جائیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہوا میں کافی تعداد میں جراثیم موجود ہیں اور انسان جو ہر منٹ میں تقریباً سولہ دفعہ سانس لیتا ہے لازماً ہوا میں موجود ان جراثیم کی کچھ مقدار سانس کے ذریعے اس کی ناک کے نتھنوں میں پہنچتی ہے لہٰذا انسان ہی نہیں بلکہ ہر اُس حیوان کے نتھنوں میں جو سانس لیتا ہے جراثیم کی ایک مقدار موجود ہوتی ہے جیسا کہ امام الرّضا علیہ السّلام

نے تیرہ صدیاں قبل اس موضوع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

عَلٰی کُلِّ مِنْخَرٍ مِنَ الدَّوَابِّ شَیْطَانٌ [1]

"جو حیوان سانس لیتا ہے اس کی ناک کے نتھنوں میں شیطان موجود ہوتا ہے۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

لِیُبَالِغْ اَحَدُکُمْ فِی الْمَضْمَضَةِ وَالْاِسْتِنْشَاقِ فَاِنَّهٗ غُفْرَانٌ لِمَا تَکَلَّمَ بِهِ الْعَبْدُ وَمُنْفِرَةٌ لِلشَّیْطَانِ [2]

"تم میں سے ہر شخص کو چاہیئے کہ مضمضہ اور استنشاق کرے کیونکہ ایسا کرنا بات کرتے وقت مُنہ کو بدبُو سے پاک رکھتا ہے اور جراثیم کو ختم کر دیتا ہے۔"

مضمضہ کے معنی پاک صاف پانی سے کُلّی کرنے اور مُنہ کے گوشوں کو دھونے کے ہیں اور استنشاق سے مراد پانی اوپر کھینچ کر ناک کو دھونا ہے۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اَلْمَضْمَضَةُ وَالْاِسْتِنْشَاقُ سُنَّةٌ وَطَهُوْرٌ لِلْفَمِ وَالْاَنْفِ [3]

"مضمضہ اور استنشاق ایک پسندیدہ دینی طریقہ ہے جس کے ذریعے منہ اور ناک پاک رہتے ہیں۔"

اب تک جتنا ذکر ہوا وہ صفائی کے مسئلے کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک بہت ہی مختصر نمونہ تھا۔ اس سے بیشتر مطالعہ اور شواہد نقل کرنے کے لیے فرصت اور کچھ اور شرائط کی موجودگی ضروری ہے۔

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۱۴ [2] ثواب الاعمال۔ صفحہ ۱۱

[3] خصال صدوق۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۵۶

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں فقہی کتابوں کا پہلا باب جو باقی تمام ابواب سے زیادہ مفصّل ہے طہارت کے سلسلے میں ہے۔ اس باب میں صفائی کے مسئلے کی تمام جزئیات پر بڑی دقیق بحث کی گئی ہے۔

ایک نکتہ جس کی جانب بحث ختم کرتے وقت اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام نے صفائی کے سلسلے میں بھی دوسرے مسائل کی طرح بدن اور رُوح دونوں کی جانب توجّہ دی ہے اور لوگوں کو بدن اور رُوح کی پاکیزگی کی ایک ساتھ دعوت دی ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو توبہ اور گناہ سے اظہارِ ندامت کے ساتھ اپنی رُوح کو پاک کرتے ہیں اور ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو طہارت اور صفائی کے ذریعے اپنے بدن کو غلاظت سے محفوظ رکھتے ہیں۔" [1]

اگر ہم اسلامی تعلیمات پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ غلاظتیں دو قسم کی ہوتی ہیں اور ان کی صفائی بھی دو طرح انجام پاتی ہے۔

ایک ظاہری غلاظت ہوتی ہے جو پانی، آگ، سورج اور استحالہ وغیرہ سے پاک ہو سکتی ہے۔

دوسری روحانی غلاظت ہوتی ہے جسے دوسرے ذریعوں سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جو شخص کسی مسلمان پر تہمت اور افترا باندھے اور اس کے رُتبے اور آبرو کو خطرے میں ڈالے اُسے چاہیئے کہ اُس کی تسلّی کے مطابق اس سے معافی مانگے۔ جو شخص دوسرے کے مال میں تجاوز کرے اور بلا کسی جواز کے اس کا حق چھین لے یا جوئے کے ذریعے دوسروں کے مال پر قبضہ کرلے اُسے چاہیئے کہ وہ مال مالک کو واپس کرے اور جو شخص دوسرے

---

[1] سورۃ البقرۃ - آیت ۲۲۲

کو فریب دے اور گمراہ کرے اُسے چاہیئے کہ اسے گمراہی سے ہٹا کر دوبارہ راہِ راست پر ڈالے اور بعدازاں اپنے بُرے کاموں سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے یعنی یہ پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ بُرے کاموں سے باز رہوں گا اور اپنے سابقہ گناہوں کا اعادہ نہیں کروں گا۔

قرآنِ مجید نے آیۂ شریفہ: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ میں انہی دو موضوعات کی جانب اشارہ فرمایا ہے اور اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ جو لوگ اپنی روح اور جسم کی پاکیزگی کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے فرائض انجام دیتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی اُنھیں دوست رکھتا ہے۔

بحث کے خاتمے پر ہم خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم حقیقی پاکیزگی سے بہرہ ور ہو سکیں اور دنیا اور آخرت کی سعادت اور نیک بختی حاصل کریں۔

اِسلام میں تربیّت کا انداز

افراد کی مُثبت صلاحیّتوں کی تقویّت اور ان کی مُضر اور ناجائز خواہشات کی سرکوبی کے لیے لازم ہے کہ انھیں قابل معلّم میسّر ہوں اور وہ خود بھی اپنے کردار کی تعمیر پر بھرپور توجّہ دیں تاکہ انھیں حقیقی نیک بختی اور انسانی کمال حاصل ہو۔

تعلیم و تربیّت کے بغیر کوئی شخص انسانیّت کے شایانِ شان کمال کو نہیں پہنچ سکتا اور اس کی اندرونی مثبت صلاحیّتیں بارآور اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتیں۔

انسانی صلاحیّتوں کی نشوونما فقط بولنے، سُننے اور پڑھنے سے ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ بہت سے ایسے افراد ہوتے ہیں جو نیک کاموں کو پہچانتے ہیں لیکن خود نیک نہیں ہوتے اور برائیوں کی سُوجھ بُوجھ بھی رکھتے ہیں لیکن خود بُرے ہوتے ہیں۔

باغبان پھولوں اور درختوں کا ہر لحظہ خیال رکھتا ہے اور ان کی صحیح پرداخت کے لیے جو وسائل میسّر ہوں اُنھیں استعمال میں لاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی شاخوں اور کانٹوں کو کاٹ ڈالتا ہے، کبھی کبھی چھوٹے پودوں کے لیے پناہ گاہ تیار کرتا ہے،

اور ان کی نشو و نما کے لیے ہر ممکن وسیلے سے کام لیتا ہے۔

تعلیم و تربیّت کے ذمّے دار با صلاحیّت افراد کو چاہیئے کہ لوگوں کی تربیت کے لیے عملی اقدامات کریں۔ انھیں قدم بقدم ساتھ لے کر چلیں اور خوش بختی اور فضیلت کے راستوں کی جانب ان کی رہنمائی کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے کردار کی تعمیر کے لیے فقط زبانی وعظ کرنا اور اچھے کاموں کی تعریف و توصیف کرنا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ خود اپنے اعمال سے مثال پیش کی جائے اور دوسروں سے اس کی مشق کرائی جائے۔

سبھی جانتے ہیں کہ بائیسکل پر سواری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس کا ہینڈل دونوں ہاتھوں سے پکڑے، گدّی پر بیٹھے اور پیڈلوں کو پاؤں کے ذریعے حرکت دے اور دائیں یا بائیں جانب کے لیے ہینڈل کو اسی جانب گھمائے لیکن فقط یہ باتیں جاننے سے کوئی شخص بائیسکل کی ٹھیک ٹھیک سواری نہیں کر سکتا بلکہ ایک مدّت تک مشق ضروری ہے تاکہ وہ اس سادہ اور معمولی سواری سے مستفید ہو سکے۔

زندگی کے مسائل میں بھی معلّمین کی رہنمائی اور انسان کی اپنی ریاضت ضروری ہے تاکہ لوگ ہر صورت میں اپنی ذمّے داریوں سے خود بخود عہدہ برآ ہو سکیں۔

ہماری تربیّت کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ والدین، اساتذہ، واعظین، علما اور دوسرے تمام لوگ جو کسی نہ کسی قسم کی تعلیم دیتے ہیں اپنی دانش تو ہماری تحویل میں دے دیتے ہیں اور ہمیں ہماری ذمّے داریوں سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ہمیں بر وقت یہ بتلائے کہ جو کچھ میں تمھیں بتا چکا ہوں اس کے کرنے کا موقع یہ ہے۔

لوگوں کی تربیّت کے سلسلے میں مرحوم آیت اللہ حاج شیخ جعفر کاشف الغطا جس طریقے پر عمل کرتے تھے وہ بڑا مؤثّر اور قابلِ تقلید ہے۔ مثلاً ان کی خواہش تھی کہ اپنے جوان بیٹے کو سحر خیزی اور نمازِ تہجّد پڑھنے کی جانب اس انداز سے مائل کریں کہ وہ دِلی

شوق کے ساتھ اس عادت پر ساری عمر کاربند رہے۔
ایک دن وہ اذانِ صبح سے پہلے بیٹے کے بستر کے پاس گئے اور اسے جگا کر کہا کہ اُٹھو تاکہ ہم جا کر امیر المومنین امام علی علیہ السّلام کے حرمِ مطہر کی زیارت سے مشرّف ہوں جوان بیٹے نے اپنی خواب آلود آنکھیں مَلیں اور کہا:
"بسر و چشم! آپ چلیں میں بھی آتا ہوں"
باپ نے کہا: "نہیں۔ میں یہیں کھڑا ہوں تاکہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں"
بیٹا اُٹھا، وضو کیا اور باپ کے ہمراہ حرمِ مطہّر کی جانب روانہ ہوگیا۔
حرم میں سامنے ہی ایک فقیر بیٹھا تھا جس نے دستِ سوال لوگوں کی جانب دراز کر رکھا تھا۔ باپ نے بیٹے سے پوچھا:
"بیٹا! یہ شخص یہاں کیوں بیٹھا ہے؟"
اس نے جواب دیا: "بھیک مانگنے اور لوگوں سے مدد حاصل کرنے کے لیے"
پھر باپ نے سوال کیا:
"تمھارا کیا خیال ہے۔ یہ کتنی رقم جمع کرے گا؟"
بیٹے نے کہا: ممکن ہے چند درہم کمالے"
باپ نے کہا:
"کیا اسے اتنی رقم یقیناً ہاتھ آجائے گی؟"
بیٹا بولا: "قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ رقم حاصل ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے خالی ہاتھ گھر لوٹنا پڑے"
جب باپ نے دیکھا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے لیے میدان ہموار ہو گیا ہے تو یوں گویا ہوا:
"دیکھو میرے بیٹے! یہ فقیر ایک مشکوک دنیاوی منافع حاصل کرنے کے لیے

جس کے بارے میں اسے خود بھی یقین نہیں ہے رات کو اس وقت یہاں آیا ہے اور اس نے دستِ سوال دراز کیا ہے۔ اگر تمھیں واقعی اس ثواب کے متعلّق یقین ہے جو اللہ تعالیٰ نے سحر کے وقت جاگنے اور نمازِ تہجّد ادا کرنے کے لیے مقرّر فرمایا ہے اور تم ائمّۂ طاہرین علیہم السلام کے اقوال کو بھی درست مانتے ہو تو پھر اس کام کے انجام دینے میں سستی کیوں برتتے ہو؟"

اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا کہ بیٹے نے تمام عمر سحر خیزی، اور نمازِ شب کی ادائیگی ترک نہ کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس لائق معلّم اور دانشمند باپ نے ایسا میدانِ عمل پیدا کر دیا جس کی یاد بیٹے کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہی اور جس نے اسے یہ نیک کام انجام دینے پر آمادہ کر دیا۔

لائق معلّم کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کو بار بار نیک کام کرنے کی جانب راغب کریں تاکہ انھیں عادت پڑ جائے اور وہ خود بخود اور بغیر کوئی تکلیف محسوس کیے یہ کام انجام دینے لگیں۔

امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اَلْعَادَةُ طَبْعٌ ثَانٍ [1]

"عادت انسان کے لیے دوسری طبیعت کا حکم رکھتی ہے۔"

زندگی کے مختلف شعبوں میں عادات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مشق اور تکرار کی بدولت لوگوں کو بہت سے سخت اور طاقت فرسا کاموں کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ انھیں بڑی آسانی سے انجام دے دیتے ہیں۔

اگر معاشرے کے سرپرست اور رہنما لوگوں کو صحیح تربیّت دے کر ان میں نیک کام کرنے کی عادت ڈالیں اور مسلسل توجّہ سے انھیں اچھے کاموں کا خوگر بنائیں تو رفتہ رفتہ

---

[1] غرر الحکم۔ صفحہ ۲۶

معاشرے کو ایک تازہ رونق اور نئی زندگی حاصل ہوجائے گی اور اس کے افراد شعوری یا غیر شعوری طور پر نیکیوں کی جانب مائل ہوجائیں گے۔

ظاہر ہے کہ معلّمین، لوگوں کو صحیح تربیّت دینے میں اُسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ جو کچھ کہیں اس پر خود بھی عمل کریں اور درحقیقت ان کا اپنا کردار دُوسروں کے لیے ایک مثال ہو کیونکہ اگر وہ فقط زبان اور قلم سے لوگوں کو انسانیت اور نیک صفات کی دعوت دیں لیکن ان کا عمل ان کے قول سے ہم آہنگ نہ ہو تو ایسی نصیحتوں کا نتیجہ بالکل برعکس برآمد ہوگا۔

امام علی علیہ السّلام نے نہج البلاغہ میں تربیّت کنندگان کی اس پرورش پر پُرزور تنقید کی ہے اور ان پر لعنت بھیجی ہے:

لَعَنَ اللهُ الآمِرِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ التَّارِكِيْنَ لَهُ وَ النَّاهِيْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ الْعَامِلِيْنَ بِهِ

"ان اشخاص پر اللہ کی لعنت ہے جو لوگوں کو اچھے اور پسندیدہ کاموں کی دعوت دیتے ہیں لیکن خود انھیں انجام نہیں دیتے اور ان اشخاص پر اللہ کی نفرین ہے جو دوسروں کو بُرے کاموں پر ٹوکتے ہیں لیکن خود ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔"

افراد کی تربیّت میں جو چیز باقی سب چیزوں سے زیادہ مؤثر ہے وہ اچھی مثالوں کا مشاہدہ کرنا ہے یعنی جب نوجوان یا دوسرے لوگ خود اپنی آنکھوں سے اپنے معلّمین اور سرپرستوں کی پسندیدہ اور مخلصانہ روش دیکھتے ہیں تو بے اختیار اچھائیوں کی طرف مائل ہوجاتے ہیں اور جن پسندیدہ صفات کا نمونہ ان میں پاتے ہیں خود بھی انہی سے متّصف ہوجاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رہبرانِ اسلام نے تاکید فرمائی ہے کہ مسلمان اپنی صحیح اور

معقول روش کے ذریعے دوسروں کو پاکیزگی اور فضیلت کی دعوت دیں۔

امام جعفر الصادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

کُوْنُوْا دُعَاۃَ النَّاسِ اِلَی اللہِ بِغَیْرِ اَلْسِنَتِکُمْ

"لوگوں کے معلّم اور ہدایت کنندہ بنو۔ زبان سے نہیں بلکہ اپنے اعمال، رفتار اور کردار سے"

جو پند و نصیحت کانوں کے راستے انسان کے قلب تک پہنچے وہ یقیناً مؤثّر ہوتی ہے لیکن اس کا اثر محدود اور وقتی ہوتا ہے لہٰذا اگر وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی مثال نہ ہو جس کی بدولت لوگ عملاً اس وعظ و نصیحت پر عملدر آمد ہوتا دیکھ لیں اور اس کی پیروی کریں تو فقط وعظ کافی نہیں ہے۔ وہ مثال ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو، ان کے قلب اور رُوح کو حرکت میں لائے اور ان کے سوئے ہوئے احساسات کو بیدار کر دے۔ ایسی ہی عمدہ اور مؤثّر مثال دل پر گہرا اثر کرتی ہے اور اس کا شمار عظیم ترین تربیتی محرّکات میں ہوتا ہے۔

جیسا کہ قرآنِ مجید نے صریح طور پر فرمایا ہے رسولِ اکرمؐ کو پہلی ذمّے داری یہ سونپی گئی تھی کہ آپ لوگوں کے نفوس کا بُرائیوں سے تزکیہ کریں اور انھیں علم و حکمت کی تعلیم دیں:

"اللہ نے باایمان لوگوں پر احسان کیا کہ خود ان میں سے ایک رسول مبعُوث کیا تاکہ وہ اللہ کی آیتیں انھیں پڑھ کر سُنائے، انھیں بُرائیوں سے پاک کرے اور ان کو علم اور حکمت سکھائے" [1]

مندرجہ بالا آیت اور اسی جیسی دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ نے تربیّت کے مسئلے کو تعلیم کے مقابلے میں اوّلیّت دی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ خوش بختی کی جانب

---

[1] سورۂ آلِ عمران - آیت ۱۶۴

لوگوں کا پہلا قدم ان کے نفوس کا تزکیہ اور تربیت ہے اور تعلیم کا نمبر بعد میں آتا ہے۔

دینی تربیت اور رُوحانی بنیادوں کے استحکام کے بغیر علم و دانش "تیغ دادن در کفِ زنگی مست"، کے مترادف ہے اور تجربہ بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔

موجودہ دَور کی نام نہاد متمدّن دُنیا علم و دانش اور صنعت و حرفت کے اسلحہ سے لیس ہے لیکن روحانی تربیت سے بے بہرہ ہے۔ آئے دن کی کشمکش، لڑائیاں، بمباریاں، ویرانیاں، جرائم اور سینکڑوں دوسری بُرائیاں روحانی تربیت کے اسی فقدان کا نتیجہ ہیں جو لوگ اس علم و دانش اور صنعت و حرفت سے بہرہ مند ہیں اگر وہ کریم النفس ہوتے اور ایمان اور روحانیّت کے مالک ہوتے تو وہ تخریب کاری اور فساد کی بجائے بنی نوعِ انسان کی بہتری کے بارے میں سوچتے اور ان عظیم مصارف کو پسماندہ اقوام کے مصائب دُور کرنے اور ان کی ترقی کے لیے وقف کر دیتے تاکہ انسانیّت کو بیماری اور بھوک سے نجات مل جاتی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں لائق رہنماؤں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر چیز سے پہلے لوگوں کی تربیت کی کوشش کریں اور قبل اس کے کہ وہ سائنس اور مشینی پیداوار سے لیس ہوں انھیں ایمان اور روحانیّت کی قوّت سے آراستہ کریں۔

اپنی آسمانی ماموریت کی بنا پر اسلام کے جلیل القدر رسولؐ نے لوگوں کی صحیح اور جامع تربیت کا بیڑا اٹھایا اور اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش فرمائی۔ آپ نے اپنے کردار سے لوگوں کو عظیم ترین تربیتی درس دیا۔ آپ نے تواضع کو عملاً رواج دیا۔ آپ سبھی کو سلام کہتے تھے اور لوگوں سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے تھے۔

آنحضرتؐ لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے اور ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کی باتیں پوری توجّہ سے سنتے تھے۔ نووارد لوگوں کا احترام کرتے تھے۔ ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنی جگہ انھیں دے دیتے تھے۔ ضعیف اور نادار لوگوں

کے ساتھ مل کر بیٹھتے اور اپنے آپ کو ان کے دُکھ سُکھ میں شریک کرتے تھے۔ لوگوں کی تکالیف میں ان سے ہمدردی کرتے تھے۔ دوسروں کو اپنے آپ پر مقدّم رکھتے تھے۔

امام علی علیہ السّلام جو رسولِ اکرمؐ کے مکتب کے تربیّت یافتہ اور خود بھی بنی نوعِ انسان کے عظیم معلّم ہیں فرماتے ہیں:

"میں نے لوگوں کو کسی نیک کام کی دعوت نہیں دی ماسوا اس کے کہ ان سے پہلے میں نے وہ کام خود انجام دیا۔"

اگر آپ عدالت کے بارے میں کچھ ارشاد فرماتے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ خود عادل تھے اور اپنے عادلانہ طور طریقوں سے لوگوں کو عدل و انصاف کا سبق دیتے تھے۔ آپ پوُری قوّت سے ظالموں اور سرکشوں کی سرکوبی کرتے اور مظلوموں کو ایک مہربان باپ کی طرح پناہ دیتے تھے۔

آپ مسلمانوں کے مابین ہر معنی میں مساوات ملحوظ رکھتے تھے۔ کمزور لوگوں کا حق انھیں دلوانے اور طاقتور اشخاص کی زیادتیوں کا پوُری شدّت سے سدِّباب فرماتے تھے۔ آپ لوگوں کو دنیا پرستی سے منع کرتے تھے اور خود زُہد اور روحانیّت کا مجسّمہ تھے۔ آپ لوگوں کو کام اور محنت کی ترغیب دیتے تھے اور خود بھی بارآور اور مفید کاموں کے سلسلے میں بڑی سنجیدگی سے کوشش فرماتے تھے۔

آپ لوگوں کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے چشم پوشی کرتے تھے۔ آپ کے مکتب کے شاگردوں نے بھی یہ عملی اسباق اپنے پیشوا اور بزرگوار استاد سے سیکھ لیے تھے اور ہمیشہ ان کے مطابق عمل کرتے تھے۔

حضرت مالکِ اشتر جو ایک قوی اور توانا شخص تھے امام علیؑ کے مکتب کے تربیّت یافتہ تھے۔ ایک دن کوفہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک غیر تربیّت یافتہ کاروباری شخص نے جو اُن کی ذات، قوّت اور رُتبے سے ناواقف تھا تمسخر اور تحقیر کے طور پر

کچھ کوڑا کرکٹ ان پر پھینک دیا۔

اُس شخص کے ہمسائے نے اُس سے پُوچھا:

"جس شخص پر تم نے کوڑا کرکٹ پھینکا ہے کیا تم اسے جانتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا: "نہیں! یہ تو کوئی بے نوا اور نادار مسافر تھا"

دوسرے نے کہا:

"تم پر خدا کی مار! یہ سپہ سالارِ اسلام حضرت مالکِ اشتر تھے"

حضرت مالک کا نام سُن کر وہ شخص بے حد مضطرب اور پریشان ہوا اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ چنانچہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے اُس نے حضرت مالک کی تلاش میں دوڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔

پُوچھتے پُوچھتے وہ مسجدِ کوفہ میں پہنچا جہاں اس کی ملاقات حضرت مالکِ اشتر سے ہوگئی۔ وہ اُن کے قدموں پر گر پڑا اور معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ سے واقف نہ تھا۔ آپ مجھے بخش دیں اور میری خطا سے درگزر فرمائیں۔

حضرت مالک نے کمال کریم النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے مُشفقانہ سلوک کیا اور کہا:

"میں نے تمھاری غلطی معاف کر دی تھی اور مسجد میں چلا آیا تھا تاکہ نماز پڑھوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگوں کہ وہ بھی تمھارے گناہ سے درگزر فرمائے اور تمھیں بخش دے"

یہ کام ایک عملی تربیّت تھی اور ایک ناقابلِ فراموش سبق تھا جو حضرت مالکِ اشتر نے اس شخص کو دیا اور اُسے ہمیشہ کے لیے ایسی غلطیوں سے متنبّہ کر دیا۔

مکتبِ اسلام کے تربیّت یافتہ بزرگوں میں اس قسم کے عملی درس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور عالم بشریّت کے بزرگ ترین معلّم نے بنی نوعِ انسان کی جو درخشاں

خدمات انجام دی ہیں ان میں سے ایک اس مکتب کا قیام اوران تعلیمات کا پیش کرنا ہے۔

اپنے گرانقدر دینی لائحۂ عمل کے ذریعے رسولِ اکرمؐ نے اپنے زیرِسایہ تربیّت پانے والوں کی تمام ناپسندیدہ صفات کا قلع قمع کر دیا اوران کی بجائے پسندیدہ صفات اور انسانی عادات ان میں پیدا کر دیں۔ آپ نے انھیں تکبّر، خود غرضی، کینہ، بدخوئی، بدکرداری، حقارت اور ذلّت سے پاک کر دیا اوران خامیوں کی بجائے انھیں تواضع، انسان دوستی، موَدّت، خُوش خوئی، پاکیزگی، عزّتِ نفس اور دلاوری کی خوبیوں سے مالامال کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اسلامی تعلیمات کو موجبِ زندگی قرار دیا ہے اوراہلِ عالَم کو سفارش کی ہے کہ وہ ان احکام کی جانب توجّہ دیں اور حقیقی زندگی کے حصُول کی خاطر ان پر پوُری پوُری پابندی سے عمل کریں۔

"اے ایمان والو! اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ تمھیں جن حیات بخش تعلیمات کی دعوت دیتا ہے ان کا مثبت جواب دو اورانھیں دل و جان سے سنو اوران پر عمل کرو۔" [1]

اس نکتے پر بھی توجّہ دینی چاہئیے کہ کوئی تربیّت دینی تربیّت کی مانند مؤثّر اور قابلِ اطمینان نہیں ہے۔

ڈاکٹر دہدی کی نیا اپنی کتاب "علوم جنائی" میں کہتے ہیں:

"یونانی فلسفی نے درست کہا ہے کہ "تربیّت سے بڑھ کر اور کوئی فن الہامی نہیں ہے" کیونکہ صحیح تربیّت کے زیرِسایہ انسانیّت کا بلند مقام حاصل کیا جاسکتا ہے اور جہالت، ناداری اور غلامی کی قید سے چھٹکارا پایا جاسکتا ہے۔ انقلابِ فرانس کی عظیم شخصیّت جارج جیکس ڈانٹن [2]

---

[1] سورۃ الانفال۔ آیت ۲۴ [2] (Georges Jacques Danton)

نے غلط نہیں کہا تھا کہ " روٹی کے بعد تعلیم و تربیت قوم کی پہلی ضرورت ہے"۔ صحیح تربیت کے بغیر اجتماعی زندگی میسّر نہیں آسکتی"۔

دینی تربیت سے بڑھ کر کوئی تربیت انسان کو گھٹیا صفات کے شر سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ نورِ ایمان یعنی وہ حقیقی اعتقاد جو علم و دانش کی بنیاد پر استوار ہو ایک قوم کی رہنمائی راہِ راست کی جانب کر سکتا ہے۔ ایمان واقعی تمام اخلاقی دُکھوں کی دوا ہے۔ اگر آپ اپنی قوم کو بُری خصلتوں سے پیدا ہونے والے مصائب سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو لوگوں کے دلوں میں قوّتِ ایمان کو مضبوط کیجیے۔ ایمان انسان کے دل کو امید کے نور سے منوّر کرتا ہے اور زندگی کا بنیادی رُکن اُمّید ہی ہے۔

زندگی میں درپیش آنے والی مشکلات پر فقط ایمان کے زیر سایہ اور عقل کی رہنمائی میں آہنی ارادے کے ذریعے ہی قابو پایا جاسکتا ہے۔

فرانسیسی فلسفی اور مصنّف ہنری برگساں (Henry Bergson) کہتا ہے :

"انسان کی بہتری خدا کی جانب لوٹ جانے میں ہے"۔

جو شخص ہمیشہ خالقِ حقیقی کی جانب متوجّہ ہو وہ سختیاں برداشت کرنے کے لیے دخترِ رز کا محتاج نہیں ہوتا اور جو ایمان کے نشے میں سرشار ہو اُسے شراب کے مصنوعی اور عارضی سُرور کی ضرورت نہیں پڑتی لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ شرابخانے میں جاکر ڈیرہ جمائے اور اپنے آپ کو زوالِ عقل میں گرفتار کرا دے۔

مشہور امریکی مصنّف ڈیل کارنیگی جس کی متعدّد تصانیف نے لوگوں کو بے حد متاثّر کیا ہے کہتا ہے :

"جو لوگ روحانی عذاب میں مبتلا ہیں اور پاگل خانوں میں نالہ و فریاد کر رہے ہیں ان میں ہزاروں افراد ایسے ہیں کہ اگر وہ زندگی کی جنگ میں تنہا رہ جانے کی بجائے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں دستِ دعا بلند کرنے

تو ممکن تھا کہ نجات پا جاتے۔"

ہم کہتے ہیں کہ اگر انھیں شروع ہی سے ایسی تربیت ملتی اور ان کے سینے ایمان کی شمع سے منوّر ہوتے تو ان کے دلوں میں توہمات اور روحانی عذاب کے اثر و نفوذ کا امکان ہی باقی نہ رہتا۔ انسان کو اپنے روحانی علاج کی تاثیر سے غافل نہیں رہنا چاہیے جب کبھی قلب کی تیرگی اور افسردگی کا علاج کرنا مقصود ہو اس کی مؤثر ترین دوا خالقِ حقیقی کی جانب رجوع کرنا ہے۔

ایمان کا چراغ لوگوں کے دلوں میں روشن کرو کیونکہ تمام معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کے خلاف جنگ کے لیے ایمان مؤثر ترین حربہ ہے۔

"اسلام اوہام، خرافات، ظلم، جہالت، ناداری اور غلامی کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ اس نے انسانوں کو آزادی اور حرّیت سے روشناس کرایا۔ یہ ایک حقیقی آزادی تھی جو آسائش، فیّاضی، شجاعت، عِفّت، کریم النّفسی، سلامتی اور خوشی سے پیوست تھی۔ یہ آزادی ان معنوں میں تھی کہ اندرونی بُتوں یعنی شہوت، غضب، ہوا و ہوس اور ہر اُس چیز کی غلامی ترک کر دی جائے جو بغیر کسی استحقاق کے انسان سے اپنی تعظیم کرانا چاہتی ہو۔"[1]

بعض مفکّرین خیال کرتے ہیں کہ تربیت، مذہب کے سہارے کے بغیر انسان کو اخلاقی اور اجتماعی بدبختیوں سے نجات دلا سکتی ہے اور معاشرے کی خوش نصیبی کی ضمانت دے سکتی ہے حالانکہ تجربے کا فیصلہ اس کے خلاف ہے۔

مغرب کے صنعتی اور متمدّن ممالک میں پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک لوگوں کو تربیت کے اصول تجربے کار معلّمین کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں اور اس کے باوجود ان کے اجتماعی اور انفرادی مصائب اور بدبختیوں میں دن بدن اضافہ ہو

---

[1] علومِ جنائی۔ ڈاکٹر کی نیا۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۰۳۷

رہا ہے اور صورت یہ ہے کہ ان کی اصلاح حکومتوں کے اختیار سے بھی باہر ہے۔

جان کینیڈی (Kennedy) نے ۱۹۶۲ء میں اعلان کیا تھا:

"امریکہ کا مستقبل ہولناک ہے کیونکہ نوجوان بلا روک ٹوک شہوانی خواہشات میں غرق ہیں جو ذمّے داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں انھیں بخوبی انجام دینے پر آمادہ نہیں۔ مثلاً اگر سات نوجوانوں کا انتخاب عسکری خدمت کے لیے کیا جائے تو ان میں سے چھ نالائق اور سُست ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ شہوت رانی کی بنا پر ان کی جسمانی اور روحانی استعداد میں کمی آجاتی ہے۔"

کینیڈی کی طرح خروشیف (Khrouchtehev) نے بھی ۱۹۶۲ء میں یوں اظہارِ خیال کیا:

"سوویت یونین کا مستقبل خطرے میں ہے اور نوجوانوں کا آنے والا دَور قطعاً اُمّید افزا نہیں کیونکہ وہ نفسانی خواہشات میں گرفتار ہو گئے ہیں۔"

پولیس کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۷ء میں دس ہزار سے زیادہ افراد نے مغربی جرمنی میں خودکشی کرلی۔ علاوہ ازیں اسی سال جرمنی کے چھ ہزار سے زیادہ مَردوں اور سات ہزار سے زیادہ عورتوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں بچا لیا گیا۔

امریکی نوجوانوں میں مُسکّن دواؤں کا استعمال وحشتناک حد تک بڑھ گیا ہے ماضی قریب میں نیو یارک کی پولیس نے ۳۸ ایسے جوانوں کی لاشیں برآمد کی ہیں جن کی عمریں ۱۶ اور ۳۵ سال کے درمیان تھیں اور جو مُسکّن مواد کے استعمال کے زیرِ اثر ہلاک ہو گئے۔ اس مواد کا شکار ہونے والوں میں سے بعض کو تو اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ اپنے بازوؤں سے سرنج بھی نکال لیں۔ مُسکّن دواؤں کے عادی اشخاص میں ہیروئن استعمال کرنے والے پہلے نمبر پر آتے ہیں۔ موجودہ وقت میں فقط نیو یارک میں ایک لاکھ اشخاص

ہیروئن کے عادی ہیں اور ہر آٹھ افراد میں سے ایک شخص مارفیا استعمال کرتا ہے۔

دولت مند طبقے میں ان دواؤں کے استعمال کا رجحان زیادہ ہے اور ان میں آرٹسٹ (اداکار وغیرہ) پہلے نمبر پر ہیں نیویارک کے ایک طبیب کا کہنا ہے کہ ایک معروف امریکی آرٹسٹ ۲۴ گھنٹوں میں دس مرتبہ مُسکّن دواؤں کے انجکشن لگواتا ہے اور ہر انجکشن کی قیمت ساٹھ ڈالر ہوتی ہے۔ اس طبیب نے مزید کہا ہے کہ بہت سے معروف لوگ جن کے بارے میں رسمی طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کی موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی ہے دراصل مُسکّن دواؤں کی وجہ سے انتقال کر جاتے ہیں۔

خدا اور مذہب کے تصوّر سے عاری مادّی تعلیم نے اُن لوگوں کی زندگی اجیرن اور ناقابلِ برداشت کر دی ہے جو زندگی کی تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہیں اور تکنیک اور پیداوار کے لحاظ سے دُنیا کے میرِ میدان بنے ہوئے ہیں۔ خانگی زندگی کی رونق اور چہل پہل ختم ہو گئی ہے اور طلاقوں کی روز افزوں تعداد خاندانوں کا شیرازہ بکھیر رہی ہے۔ والدین اور اولاد تک کے مابین محبّت کے جذبات ناپید ہو چکے ہیں اور جرائم میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ قلب اور روح کا سکون جو انسان کی خوش بختی کی اہم ترین بنیاد ہے موجودہ دَور کے لوگوں کو بہت کم میسّر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سکون فقط ایمان اور مذہب کی روشنی میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تربیّت اس بنیاد پر استوار ہے کہ تمام قوّتوں، جبلّتوں اور جذبات کو صَیقل کیا جائے اور ان میں سے ہر ایک سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا جائے۔

اسلام انسان کی سرکش خواہشات اور میلانات کو مختلف طریقوں سے قابو میں رکھتا ہے تاکہ مبادا وہ انسانی عقل پر حاوی ہو جائیں اور زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کامیابی اور جبلّتوں سے بہرہ ور ہونے کے ایک معقول اور قابلِ قدر حصّے کو لوگوں کے لیے جائز قرار دیتا ہے۔

اسلام انسان کو مادّے کی چار دیواری میں قید نہیں کرتا اور اس کا مشاہدہ فقط اقتصادی نقطۂ نظر سے نہیں کرتا بلکہ اس نے اس کی تمام فطری ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے اور اپنے تربیتی لائحۂ کار کو معنوی، روحانی اور اخلاقی اصولوں پر استوار کیا ہے جو انسانیّت کی بنیاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کے مادّی اور اقتصادی مسائل سے بھی غفلت نہیں برتتا اور اُسے صحیح جستجو اور معقول ترقی کا شوق دلاتا ہے۔

امام علی علیہ السلام سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کا مضمون یہ ہے:

اَدِّبُوا اَوْلَادَکُمْ بِغَیْرِ آدَابِکُمْ فَاِنَّھُمْ خُلِقُوْا لِغَیْرِ زَمَانِکُمْ

"اپنی اولاد کی تربیّت اپنے زمانے کے طور طریقوں کے مطابق نہیں بلکہ جدید دَور کے تقاضوں کے مطابق کرو کیونکہ وہ تمھارے زمانے سے مختلف زمانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔"

امامؑ کا مقصد یہ ہے کہ اپنے فرزندوں کو ان کے اپنے زمانے کے علم و دانش اور آداب کی تربیّت دو تاکہ وہ زمانے کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھیں یعنی اگر ایک باپ اپنے زمانے میں قلعی گر یا لوہار ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے فرزند کو میکینک، ویلڈر اور ٹرنر بنائے اور اگر باپ کجاوے اور اونٹ کے ذریعے مسافروں کو اِدھر اُدھر لے جاتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے فرزند کو موجودہ وسائلِ حمل و نقل کی ڈرائیوری اور ہوائی جہاز کا پائلٹ بننے کی ترغیب دے۔

کچھ نام نہاد روشن خیال اشخاص اس روایت سے غلط استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام کا یہ مقصد ہے کہ اگر زمانہ رقص اور بدچلنی اور فساد کا ہو تو تم بھی اپنی اولاد کو زمانے کے مطابق تربیّت دو۔ حالانکہ امام علی علیہ السلام سے ایسی باتوں کا منسوب کرنا گناہ اور بے ضمیری ہے۔

رسول اکرمؐ کیا گفتار میں اور کیا کردار میں لوگوں کو ہر میدانِ عمل میں محنت کرنے

کی ترغیب دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی فرماتے تھے کہ لوگ بیجا اور تباہ کن افراط و تفریط کا شکار نہ ہو جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ دولت و رتبے کا شوق ان پر غالب آ جائے۔ کہیں وہ ہوس رانی اور عیاشی میں نہ ڈوب جائیں۔ کہیں وہ روحانیت اور اخلاق کو مادّی مقاصد کی بھینٹ نہ چڑھا دیں۔

عملی تربیت کا یہ طریقہ تمام رہبرانِ اسلام کے ذریعے جاری رہا اور تاریخ شاہد ہے کہ معاشرے میں اس کے بڑے تسلّی بخش نتائج دیکھنے میں آئے۔ جب مسلمان اپنے بزرگوں کے انسانی اور آسمانی طور طریقوں کا ملاحظہ خود اپنی آنکھوں سے کرتے تھے تو خود بخود اسی روش کی جانب کھِنچے چلے آتے تھے۔

جب لوگ دیکھتے تھے کہ گو امام علی علیہ السّلام خلیفہ اور سربراہِ مملکت ہیں اور تمام اختیارات ان کی ذات میں مرتکز ہیں پھر بھی وہ اپنے قاتل تک پر زیادتی اور ظلم نہیں کرتے بلکہ اپنے فرزندوں کو اُسے آرام اور آسائش مہیّا کرنے کی تلقین فرماتے ہیں تو وہ قطعی طور پر عدالت اور انسانیّت کی جانب راغب ہو جاتے تھے اور یہ تربیّت دینے کا بہترین طریقہ ہے جو فقط انبیائے کرام اور اللہ تعالیٰ کے اولیاء کے مکتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۶۳ھ ہجری میں مدینے کے لوگوں نے یزید کی خلافت اور اس کی ظالمانہ روش کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے ایک عظیم شورش برپا کر دی۔ انھوں نے مدینہ کے گورنر کو نکال دیا اور بنی امیّہ کے خاندان کے لوگوں پر سخت دباؤ ڈالا۔ مروان بن حکم جو بنی امیّہ کے اکابر میں سے تھا اور ہمیشہ سے اہلبیتِ رسولؐ کا دشمن رہا تھا اپنے بیوی بچّوں سمیت انقلابیوں کی سختی کا نشانہ بن گیا۔ ہر طرف سے خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا اور وہ بے حد پریشانی کے عالم میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں تھا تاکہ اپنے گھر والوں کو انقلابیوں کے خطرے سے محفوظ رکھ سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے تمام سابقہ دوستوں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے بیوی بچوں کو اپنے گھروں میں پناہ دیں لیکن

کسی نے بھی حامی نہ بھری۔ وہ عبداللہ بن عمر بن خطّاب کے پاس یہی درخواست لے کر گیا لیکن وہ بھی اُسے پناہ دینے پر راضی نہ ہوئے۔

بالآخر وہ امام زین العابدین علیہ السّلام کے پاس پہنچا۔ رسولِ اکرمؐ کے خاندان سے اُس نے جو ناقابلِ معافی زیادتیاں کی تھیں ان کی بنا پر اُسے امام علیہ السّلام سے کسی مدد کی توقع نہ تھی اور یہ محض مجبوری تھی جو اُسے آپ کے دروازے پر لے آئی۔

تاہم اس کی توقع کے برعکس امام علیہ السّلام نے اس کی پذیرائی بڑی خندہ پیشانی اور محبّت سے کی اور اس کی درخواست کا خاطر خواہ جواب دیا۔ آپ نے مروان کے لواحقین کو اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ طائف میں واقع اپنے ایک مکان میں بھیج دیا۔ چنانچہ انقلابِ مدینہ کے خاتمے تک ان لوگوں نے اپنے دن امام علیہ السّلام کی پناہ میں بسر کیے اور ہر خطرے سے محفوظ رہے۔[1]

بلاشبہ یہ بے نظیر تربیّتی سبق انسان کے دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے اور اسے اسی راستے پر گامزن ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے نہیں بلکہ کردار کے ذریعے پھیلایا گیا ہے۔

اسلام کے پیشوا تربیّتی مسائل کے سلسلے میں اتنا دقیق اور ہمدردانہ عمل کرتے تھے کہ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں لوگوں کے ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑتے تھے اور انھیں نیکیوں اور فضیلتوں کی جانب مائل کرتے تھے۔ حتّٰی کہ مناجات اور اللہ تعالیٰ سے گفتگو کرتے وقت بھی وہ اس اہم فریضے سے غافل نہیں رہتے تھے کہ ان کے راز و نیاز سُننے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے تربیّت کا موجب بنیں۔

صحیفۂ سجّادیہ کی جو دعائیں ہمیں امام سجّاد علیہ السّلام سے پہنچی ہیں ان میں سے ایک دعا کے الفاظ یوں ہیں:

---

[1] کامل ابنِ اثیر

"اے پروردگار! محمدؐ و آلِ محمدؐ کی ارواح پر درود بھیج اور زندگی کی مشکلات میں میرا یاور اور مددگار بن۔ تو میری مدد فرما تاکہ یہ بھاری بوجھ میرے کندھوں پر دباؤ نہ ڈالے اور مجھے اپنے آپ میں مشغول نہ رکھے۔

خداوندا! کل یومِ قیامت کو جب میں خاک سے اُٹھوں گا تو تیری بارگاہِ عدالت میں میرے اقوال اور اعمال کے بارے میں باز پُرس ہوگی۔ تو اِس بات کو مقدّر فرما کہ میں آج بھی اپنی عاقبت کے متعلّق سوچوں اور اپنی ذمّے داری اس طرح پوری کروں جیسے تُو چاہتا ہے۔

یا الٰہ العالمین! تو اُس بات کو مقدّر فرما کہ میری زندگی تیری اطاعت اور عبادت میں اختتام کو پہنچے۔ مجھے دوسروں کی دولت سے بے نیاز رکھ اور فراواں روزی دے۔ مجھے فتنوں سے دُور رکھ اور میری فطرت کو معزّز اور غنی بنا دے تاکہ میں طمع کی نگاہ سے دوسروں کے ہاتھوں کی جانب نہ دیکھوں۔

اے پروردگار! تو مقدّر فرما دے کہ میرے ہاتھ لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے کام کریں اور اسی طرح میرے محنتی ہاتھوں کو لوگوں کا احسان اُٹھانے اور ان کی دل آزاری کرنے سے اور میری زبان کو اپنی تعریف آپ کرنے اور دوسروں پر برتری جتانے سے محفوظ رکھ۔

خداوندا! جس طرح تو لوگوں کی نگاہوں میں میرا رتبہ بڑھا رہا ہے اسی طرح میری اپنی نگاہ میں میرا رُتبہ گھٹا اور جس انداز سے تو مجھے معاشرے میں عزّت بخش رہا ہے اُسی انداز سے مجھے میری پوشیدہ ذلّت سے سے آگاہ کر تاکہ میں کبھی بھی اپنی شخصیّت کو نہ بھلاؤں اور اپنی چادر سے زیادہ پاؤں نہ پھیلاؤں۔

خداوندا! تو جو بُری خصلت مجھ میں دیکھے اپنے لطفِ عمیم سے اس کی اصلاح فرما تاکہ وہ پسندیدہ ہو جائے اور ہر وہ عیب مجھ سے دُور کر جو میرے نفس کو فساد سے آلودہ کرے اور ہر اس نقص کو ختم کر دے جو میری روح کو حصولِ کمال سے باز رکھے۔

خداوندا! تو مقرّر فرما کہ میں سب کو دوست رکھوں اور سب کے حق میں نیکوکار اور نیک اندیش بنوں۔

اے میرے خدا! مجھے بھی اور سب مسلمان مَردوں اور عورتوں اور سب باایمان مَردوں اور عورتوں کو بھی ان عنایات اور انعامات سے برخوردار فرما۔ لوگوں کے بچّوں کو بھی میرے بچّوں کی طرح اپنے لطف، حفاظت مرحمت اور عنایت کے سائے میں جگہ دے اور انھیں دنیا اور آخرت میں سعادت مند اور خوشنود رکھ۔

اے پروردگار! تو یوں مقرّر فرما کہ میری زبان پر دشنام طرازی، ناواجب کلمات، چغلی، کسی کی بُرائی کرنے، جھوٹی گواہی دینے، جھوٹ بکنے، غیر موجود بھائی کی غیبت کرنے اور موجود بھائی پر تہمت لگانے کی بجائے تیرا شکر، تیری تعریف، تیری نعمتوں کا شمار اور تیرا اعلیٰ ذکر موجزن ہو اور اس بات کی اجازت دے کہ میرے دل و زبان ہمیشہ تیری یاد سے روشن رہیں۔

اے پروردگار! ہمیں دنیا اور آخرت میں نیکیوں سے بہرہ ور فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب اور اپنے غضب کی آگ سے دُور رکھ۔"

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے مندرجہ ذیل نتائج دستیاب ہوتے ہیں:

- صحیح تربیّت کے بغیر انسان اپنے شایانِ شان کمال کو نہیں پہنچتا،
- شائستہ تربیّت کنندگان کو چاہیئے کہ زبانی تربیّت دینے کے ساتھ وہ

خود بھی اس کا عملی نمونہ ہوں۔

- صرف اسی تربیت کو اصلی اور قابلِ اطمینان سمجھا جاسکتا ہے جس کی بنیاد مذہب اور اعتقاد پر ہو۔
- مغربی طرز کی تربیت معاشرے کے دکھوں کا علاج نہیں کرسکی، اور
- اسلام کے پیشواؤں نے اپنی آسمانی تعلیمات اور ملکوتی کردار کی بدولت لوگوں کو بہترین تربیتی سبق دیے اور وہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرے وجود میں لائے۔

گفتگو کے خاتمے پر ہم خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ سب مسلمانوں کو اس امر کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور متمدّن قوم بن جائیں۔

اِسلام میں
بچّوں کی تربیّت

صحیح معنوں میں خوش بخت معاشرہ اس معاشرے کو سمجھا جاسکتا ہے جس کی تشکیل صالح، لائق، فرض شناس اور باایمان اشخاص سے ہوئی ہو۔

ایسے معاشرے کی تیاری اور ایسے افراد کی دستیابی کے لیے بچّوں کی تربیّت اور پرورش پر ریاضت کرنا اور انھیں مستقبل کے لیے تیار کرنا ضروری ہے۔

عموماً لوگ بچّوں کو سطحی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی صحیح تربیّت سے غفلت برتتے ہیں حالانکہ صورت یہ ہے کہ آج کے مَرد گزشتہ کل کے بچّے ہیں اور آج کے بچّے آئندہ کل کے مَرد ہیں۔

جو بچّہ نوعمری میں صحیح تربیّت سے بہرہ مند نہ ہوا ہو اس سے یہ توقّع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کل ایک صالح مَرد بنے گا اور اپنے معاشرے کے لیے سود مند اور مفید ثابت ہوگا۔

دنیا کے موجودہ دَور میں بچّوں کی تربیّت کے مسئلے کی اہمیّت کی جانب بہت توجّہ دی گئی ہے اور دانشمندوں اور محقّقین نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں اور دقیق مطالعات

سکے ہیں۔

فنِ تربیت کے ماہرین کے نظریے کے مطابق تربیت کا کام بچّے کی ولادت سے ہی شروع ہو جانا چاہیے اور مسلسل جاری رہنا چاہیے تاکہ بچّہ کمال کے زینے تک جا پہنچے۔

اسلام نے مَرد اور عورت کے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کا ارادہ کرنے کے وقت کو بچّے کی تربیت کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے اور ہونے والے ماں باپ کو اس کام کی پیش بینی کرنے کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے۔

شاید آپ تعجّب کریں کہ بچّے کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کی تربیت شروع کر دینے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن تھوڑا سا غور کرنے پر اس حکم کی اہمیّت واضح ہو جاتی ہے۔

قانونِ توارث کے مطابق جسے دانشمند قبول کرتے ہیں بہت سی جسمانی اور روحانی خصوصیات والدین سے اولاد کو منتقل ہو جاتی ہیں اور یہی چیز بچّے کے اچھّے یا بُرے مستقبل کے لیے میدان ہموار کرتی ہے

چونکہ بچّہ رِحم میں ماں کے ایک عضو کی مانند ہوتا ہے اس لیے ماں کے تمام جسمانی اور روحانی حالات اسے متاثّر کرتے ہیں۔ جس طرح ماں کے جسمانی حالات بچّے پر اثر کرتے ہیں اسی طرح اس کے افکار اور اخلاق بھی اس کے جسم اور روح میں تاثیر کرتے ہیں اور بعض اوقات بچّہ ماں کے مقابلے میں زیادہ متاثّر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ماں ایّامِ حمل میں شدید خوفزدہ ہو جائے تو اس روحانی حالت کا جو اثر اس کے بدن پر ہوتا ہے وہ چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے لیکن بچّے کو پیٹ میں اس واقعے سے زیادہ صدمہ پہنچتا ہے۔

اگر حمل کے دوران میں ماں اس قدر خوفزدہ ہو جائے کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو جائے اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو جائے تو نوزائیدہ بچّے کے بدن پر داغ دیکھنے میں آتے ہیں۔

ماں کا غم و غصّہ، اس کی غضبناکی اور گھبراہٹ، اس کی خفگی اور ہیجان، اس کی بدبینی اور بدخواہی، مختصراً اس کی ہر ناپسندیدہ صفت اور اسی طرح ماں کا ایمان اور تقویٰ، اس کی پاک دلی اور پاک بینی، اس کا صدق و صفا اور محبّت، اس کی خیر خواہی اور انسان دوستی، اس کا سکونِ قلب اور اطمینان، اس کی شجاعت اور دلاوری غرضیکہ اس کی تمام کی تمام اخلاقی صفات بچّے پر اچھّا یا بُرا اثر کرتی ہیں اور اس کی خوش بختی اور بدبختی کی بنیاد ماں کے رحم میں ہی رکھ دی جاتی ہے اور جیسا کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اَلشَّقِیُّ مَنْ شَقِیَ فِی بَطْنِ اُمِّہٖ وَالسَّعِیْدُ مَنْ سَعِدَ فِی بَطْنِ اُمِّہٖ [1]

"لوگوں کی سعادت اور شقاوت کی جڑیں ان کی ماؤں کے رِحموں میں تلاش کرنی چاہئیں"۔ [2]

نفسیاتی امراض کے ڈاکٹروں نے ثابت کیا ہے کہ ان امراض میں مبتلا ۶۶ فی صد بچّے یہ بیماریاں اپنی ماؤں سے ورثے میں پاتے ہیں اور اگر مائیں صحّت مند اور صحیح و سالم ہوں تو بچّوں کا اعصابی نظام بھی درست ہوتا ہے اور ان میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اِخْتَارُوْا لِنُطَفِکُمْ [3]

"اپنے نطفوں کے لیے مناسب مقام کا انتخاب کرو"۔

انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ مطالعے اور مشاہدے کے بعد بہت سے افراد میں سے جو بہترین معلوم ہو اُسے چُن لیا جائے۔ اس جُملے میں آنحضرتؐ نے وضاحت فرمائی ہے کہ ہر عورت کا رِحم تمھارے بچّوں کی پرورش کی اہلیّت نہیں رکھتا۔ تحقیق، مطالعہ اور

---

[1] بحار الانوار۔ جلد سوّم۔ صفحہ ۴۴
[2] کودک از نظر وراثت و تربیت۔ جلد دوّم
[3] الزواج فی الاسلام

چھان بین کرو تاکہ اس اہم اور نازک کام کے لیے ایک مناسب ترین اور شائستہ ترین عورت کا انتخاب کرو۔

ایک اور مقام پر حضورؐ نے فرمایا ہے:

إِيَّاكُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ ، قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا خَضْرَاءُ الدِّمَنِ؟ قَالَ: اَلْمَرْءَةُ الْحَسْنَاءُ فِي مَنْبِتِ السُّوْءِ [1]

"جو سبزیاں کوڑے کے ڈھیر کے پاس اُگیں اُن سے دُور رہو۔"

لوگوں نے پوچھا: "یا رسولؐ اللہ کوڑے کے ڈھیر کے پاس اُگنے والی سبزیوں سے کیا مراد ہے؟"

آپ نے فرمایا: "وہ خوش شکل عورت جس نے پست اور رذیل خاندان میں پرورش پائی ہو۔"

اسلام نے مسلمانوں کے فاسد نسلوں میں مبتلا ہونے اور غیر صالح اولاد پیدا کرنے سے بچاؤ کے لیے شادی بیاہ کے معاملے میں تمام ضروری حفاظتی تدابیر اختیار کی ہیں اور مرد اور عورت کے تمام روحانی، جسمانی اور اخلاقی پہلوؤں کی جانب توجّہ دی ہے۔

اسلام نے لوگوں کو دیوانوں، احمقوں اور شرابیوں سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے سے خبردار کیا ہے۔

قرآنِ مجید نے عورت کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے:

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ [2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب انسان کوئی بیج بوئے تو اس سے اسی وقت معقول نفع حاصل کر سکتا ہے جب وہ بیج ایک موافق اور مناسب زمین میں چھڑکا جائے

---

[1] الزواج فی الاسلام [2] سورۃ البقرۃ - آیت ۲۲۳

کیونکہ شور زمین سے سنبل کا اُگنا ممکن نہیں۔

دُنیا میں حیاتیات کے ایک مستقل سائنس کے طور پر نمودار ہونے سے صدیوں پہلے رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا:

اِیَّاکُمْ وَتَزْوِیْجَ الْحَمْقَآءِ فَاِنَّ صُحْبَتَھَا بَلَاءٌ وَوَلَدَھَا ضِیَاعٌ [1]

"کُند ذہن اور احمق عورتوں سے شادی کرنے سے اجتناب برتو کیونکہ ایسی عورتوں کی ہم نشینی رنج اور مصیبت ہے اور اگر وہ کوئی بچّہ پیدا کریں تو وہ بچّہ ناکارہ ہوگا"

بچّہ پیدا ہونے کے بعد جو دودھ پیتا ہے اس کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

تَوَقُّوْا عَلٰی اَوْلَادِکُمْ مِنْ لَبَنِ الْبَغِیَّۃِ وَالْمَجْنُوْنَۃِ فَاِنَّ اللَّبَنَ یُعْدِیْ [2]

"اس بات کی اجازت نہ دو کہ تمھارے فرزند بدکار اور فاسد اور اسی طرح پاگل عورتوں کی چھاتیوں سے دودھ پئیں کیونکہ دودھ پلانے والی کے خیالات، اخلاق اور حالات بچّے کو منتقل ہو جاتے ہیں"

اسلام کے ان احکام سے پتا چلتا ہے کہ بچّوں کی تربیت کے بارے میں شادی سے پہلے ہی پیش بینی کر لینی چاہیئے تاکہ تربیّت کے اہل فرزند پیدا ہوں اور جو دودھ وہ غذا کے طور پر پئیں اس کے متعلق بھی خوب غور و خوض کرنا چاہیئے تاکہ ان میں ترقّی اور سربلندی کا مادّہ پیدا ہو اور وہ تربیّت کا زیادہ سے زیادہ اثر قبول کریں۔

جو فرزند صحّت مند اور صالح ماں باپ کے ذریعے دنیا میں قدم رکھتا ہے اس

---

[1] مستدرک الوسائل۔ کتابِ نکاح   [2] مکارم الاخلاق۔ صفحہ ۲۵۶

میں تربیت قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

زندگی کی صحیح راہ اختیار کرنے کے لیے بچپن کا زمانہ بہترین ہے کیونکہ بچوں میں تقلید اور اکتساب کی قوت اور بڑوں کی باتوں کو قبول کرنے کی حس بہت شدید ہوتی ہے اور بچہ اپنے معلم کے تمام اعمال، اقوال اور طور طریقے بہترین طریقے سے اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتا ہے۔

امام علی علیہ السلام نے اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

وَإِنَّمَا قَلْبُ الْحَدَثِ كَالْأَرْضِ الْخَالِيَةِ مَا أُلْقِيَ فِيهَا مِنْ شَيْءٍ قَبِلَتْهُ فَبَادَرْتُكَ بِالْأَدَبِ قَبْلَ أَنْ يَقْسُوَ قَلْبُكَ وَيَشْتَغِلَ لُبُّكَ [1]

"ایک نوعمر بچے کا دل ایک ایسی زمین کی مانند ہے جو بیج اور گھاس سے خالی ہو۔ اس میں جو بیج بھی بویا جائے وہ اسے قبول کر کے اس کی پرورش کرتی ہے۔ اے میرے عزیز فرزند! میں نے تیرے بچپن کے زمانے سے فائدہ اٹھایا اور قبل اس سے کہ تیرا تربیت پذیر دل سخت ہو جائے اور تیری عقل دوسرے مسائل میں مشغول ہو جائے میں تیری تربیت میں لگ گیا۔"

تربیت کنندگان کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح وہ بچے کی جسمانی صحت کا خیال رکھتے ہیں اسی طرح اس کی روح اور احساسات کی درستی کو بھی اہمیت دیں اور کوشش کریں کہ اس کا جسم اور روح ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کمال کی جانب رواں دواں ہوں۔ انھیں چاہیے کہ زندگی کے اسی نقطۂ آغاز سے بچے کو سچائی، ادب، فرض شناسی، مہربانی، احساسِ ذمے داری اور دوسری پسندیدہ صفات سکھائیں اور اپنے صحیح طور طریقوں کے ذریعے بچے کے لیے عملی اور مؤثر مثال بنیں۔

---

[1] نہج البلاغہ۔ صفحہ ۹۱۲

والدین بچوں کی تربیت کے لیے عظیم روایات کا سرچشمہ بن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماں کو خصوصی حیثیت حاصل ہے کیونکہ بچے کے جسم، روح، احساسات اور اخلاقیات کی پرورش بڑی حد تک اسی کی ذمّے داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں کے دامن کو تعلیم و تربیت کا پہلا مکتب قرار دیا گیا ہے۔

اگر اس مکتب اور اس زمانے میں بچے کو صحیح تربیت حاصل ہو جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک خوش نصیب رہے گا۔ وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جو ابتدا ہی سے اپنی ماؤں سے صحیح تربیت حاصل کریں اور اپنے اندر اچھی صفات پیدا کر لیں تاکہ بڑے ہو کر اپنی ذات کی تعمیر کی زحمت اٹھائے بغیر جو کچھ انھوں نے حاصل کر رکھا ہو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

امام حسین علیہ السّلام نے اپنے ایک خطبے میں جو آپ نے اپنی زندگی کے آخری دن یعنی یومِ عاشورہ کو دیا صحیح تربیت کی اہمیت اور انسان کی زندگی پر اس کے گہرے اثر کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا:

اَلَاوَاِنَّ الدَّعِیَّ ابْنَ الدَّعِیِّ قَدْ رَکَزَ بَیْنَ اثْنَتَیْنِ بَیْنَ السِّلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَهَیْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةَ یَأْبَی اللّٰهُ ذَالِكَ لَنَا وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَحُجُوْرٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ وَاُنُوْفٌ حَمِیَّةٌ وَنُفُوْسٌ اَبِیَّةٌ مِّنْ اَنْ نُّؤْثِرَ طَاعَةَ اللِّئَامِ عَلٰی مَصَارِعِ الْکِرَامِ [1]

"اے لوگو! آگاہ رہو کہ حرام زادے کا حرامی بیٹا (عبید اللہ ابنِ زیاد) دو باتوں پر اصرار کر رہا ہے۔ جنگ یا ذلّت (یزید کی بیعت کی خاطر)، یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ میں ذلّت اور خواری قبول کر لوں۔ نہ ہی خدا مجھے اس بات کی

---

[1] لہوف۔ تالیف۔ سید بن طاؤس

اجازت دیتا ہے اور نہ ہی رسولِ خدا - نہ وہ پاک دامن (جنھوں نے میری پرورش کی ہے)، اور نہ ہی میرے باوقار آباؤ اجداد کے متفکّر اور غیور دماغ - ان میں سے کوئی بھی مجھے اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ میں فرومایہ لوگوں کی اطاعت کی ذلّت کو باعزّت موت پر ترجیح دوں"۔

ان چند جملوں میں امام علیہ السّلام اس امر کی جانب اشارہ فرماتے ہیں کہ فرومایہ لوگوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کا راز تربیّت کی ماہیّت اور تربیّت دینے والوں کی خصوصیات میں پنہاں ہے - پھر آپ فرماتے ہیں:

"چونکہ میں نے پاک پستان سے دُودھ پیا ہے اور پاک آباؤ اجداد اور پاک، صاحبِ عزّت اور شریف سرپرستوں سے تربیّت پائی ہے اس لیے عزّت، شرف اور آزادگی مجھے ورثے میں ملی ہیں اور میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ زندہ رہنے کے لیے ذلّت اور خواری قبول کروں"۔

ان کلمات کے ذریعے امام حسین علیہ السّلام نے اقوامِ عالم کو سبق دیا ہے کہ اپنی عزّت، شرف اور سعادت کو صحیح تربیّت میں تلاش کریں۔

جن لوگوں نے بزرگ اور باوقار گھرانوں میں تربیّت پائی ہے انھوں نے نہ کبھی ذلّت اُٹھائی ہے اور نہ ہی وہ اس بات پر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ زندہ رہنے کی خاطر ذلّت اور خواری برداشت کریں۔

غلط تربیّت انسان کی عزّت اور آزادگی کو فنا کر دیتی ہے، ترقّی اور قیادت کی استعداد اس کی رُوح سے خارج کر دیتی ہے اور اس کی طبیعت میں کمینگی، حقارت، خوشامد اور ذلّت کی رُوح کی پرورش کر کے اسے بعد میں آنے والی نسلوں کو منتقل کر دیتی ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ والدین اور معلّمین کی ذمّے داری کتنی بھاری اور اہم ہے۔ اگر بچّوں کی تربیّت محض ان کی خوراک، لباس، صحّت اور پڑھائی تک محدود ہو تو یہ کام

بڑا سادہ اور آسان ہے لیکن تربیت میں بنیادی چیز اندرونی صلاحیتوں کی پرورش اور روحانی قوتوں کو پروان چڑھانا ہے اور یہ بڑا دقیق اور نازک کام خاص احتیاط اور توجہ کا طالب ہے۔

امام علی علیہ السّلام جو عالمِ بشریت کے لیے انسانِ کامل کا ایک نمونہ ہیں واشگاف الفاظ میں اپنے بچپن کے زمانے کی پرورش کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور اس خاص تربیت کا ذکر کرتے ہیں جو انھیں رسولِ اکرمؐ کی باریک بین نظر کے تحت حاصل ہوئی اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ انھیں ایسا لائق سرپرست نصیب ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وَقَدْ عَلِمْتُمْ مَوْضِعِي مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ بِالْقَرَابَةِ الْقَرِيْبَةِ وَالْمَنْزِلَةِ الْخَصِيْصَةِ۔ وَضَعَنِيْ فِيْ حِجْرِهٖ وَاَنَا وَلِيْدٌ يَضُمُّنِيْ اِلٰى صَدْرِهٖ وَيُكْنِفُنِيْ فِيْ فِرَاشِهٖ وَيُمِسُّنِيْ جَسَدَهٗ وَيُشِمُّنِيْ عَرْفَهٗ [1]

"تم میری رسولِ اکرمؐ سے قرابت اور اس خاص منزلت سے بخوبی واقف ہو جو مجھے اُن کے نزدیک حاصل تھی۔ میں ایک نوعمر لڑکا تھا۔ وہ مجھے اپنے دامن پر بٹھاتے تھے، مجھے اپنی آغوش میں لے لیتے تھے، سینے سے چمٹاتے تھے، کبھی مجھے اپنے بستر میں سُلاتے تھے، مجھ پر نوازش فرماتے تھے، مجھے اپنے بدن کی لطیف خوشبو سُنگھاتے تھے ..... اور جب بھی نیا دن طلوع ہوتا آپ اپنی اخلاقی صفات کا کوئی نہ کوئی نمونہ پیش فرماتے تھے اور مجھے حکم دیتے تھے کہ میں ان کے اخلاق کی پیروی کروں۔"

اگر دنیائے بشریت امام علی علیہ السّلام کی بارگاہ میں سرِ تعظیم خم کرتی ہے اور اُنھیں دوسرے انسانوں سے بالاتر مثالی انسان سمجھتی ہے اور اگر اسلام کے علاوہ دوسرے

---

[1] نہج البلاغہ

مذاہب کے پیرو بھی بڑی عقیدت سے اس بزرگوار کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے متعلق ارادت اور اخلاص کا اظہار کرتے ہیں تو اس کی ایک اہم ترین وجہ یہی نقطہ ہے جس پر آپ نے خود زور دیا ہے۔

جو شخص وراثت کے نقطۂ نگاہ سے بہترین جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہو اور تربیّت کے لحاظ سے بھی اُس نے شریف ترین خاندان اور بہترین معلم یعنی خود رسولِ اکرمؐ کے زیرِ سایہ پرورش پائی ہو وہ اس بات کا اہل ہے کہ بڑا ہو کر ایک ممتاز شخصیّت اور ایک گرانقدر رہنما بنے۔

اسلام نے بچّوں کی تربیّت کے مسئلے کو اتنی اہمیّت دی ہے کہ اُسے فرزند کا باپ پر ایک مسلّمہ حق قرار دیا ہے۔

امام زین العابدین علیہ السّلام فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا حَقُّ وَلَدِكَ فَاَنْ تَعْلَمَ اَنَّهُ مِنْكَ وَ مُضَافٌ اِلَيْكَ فِىْ عَاجِلِ الدُّنْيَا بِخَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ وَ اَنَّكَ مَسْئُوْلٌ عَمَّا وَلَّيْتَهُ بِهٖ مِنْ حُسْنِ الْاَدَبِ وَ الدَّلَالَةِ عَلٰى رَبِّهٖ عَزَّ وَ جَلَّ وَ الْمَعُوْنَةِ لَهُ عَلٰى طَاعَتِهٖ فَاعْمَلْ فِىْ اَمْرِهٖ عَمَلَ مَنْ يَّعْلَمُ اَنَّهُ مُثَابٌ عَلَى الْاِحْسَانِ اِلَيْهِ مُعَاقَبٌ عَلَى الْاِسَائَةِ اِلَيْهِ [1]

"تم پر تمھارے فرزند کا یہ حق ہے کہ تم جان لو کہ اس کا وجود تمھارے وجود کا ایک حصّہ ہے اور اس دُنیا میں اس کی بھلائیاں اور بُرائیاں تم سے وابستہ اور منسوب ہیں۔ تمھیں یہ جان لینا چاہیئے کہ تم اس کے سرپرست کی حیثیّت سے اس بات کے لیے جوابدہ ہو کہ اس کی صحیح تربیّت کرو

---

[1] مکارم الاخلاق۔ صفحہ ۴۸۶

اور خدائے واحد کی جانب اس کی رہنمائی کرو اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے میں اس کا ساتھ دو اور اس کی مدد کرو۔ تمھیں ایسا باپ ہونا چاہیئے جو اپنے فرض سے واقف اور اپنی ذمّے داری سے آگاہ ہو۔ ایسا باپ جو یہ جانتا ہو کہ اگر وہ اپنے فرزند کے ساتھ نیکی کرے تو اس کی جزا پائے گا اور اگر اس کے حق میں بدی کرے گا تو سزا کا مستحق ہوگا۔"

والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے گھر میں ایک پاکیزہ ماحول پیدا کریں۔ ایک ایسا ماحول جس میں مہر و محبت، فرض شناسی، پرہیز گاری، نیک اندیشی اور دوسری صفات اور قابلِ ستائش آداب کا دَور دورہ ہو تاکہ بچّے خود بخود فرض شناس اور مؤدّب بن جائیں۔

ایک ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

"گھر اور خاندان پہلا معاشرتی حلقہ ہے جس میں بچّے کی سرپرستی اور دیکھ بھال کی جاتی ہے، اس لحاظ سے یہ انسان کی نشوونما اور کاملیّت پر دوسرے تمام معاشرتی حلقوں سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور بیشتر اس سے کہ بچہ بیرونی معاشرتی حالات سے متاثّر ہو وہ اپنے خاندان کے زیر اثر ہوتا ہے۔ بچّے کی بیشتر عادات اور نظریات کا آغاز گھر سے ہوتا ہے اور ان عادات اور نظریات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے خاندان کی تاثیر کی اہمیّت واضح ہو جاتی ہے چنانچہ کھانا کھانے، بات کرنے، راستہ چلنے اور لوگوں سے ملنے جُلنے کا انداز اور اسی قسم کی دوسری عادات بچّہ گھر ہی میں سیکھتا ہے اور اسی طرح جنس، دولت دوسروں کے حقوق، مردوں اور عورتوں کے میل جول، والدین اور اولاد کے تعلّقات، خاندان کی سرپرستی اور سرپرست کے اثر اور فرائض وغیرہ کے بارے میں نظریات بھی وہ گھر کے ماحول میں ہی قائم کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ جب بچّہ اس دُنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور گہوارے میں ہی ہوتا ہے کہ اس

پر وہ غیر مرئی ماحول مسلّط ہو جاتا ہے جو خاندان کے افراد کے افکار، احساسات، نظریات، آرزوؤں، امیدوں اور توقعات سے تشکیل پاتا ہے۔

گھر وہ مقام ہے جہاں بچے ادب آداب کے عام طریقے اور بالخصوص والدین کی تہذیب سیکھتے ہیں۔ خاندان کا پہلا فرد جس کا بچے سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے خود اس کی ماں ہے اور زندگی کا آغاز اس کے اور اس کی ماں کے مابین بیالوجک (Biologic) یعنی زندگی اور ضروریاتِ زندگی کے ارتباط سے ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ شروع شروع میں ماں اور بچے کے ارتباط کی بنیاد بدنی ضروریات مثلاً غذا اور نیند کی سیری پر ہوتی ہے اور بچہ ماں کو فقط خوراک کے حوالے سے پہچانتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ بعد میں جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اپنے بدنی اور غذائی ارتباط کو قوی روحانی وابستگی میں تبدیل کر لیتا ہے۔ بعد ازاں وہ اپنے باپ، بھائیوں، بہنوں، ہمسایوں اور بالآخر معاشرے سے ربط پیدا کرتا ہے اور یوں ثانوی ارتباط وجود میں آتے ہیں جن میں سے ہر ایک انسان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے کی زندگی کا آغاز اس کی ماں سے وابستہ ہے اور اگر وہ ماں کے وجود سے محروم ہو جائے تو ایک لحاظ سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔"

بچہ جو صحیح یا غلط کام ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور جو اچھی یا بُری بات سُنتا ہے اُسے اپنے لیے ایک نمونہ تصوّر کرتا ہے اور اپنے طور طریقے اسی کے مطابق ڈھالتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آزادانہ طور پر ماں باپ کی تقلید کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ خاندان میں ہر چیز اور ہر شخص سے زیادہ جس کا اثر قبول کرتا ہے وہ اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات نے والدین کو ان کی عظیم اور نازک ذمّے داری کی

جانب توجہ دلائی ہے اور اس سلسلے میں انھیں ہر قسم کی ضروری نصیحتیں کی ہیں:

امام الصّادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اَحِبُّوا الصِّبْیَانَ وَارْحَمُوْهُمْ وَاِذَا وَعَدْتُمُوْهُمْ فَفُوْا لَهُمْ فَاِنَّهُمْ لَا یَرَوْنَ اِلَّا اَنَّكُمْ تَرْزُقُوْنَهُمْ [1]

"بچّوں کو دوست رکھّو اور ان پر مہربان رہو۔ جب ان سے کوئی وعدہ کرو تو اسے ضرور پورا کرو کیونکہ بچّے تمھیں اپنا مربّی سمجھتے ہیں۔"

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

لَا یَصْلَحُ الْكِذْبُ جِدٌّ وَلَا هَزْلٌ وَلَا اَنْ یَّعِدَ اَحَدُكُمْ صَبِیَّهٗ ثُمَّ لَا یَفِیْ لَهٗ [2]

"یہ مناسب نہیں کہ انسان سنجیدگی سے یا مذاق میں جھوٹ بولے اور یہ بھی مناسب نہیں کہ کوئی شخص اپنے بچّے سے کوئی وعدہ کرے اور پھر وہ وعدہ پورا نہ کرے۔"

بچّہ صدقِ دل سے اپنے ماں باپ کو روئے زمین کی بزرگ ترین اور بلند ترین شخصیتیں تصوّر کرتا ہے اور ان کے علاوہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہ انھیں اپنے لیے نمونہ قرار دیتا ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ اگر وہ اس کے سامنے جھوٹ بولیں یا اس سے جو وعدہ کریں اسے وفا نہ کریں تو اس کے جذبات کو سخت ٹھیس لگتی ہے اور وہ اس بُری اور ناپسندیدہ صفت کو اپنا کر ساری زندگی اس پر عمل کرتا ہے۔

ذرا غور فرمائیے کہ جب ہم عام اور فطری طریقوں سے ایک بچّے کو مطمئن نہیں کر سکتے اور اس سے اپنی بات نہیں منوا سکتے تو انھیں کتنا فریب دیتے ہیں۔ ان سے کتنے کھوکھلے وعدے کرتے ہیں اور انھیں کتنی دھمکیاں دیتے ہیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد پنجم [2] وسائل الشیعہ۔ جلد سوّم

کتنی ہی مائیں ایسی ہیں جو گھر سے باہر جانا چاہیں تو اس بچّے کو خاموش کرانے کے لیے جو اُن کے باہر جانے پر رو رہا ہو اُس سے وعدہ کرتی ہیں کہ میں تمھارے لیے کھلونے خریدنے جارہی ہوں لیکن گھنٹوں شدید انتظار کرنے کے بعد بچّہ دیکھتا ہے کہ وہ خالی ہاتھ گھر لوٹتی ہے۔

گاڑی تیّار ہے۔ باپ دیہات سے شہر جانا چاہتا ہے۔ جونہی وہ گاڑی میں سوار ہونے لگتا ہے اس کا ننھّا مُنّا بچّہ بھاگتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بھی شہر جاؤں گا۔ وہ اصرار کرتا ہے۔ منّت سماجت کرتا ہے اور چونکہ اس بچّے نے اب تک یہ نہیں سیکھا کہ 'نہ' سے مراد قطعی انکار ہے اس لیے وہ برابر اصرار کر رہا ہے۔ باپ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یوں اس سے جان چھڑانا مشکل ہے فوراً ایک ترکیب سوچتا ہے اور بچّے سے کہتا ہے:

"بیٹے! یوں تو آپ شہر نہیں جاسکتے۔ جائیے اپنے کپڑے بدل کر آئیے"

بچّہ جو اپنے باپ پر فطری طور پر اعتماد کرتا ہے بھاگتا ہوا جاتا ہے اور کپڑے بدلتا ہے لیکن جب وہ واپس آتا ہے تو گاڑی کے اُڑائے ہوئے گرد و غبار کے علاوہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

بچّہ یہ صورتِ حال دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ چلّاتا ہے:

"تم جھوٹے ہو، تم جھوٹے ہو"

وہ واقعی ٹھیک کہتا ہے۔ اس کا باپ جھوٹا ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ بڑا ہو کر یہ بچہ بھی جھوٹا ہی نکلے گا۔

ماں باپ کا اس قسم کا رویّہ اور عمل بچّے کے صاف شفّاف اور کھوٹ سے مبرّا دل پر تھوڑے بہت اثرات باقی چھوڑتا ہے اور ان میں سے کچھ ایسے ہوتے جنھیں وہ تمام زندگی فراموش نہیں کر پاتا۔

اسلامی احکام میں ایسی باتوں سے بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے جو بچّوں کی عادات

بگاڑ دیں اور ان میں خراب اثرات پیدا کر دیں۔

باوجودیکہ اسلام نے اولاد کی تربیت کے سلسلے میں بے حد و حساب ہدایات دی ہیں لیکن اس نے انھیں تکلیف اور آزار دینے کی اجازت نہیں دی۔

ایک شخص نے امام علی علیہ السّلام کے پاس اپنے بیٹے کے متعلق شکایت کی حضرت نے فرمایا:

لَا تَضْرِبْهُ وَاهْجُرْهُ وَلَا تُطِلْ [1]

"اپنے بیٹے کو لاٹھی سے مت پیٹو اور اسے مؤدّب بنانے کے لیے اُس سے ناراض ہو جاؤ لیکن اپنی ناراضگی کی مدّت کو طول نہ دو اور تھوڑا سا عرصہ گزرنے کے بعد اس سے ملاپ کر لو۔"

اس روایت کے مطابق امیر المومنین عؑ نے بچّے کو جسمانی سزا دینے سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اسے تنبیہ کرنے کے لیے اس کے جذبات سے استفادہ کیا جائے۔

باپ بیٹے کی واحد پناہ گاہ ہے اور جب باپ اس سے بے مہری اور بے اعتنائی برتتا ہے تو وہ روحانی اور جذباتی کرب کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ سزا بچّے کی اصلاح پر گہرا اثر ڈال سکتی ہے۔

یہ حکم دینے کے بعد امیر المومنینؑ فوراً ہدایت فرماتے ہیں کہ باپ کو اپنی ناراضگی کی مدّت کو طول نہیں دینا چاہیئے کیونکہ اگر باپ کی ناراضگی کا بیٹے پر گہرا اثر ہو تو اس سے زیادہ مدّت تک ناراض رہنا بیٹے کی روح کی شکستگی کا موجب بن جائے گا اور اگر اس پر زیادہ اثر نہ ہو تو طویل مدّت تک ناراض رہنے سے باپ کی شخصیّت اس کی نگاہ میں پست ہو جائے گی اور یہ تربیّتی حربہ آئندہ کے لیے بے اثر ہو جائے گا۔

ایک دن امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السّلام نے اپنے فرزندوں اور بھتیجوں کو اپنے پاس

---

[1] بحار الانوار - جلد ۲۳ - صفحہ ۱۱۴

بلایا اور اُن سے فرمایا:

اِنَّکُمْ صِغَارُ قَوْمٍ وَیُوْشَكُ اَنْ تَکُوْنُوْا کِبَارَ قَوْمٍ آخَرِیْنَ فَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ فَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ اَنْ یَّحْفَظَهُ فَلْیَکْتُبْهُ وَلْیَضَعْهُ فِیْ بَیْتِهٖ [1]

"آج تم معاشرے کے بچے ہو اور اُمّید ہے کہ آئندہ تم معاشرے کے بزرگ ہو گے۔ علم و دانش حاصل کرنے کی کوشش کرو اور تم میں سے جن کا حافظہ قوی نہ ہو اور وہ علمی مطالب یاد نہ رکھ سکتے ہوں وہ ان مطالب کو لکھ لیں اور ان تحریروں کو اپنے گھروں میں سنبھال کر رکھیں تاکہ ضرورت کے وقت ان سے استفادہ کرسکیں۔"

امام حسن مجتبیٰ علیہ السّلام کی اس حدیث میں بچّوں کو تربیّت حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے اور یہ بھی بچّوں کے جذبات اور احساسات سے استفادہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ہر انسان فطری طور پر اپنی ذات سے محبّت کرتا ہے اور اس سے بہتر کیا چیز ہوسکتی ہے کہ بچّوں کو تنبیہ کرنے یا جسمانی سزا دینے کی بجائے ان کی حُبِّ ذات کی خواہش کو اُبھار کر اور انھیں درخشاں مستقبل اور معاشرے کی ترقّی کا موجب بننے کا شوق دلاکر اپنے فرائض انجام دینے پر آمادہ کیا جائے۔

موجودہ دَور میں شوق دلاکر تربیّت دینے کو ایک بہترین اور مؤثّر ترین وسیلہ سمجھا جاتا ہے اور جو معلّمین اس طریقے سے بچّوں کو علم و دانش کے حصُول اور نیک کام انجام دینے پر آمادہ کرسکیں وہ اپنے کام میں زیادہ کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

رسولِ اکرم ؐ نے فرمایا ہے:

---

[1] بحار الانوار۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۱

اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا آدَابَکُمْ [1]

"اپنے فرزندوں کا احترام کرو اور ان سے اچھے آداب اور طور طریقوں کے مطابق سلوک کرو۔"

ہوسکتا ہے کہ بچے سختی اور درشتی کی وجہ سے وقتی طور پر اپنے فرائض انجام دینے پر تیار ہو جائیں لیکن یہ چیزیں کبھی بھی انھیں باوقار اور باعزت افراد نہیں بنا سکتیں۔

رسول اکرمؐ جہاں اپنے پیروؤں کو ان کی اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیتے تھے وہاں خود بھی اس اصول پر پورا پورا عمل فرماتے تھے۔

حضرت عبّاس بن عبدالمطّلب کی بیوی امّ الفضل جو امام حسینؑ کی آیا کے فرائض انجام دیتی تھیں کہتی تھیں:

اَخَذَ مِنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ حُسَیْنًا اَیَّامَ رِضَاعِهٖ نَحَمَلَهٗ فَاَرَاقَ مَاءً عَلٰی ثَوْبِهٖ فَاَخَذْتُهٗ بِعُنْفٍ حَتّٰی بَکٰی فَقَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ : مَهْلًا یَا اُمَّ الْفَضْلِ اِنَّ هٰذِهِ الْاِرَاقَةَ اَلْمَاءُ یُطَهِّرُهَا فَاَیُّ شَیْءٍ یُزِیْلُ هٰذَا الْغُبَارَ عَنْ قَلْبِ الْحُسَیْنِ [2]

"امام حسینؑ کے زمانۂ شیر خواری کے دوران ایک دن رسولِ خداؐ نے انھیں مجھ سے لے کر اپنی گود میں اُٹھایا تو انھوں نے آپ کا لباس تر کر دیا۔ میں نے سختی سے انھیں آنحضرتؐ کی گود سے کھینچ لیا۔ وہ رونے لگے تو حضورؐ نے مجھ سے فرمایا: پُرسکون رہو۔ تم نے بچّے کو کیوں رُلا دیا؟ ہمارے لباس کو تو پانی پاک کر سکتا ہے لیکن کون سی چیز ہے جو حسینؑ کے دل سے ملال اور افسردگی زائل کر دے؟"

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۲۳ [2] ہدیۃ الاحباب۔ تالیف محدث قمی

دودھ پیتا بچہ اپنی تمام کمزوری اور ناتوانی کے باوجود مہربانی اور سختی کا احساس رکھتا ہے۔ اگر اس پر مہربانی کی جائے تو خوش ہوتا ہے اور ہنستا ہے اور اگر خفگی اور سختی روا رکھی جائے تو روتا ہے اور اداس ہو جاتا ہے۔ یہ خوشیاں اور اداسیاں بچے کی روح پر اچھا یا برا اثر چھوڑتی ہیں۔

جیسا کہ محدثین نے لکھا ہے۔ رسولِ اکرمؐ صرف اپنے فرزندوں سے ہی نہیں بلکہ سب بچوں سے محبت آمیز سلوک کرتے تھے:

اَلتَّلَطُّفُ بِالصِّبْیَانِ مِنْ عَادَۃِ الرَّسُوْلِ

"بچوں سے لطف و کرم سے پیش آنا آنحضرتؐ کی عاداتِ مبارکہ میں سے تھا۔"

وَكَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ يَقْدُمُ مِنَ السَّفَرِ فَيَتَلَقَّاهُ الصِّبْيَانُ فَيَقِفُ لَهُمْ ثُمَّ يَأْمُرُ بِهِمْ فَيُرْفَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُرْفَعُ مِنْهُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَيَأْمُرُ اَصْحَابَهٗ اَنْ يَحْمِلُوْا بَعْضَهُمْ فَرُبَّمَا يَتَفَاخَرُ الصِّبْيَانُ بَعْدَ ذَالِكَ [1]

"جب رسولِ اکرمؐ کسی سفر سے واپس تشریف لاتے اور راستے میں لوگوں کے بچوں سے آمنا سامنا ہو جاتا تو آپ ان کی خاطر رک جاتے اور صحابہ کو حکم دیتے کہ ان بچوں کو میرے پاس لاؤ۔ آپ ان میں سے بعض کو بغل میں لے لیتے اور بعض کو کندھے پر بٹھا لیتے اور صحابہ کو بھی فرماتے کہ بچوں کو بغل میں لے لیں۔ بچے رسولِ اکرمؐ کے اس پیار اور محبت کی بدولت بے حد خوش ہوتے اور آپ کی لطف و کرم کی شیریں یاد کو ہرگز نہ بھولتے۔ وہ اکثر مدتوں بعد تک ایک دوسرے کو اس کی یاد دلاتے اور رسولِ اکرمؐ کی اپنے بارے

---

[1] محجۃ البیضاء

میں عنایات پر فخر کرتے"۔

رسولِ کریمؐ اپنے پیروؤں کو بچّوں کی شخصیّت کے احترام کی عملی تعلیم دیتے تھے تاکہ وہ بچّوں کے ساتھ محترمانہ سلوک کریں اور یوں ان کی (یعنی بچّوں کی) تربیّت کی بنیاد صحیح خطوط پر رکھی جاسکے۔

ایک نکتہ جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بچّوں سے محبّت کے بارے میں افراط سے کام نہیں لینا چاہیئے کیونکہ صحیح تربیّت کا مطلب یہ ہے کہ بچّے کو ایک کامیاب اور خوشحال زندگی کے لیے تیّار کیا جائے۔ ہر شخص کی زندگی میں لازمی طور پر کئی نشیب و فراز اور تلخیاں، محرومیاں اور ناکامیاں آتی ہیں اور لائق معلّم وہ ہے جو بچّے کو زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے آمادہ کردے۔

جن بچّوں کو حد سے بڑھ کر محبّت ملتی ہے اور جن کے ماں باپ بغیر کسی قید یا شرط کے ان کی ہر بات مان لیتے ہیں اور ان کی تمام اچھّی اور بُری خواہشات کو عملی جامہ پہناتے ہیں وہ بالآخر سرکش اور خودپسند ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ توقّع رکھتے ہیں کہ سبھی لوگ اُن کے ساتھ ان کے ماں باپ کی طرح سلوک کریں اور ان کے مطیع رہیں اور جب یہ توقّع پوری نہیں ہوتی تو وہ ہمیشہ پریشان اور غمگین رہتے ہیں اور سب لوگوں کے بارے میں بُری رائے قائم کر لیتے ہیں۔

امام محمد الباقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

شَرُّ الْاٰبَاءِ مَنْ دَعَاهُ الْبِرُّ اِلَى الْاِفْرَاطِ وَ شَرُّ الْاَبْنَاءِ مَنْ دَعَاهُ التَّقْصِيْرُ اِلَى الْعُقُوْقِ [1]

"بدترین باپ وہ باپ ہوتے ہیں جو بچّوں سے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں اور بدترین فرزند وہ ہوتے ہیں جو اپنے فرائض انجام دینے میں

---

[1] تاریخ یعقوبی۔ جلد سوّم۔ صفحہ ۵۳

کوتاہی اور سستی برتنے کی وجہ سے باپ کو ناراض کر دیتے ہیں۔"

ویلبرٹ روبن کہتا ہے:

"بچّے کو بگاڑ دینے کا نتیجہ شدید جذباتی پن اور خود سری کی شکل میں نکلتا ہے اور عموماً اس کے حکومت طلب کرنے کا باعث بنتا ہے بالآخر بچہ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور گو اس کے اعصاب بڑے حسّاس ہوتے ہیں وہ مکر و فریب اور درشتی سے بالادستی حاصل کر لیتا ہے۔ جن بچّوں کو بگاڑ دیا جائے وہ بدبخت، کمزور، بے ارادہ اور دوسروں کے محتاج ثابت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو پہلے زمانے میں لاپرواہ ماں سے تمسخر آمیز لہجے میں کہا کرتے تھے کہ تمھارا بچّہ بگڑا نہیں بلکہ تباہ و برباد ہو گیا ہے وہ مبالغہ نہیں کرتے تھے بلکہ صحیح پیشین گوئی کرتے تھے۔

بعض اوقات تربیّت کے بارے میں لاپرواہیاں ملاحظہ کر کے انسان کانپ اُٹھتا ہے کیونکہ سچ بات یہ ہے کہ ہم کئی ایک ایسے بے گناہ لوگوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جن کی جانیں بچ سکتی تھیں۔"

ریمنڈ پیج کہتا ہے:

"آیئے اب چند اُن غلطیوں کا ذکر کریں جو بچّے کی زندگی کے بالکل ابتدائی ایّام سے کی جاتی ہیں۔ ان غلطیوں میں سب سے عام روش وہی ہے جس کا نتیجہ بچّے کے بگڑ جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ انہی ابتدائی ایّام سے کی جانے والی بیجا محبّت بچّے کو بگاڑ دیتی ہے۔ ماں باپ فطری طور پر بچّے کی کامیابی اور نیک بختی چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ اس پر بے حد توجّہ دیتے ہیں اس کی ناز برداریاں کرتے ہیں۔ اس کی ہر پریشانی اور تکلیف حتّٰی کہ معمولی سے معمولی پریشانی بھی رفع کر دیتے ہیں اور جب بچّہ بتدریج بڑا ہوتا ہے

تو اس کی عمر کے مطابق تمام تفریحات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو یہ احساسات بظاہر قابلِ تعریف ہیں لیکن درحقیقت بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔"

بچّوں کی تربیت سے متعلق نکات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی تشریح اور تفصیل ضخیم کتابوں کی تحریر کی محتاج ہے۔ اہلِ علم اور ماہرینِ نفسیات نے اس سلسلے میں حتیٰ الامکان تحقیق کی ہے اور اپنے مطالعات اور چھان بین کا حاصل لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

بچّوں کی تربیت کے بارے میں جس چیز پر مشرق اور مغرب کے تقریباً تمام دانشوروں کا اتّفاق ہے وہ یہ ہے کہ اگر معلّمین اور والدین بچّوں کو صحیح تربیت دینے میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیئے کہ مذہبی تعلیمات اور احکام سے استفادہ کریں اور بچّوں کو اُن کی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی مذہب اور دین سے روشناس کرا دیں۔

ریمنڈ پیچ کہتا ہے:

"بلاشبہ دوسرے تمام مسائل سے بڑھ کر بچّوں کو اخلاقی اور مذہبی تعلیم دینا خاندان کی ذمّے داری ہے کیونکہ اخلاق سے معرّا تربیت دینے سے انسان ایک چالاک مجرم کے علاوہ اور کچھ نہیں بن پاتا۔ پھر جہاں تک اخلاق کا تعلّق ہے انسان کا قلب مذہب کے بغیر اس کی طرف مائل نہیں ہوتا اور اگر کوئی شخص مذہب سے بے نیاز ہو کر اخلاقی اصول سیکھنا چاہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ ایک ایسا زندہ پیکر وجود میں لانے کا قصد کرے جو سانس نہ لے سکتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو پہلی تصویر بچّے کے ذہن پر اُبھرتی ہے اُس کی بنیاد اس کے ماں باپ سے تعلّقات پر ہوتی ہے اور اسی طرح اطاعت، مہربانی اور سچّائی کے سلسلے میں بچّہ جو نظریہ اپنے باپ کے متعلّق قائم کرتا ہے اس کا تعلّق افرادِ خانہ کے باہمی طرزِ عمل سے ہوتا ہے اور یہ ضروری ہے

کہ یہ تمام مسائل بچپن کے ابتدائی سالوں میں طے ہو جائیں کیونکہ یہی وہ دور ہے جب بچّہ جو کچھ سیکھے اس کا ذہن اُسے قبول کرنے کے لیے دوسرے تمام مواقع سے زیادہ تیار ہوتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ ماں باپ بچّے کی روح اور خیالات کی پرورش کی جانب توجّہ دینے کے لیے مناسب فرصت اور حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان کا یہ فرض ہے کہ اپنے بچّوں کو اللہ تعالیٰ کی تمام قوّت، ارادے اور بزرگی کے ساتھ متعارف کرائیں اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دو عظیم اور ناپیداکنار منابع یعنی ایک مذہب اور دوسرے فطرت سے استفادہ کریں۔

والدین اور معلّمین کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ بچّوں کی تربیت کے سلسلے میں مذہب عظیم ترین معاون اور مددگار ہے۔ ایمان اور اعتقاد ایک ایسی مشعل ہے جو تاریک ترین راستوں کو روشن کر دیتی ہے۔ ضمائر کو حسّاس اور بیدار کرتی ہے اور اگر کوئی بھٹک جائے تو بڑی آسانی سے اس کی رہنمائی سچّائی کی جانب کرتی ہے۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

وَيْلٌ لِأَوْلَادِ آخِرِ الزَّمَانِ مِنْ آبَائِهِمْ فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مِنْ آبَائِهِمُ الْمُشْرِكِينَ؟ فَقَالَ: لَا، مِنْ آبَائِهِمُ الْمُؤْمِنِينَ لَا يُعَلِّمُونَهُمْ شَيْئًا مِّنَ الْفَرَائِضِ وَإِذَا تَعَلَّمُوا أَوْلَادُهُمْ مَنَعُوهُمْ وَرَضُوا عَنْهُمْ بِعَرَضٍ يَسِيرٍ مِّنَ الدُّنْيَا فَأَنَا مِنْهُمْ بَرِيءٌ وَهُمْ مِنِّي بُرَآءُ[1]

"آخری زمانے کے فرزندوں پر ان کے آباء کی ناپسندیدہ روش کی وجہ سے

---

[1] مستدرک الوسائل - جلد دوّم

مصیبت ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! مُشرک آباء کی روش کی وجہ سے؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں، مومن آباء کی وجہ سے جو اپنے فرزندوں کو دینی واجبات کے متعلق کچھ نہیں سکھاتے اور اگر بچے مذہبی مسائل یاد کرنا چاہیں تو انھیں منع کر دیتے ہیں اور ان کے بارے میں مادی چیزوں کی حقیر مقدار پر قناعت کرتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے بیزار ہوں اور وہ بھی مجھ سے بیزار ہیں۔"

ابو عبدالرحمٰن سلمی نے جو مدینۂ منورہ میں معلمِ قرآن تھے، امام حُسین علیہ السلام کے ایک بچے کو سورۂ حمد پڑھائی۔ جب بچے نے وہ سورہ اپنے والد بزرگوار کے سامنے پڑھا تو آپ نے معلم کو اس کے بدلے میں بہت سے انعامات دیے جو سب کے سب گراں بہا تھے:

۱۔ آپ نے حکم دیا کہ معلم کا منہ موتیوں سے بھر دیں،

۲۔ آپ نے اُسے ایک ہزار دینار نقد عطا فرمائے،

۳۔ آپ نے ایک ہزار بیش قیمت خلعت اس کے حوالے کیے۔

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے اپنے بچے کو قرآنِ مجید کا ایک سورہ پڑھانے کے عوض معلم کو اتنے گرانبہا انعامات دیے تو کچھ لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا۔ ان لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں آپ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا جس کی قیمت ان تمام انعامات سے زیادہ تھی اور وہ جملہ یہ تھا:

اَیْنَ یَقَعُ مَا قَدَّمْتُہُ مِمَّا قَدْ اَعْطیٰ؟

"کُجا وہ سب کچھ جو میں نے اپنے فرزند کے معلم کو قرآنِ مجید کی تعلیم دینے کے مقابلے میں پیش کیا ہے اور کُجا وہ چیز جو اُس نے میرے فرزند کو عطا کی ہے؟"

اِس جواب میں آپ نے اپنے عطا کردہ انعام کو خلعت نہیں بلکہ پیش کش قرار دیا ہے اور معلم کے عمل کو 'عطا' کہا ہے اور اس پر اضافہ فرمایا ہے کہ 'یہ کُجا

اور وہ کجا؟' [1]

ابو عبد اللہؑ نے معلّم کی یہ پرشکوہ عزّت افزائی فرما کر لوگوں کو سبق دیا ہے تاکہ تمام مسلمان اپنے فرزندوں کی تربیت پر اور انھیں دینی مسائل کی تعلیم دینے پر توجہ دیں اور اس میں دلچسپی لیں اور ان باتوں کو اہم سمجھیں تاکہ بچّے نوعمری سے ہی اپنے دینی فرائض سے روشناس ہو جائیں۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

بَادِرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالْحَدِیْثِ قَبْلَ اَنْ یَسْبِقَکُمْ اِلَیْھِمُ الْمُرْجِئَۃُ [2]

"جس قدر جلد ہو سکے اپنے فرزندوں کو اسلامی احادیث اور مذہبی مسائل سکھا دو۔ اس سے پیشتر کہ تمھارے مخالف تم پر سبقت لے جائیں اور تمھارے بچّوں کے دلوں کو اپنی گمراہ کن باتوں سے پُر کر دیں۔"

امام العسکری علیہ السّلام نے آیۂ شریفہ وَبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ کی تفسیر میں فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ماں باپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

فَیَقُوْلَانِ رَبَّنَا اَنّٰی لَنَا ھٰذِہٖ وَلَمْ تَبْلُغْھَا اَعْمَالُنَا ؟

"وہ کہیں گے۔ اے پروردگار! ہمارے لیے یہ کرم اور رحمت کس بنا پر ہے؟ ہمارے اعمال تو اس اجر کے قابل نہ تھے۔"

فَیُقَالُ ھٰذِہٖ بِتَعْلِیْمِکُمَا وَلَدَکُمَا الْقُرْاٰنَ وَتَبْصِیْرِکُمَا اِیَّاہُ بِدِیْنِ الْاِسْلَامِ وَبِرِیَاضَتِکُمَا اِیَّاہُ عَلٰی حُبِّ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَعَلِیٍّ وَلِیِّ اللّٰہِ صَلَوَاتُ اللّٰہِ عَلَیْھِمَا

---

[1] گفتار ماہ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۸ [2] الکافی۔ جلد ششم

وَ تَفَقُّهُكُمَا اِيَّاهُ بِفِقْهِهِمَا [1]

جواب میں کہا جائے گا: "یہ اس بات کا اجر ہے کہ تم نے اپنے فرزند کو قرآنِ مجید پڑھایا اور اسے دینِ اسلام کی سوجھ بوجھ رکھنے والا بنایا اور پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے جانشین علیؑ کی دوستی کی جانب اس کی رہنمائی کی اور ان کی نورانی تعلیمات اپنے فرزند کو سکھائیں"۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ بچوں کی تربیت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک بے حد مختصر نمونہ تھا اور جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے ان تعلیمات نے پہلی اور دوسری صدی ہجری میں مسلمان بچوں میں سے بڑے بزرگ اور باشخصیت عالم اور لائق، دلاور اور مہذب مرد اور عورتیں پیدا کیں۔ یہ وہ مرد تھے جو فضیلت اور انسانیت کے میدان میں سب پر سبقت لے گئے۔ اور وہ عورتیں تھیں جو عفت اور پاکدامنی میں دنیا کی تمام عورتوں کی سرِ دفتر تھیں۔

انہی تعلیمات کی روشنی میں اور اسی لائحۂ عمل پر عمل درآمد کر کے اسلامی معاشرہ انسانی معاشروں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرہ بن گیا اور مسلمان صدیوں تک تمام دنیا میں تمدن اور علم و دانش کے علمبردار رہے لیکن جس دن سے مسلمانوں پر مغربی تربیتی نظام کا رنگ چڑھا اور بعض سطحی اور بے شخصیت مسلمانوں نے غیروں کے خام اور بے بنیاد طور طریقوں کو بطورِ نمونہ اپنایا اسی دن سے زندگی کے تمام شعبوں میں گوناگوں مشکلات اور بے سروسامانیاں پیدا ہو گئیں۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مُسلم بِنائے ملت مٹا رہے ہیں!
یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

---

[1] مستدرک الوسائل - جلد اوّل - صفحہ ۲۹۰

غضب ہیں یہ "مرشدانِ خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے!
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزّت بنا رہے ہیں
(اقبالؔ)

موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو اپنے اُس لازمی اور زندہ جاوید دینی لائحہ عمل سے نابلد ہیں جس میں ان کی زندگی کا راز مضمر ہے۔

ان مباحث کی اشاعت اس مقصد سے کی جا رہی ہے کہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے حقائقِ اسلام کا ایک سلسلہ لوگوں کے اذہان میں سما جائے اور دینی احکام سے آگاہی کی جانب قدم اٹھایا جا سکے۔ امّید ہے کہ اسلام کے احکام کی جانب توجّہ دینے اور اس کی نورانی تعلیمات پر عمل کرنے سے مسلمان ایک بار پھر اپنی گزشتہ شان و شوکت حاصل کر لیں گے اور اپنے اندوہناک ماضی کی تلافی کر دیں گے۔

اسلام میں قرضِ حسنہ

اسلام شخصی ملکیت کو جائز سمجھتا ہے اور جو شخص شرعی طریقوں سے دولت حاصل کرے اُسے اس کا مالک قرار دیتا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ سرمائے کو ایک جگہ جمع ہونے سے روکنے کے لیے خاص قواعد وضوابط مقرّر کیے گئے ہیں جن کے اجرا سے ملتِ اسلامیہ کبھی بھی دورِ حاضر کے سرمایہ دارانہ نظام سے پیدا ہونے والی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں میں مبتلا نہیں ہوسکتی ۔

ان قانونی اور واجب فرائض کے علاوہ جو اہلِ ثروت مسلمانوں پر محروم طبقوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے اپنے مال میں سے کچھ حصّہ الگ کرنے کے سلسلے میں عائد ہوتے ہیں اسلام نے اُنھیں اخلاقی اور وجدانی نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ اجتماعی فرائض بجا لانے کی دعوت دی ہے اور اس کے عوض ان سے دنیاوی اور اُخروی اجر کا وعدہ کیا ہے۔

جو ذمّے داریاں اسلام نے خاص طور پر دولت مند مسلمانوں پر عائد کی ہیں ان میں سے ایک حاجت مندوں کو قرض دینا ہے جسے " قرض حسنہ " کا نام دیا گیا ہے۔

اس قسم کے قرضوں کی صورت میں اصل زر سے زائد کوئی چیز لینا حرام گردانا گیا ہے اور سود خوری کو ایک غیر قانونی عمل قرار دیا گیا ہے ۔

اِس قسم کا قرضہ ایک طرح کی اجتماعی امداد ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دینی عبادت کا حکم بھی رکھتا ہے حتّٰی کہ ایسے قرضوں کو اسلامی روایات میں صدقہ دینے سے بھی بہتر اور زیادہ فضیلت کا حامل قرار دیا گیا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ صدقہ کسی ایسے شخص کو دیا جائے جو واقعی حاجتمند نہ ہو لیکن قرضہ عموماً حاجتمند کو ہی دیا جاتا ہے اور وہی شخص اپنے آپ کو قرضے کے زیر بار کرتا ہے جسے اس کی ضرورت ہو۔ [1]

اِس قسم کا قرضہ نہ صرف یہ کہ معاشرے کے لیے مُضر نہیں اور سود خوری کی طرح خاندانوں کی بربادی کا موجب نہیں بنتا بلکہ لوگوں کی مالی مشکلات حل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اور لوگوں کے باہمی روابط مستحکم کرنے اور ان کے مابین دوستی اور محبّت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اسلام نے اس قسم کی اعانت کو جو لوگوں کی حالت بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ گداگری کے زُمرے میں بھی نہیں آتی بڑی اہمیّت دی ہے اور مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ اِس قسم کی معاشرتی خدمات انجام دیں اور اہلِ ایمان کی حاجتیں رفع کریں۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا:

مَا قَضٰی مُسْلِمٌ لِمُسْلِمٍ حَاجَةً اِلَّا نَادَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلَيَّ ثَوَابُكَ وَلَا اَرْضٰى لَكَ بِدُوْنِ الْجَنَّةِ [2]

"جو مسلمان اپنے دینی بھائی کی حاجت بر لائے اور اس کی ضرورت پوری کرے اللہ تعالیٰ اُس سے فرماتا ہے کہ تیری جزا میرے پاس ہے اور میں تیرے لیے بہشت سے کم جزا پسند نہیں کرتا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا:

مَنْ اَجْرَى اللّٰهُ عَلٰى يَدِهٖ فَرَجًا لِمُسْلِمٍ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۲۴ [2] ثواب الاعمال

كَرُبَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ [1]

"جس شخص کے ہاتھ سے اس کے مسلمان بھائی کے کام میں کشائش ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے دُنیا اور آخرت کے رنج و غم دُور فرما دے گا۔"

ابنِ عباس کہتے ہیں:

"امام حسن المجتبیٰ علیہ السّلام نے مسجد الحرام میں اعتکاف کیا اور خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھے کہ شیعوں میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

"یا ابن رسول اللہ! مجھے فلاں شخص کا کچھ قرضہ ادا کرنا ہے اگر ممکن ہو تو آپ میرا قرضہ ادا کر دیں۔"

امام عالی مقامؑ نے جواب دیا:

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس رقم نہیں ہے۔"

اس شخص نے کہا: "پھر آپ مجھے قرضخواہ سے مہلت دلوا دیجیے۔ اُس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے قرضہ ادا نہ کیا تو وہ مجھے قید خانے میں ڈلوا دے گا۔"

امام علیہ السّلام نے اپنا طواف قطع کیا اور اس شخص کے ساتھ چل دیے تاکہ اس کے قرضخواہ کے پاس جائیں اور اس سے مہلت حاصل کریں۔"

ابنِ عباس کہتے ہیں: میں نے کہا:

"یا ابن رسول اللہ! کیا آپ بھول گئے ہیں کہ آپ نے مسجد میں اعتکاف کیا ہے؟" (کیونکہ معتکف اعتکاف ختم ہونے سے پہلے مسجد سے باہر جانے کا حق نہیں رکھتا)۔ آپ نے فرمایا:

---

[1] امالی۔ شیخ طوسیؒ

"میں بھولا نہیں ہوں لیکن میں نے اپنے والدِ بزرگوار سے سُنا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "جو شخص اپنے باایمان بھائی کی حاجت بر لائے وہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے سالہاسال اللہ تعالیٰ کی عبادت اور شب زندہ داری میں گزارے ہوں"۔ [1]

امام الباقر علیہ السّلام نے فرمایا:

مَنْ اَقْرَضَ قَرْضًا اِلٰی مَیْسَرَةٍ کَانَ مَالُہٗ فِیْ زَکٰوةٍ وَکَانَ هُوَ فِیْ صَلٰوةٍ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ عَلَیْهِ حَتّٰی یَقْضِیَهٗ [2]

"جو شخص کسی حاجتمند کو رقم بطور قرض دے اور اسے اتنی مہلت دے کہ اس کے کاروبار میں کشائش پیدا ہوجائے تو اس کا مال زکوٰۃ کے حکم میں ہے اور فرشتے اس دن تک اس کے حق میں دعا کرتے ہیں اور اس پر سلام بھیجتے ہیں جس دن وہ اپنا قرضہ وصول کرے"۔

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اس آیۂ شریفہ میں جو لفظ "معروف" استعمال ہوا ہے وہ لوگوں کو قرض دینے کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَیْنَ النَّاسِ [3]

"لوگوں کی محرمانہ گفتگو میں خیر کا کوئی پہلو نہیں بجز اس کے کہ وہ آپس میں حاجتمندوں کو صدقہ دینے، محتاجوں کے لیے قرضہ فراہم کرنے اور لوگوں کے مابین صُلح کرانے کی دعوت دیں"۔ [4]

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۵۶ [2] من لایحضرہ الفقیہ۔ صفحہ ۳۶۱

[3] سورۃ النساء۔ آیت ۱۱۴ [4] من لایحضرہ الفقیہ۔ صفحہ ۳۶۱

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا:

مَنْ اَقْرَضَ قَرْضاً وَضَرَبَ لَهُ اَجَلاً فَلَمْ يُؤْتَ بِهٖ عِنْدَ ذَالِكَ الْاَجَلِ كَانَ لَهُ مِنَ الثَّوَابِ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ يَتَاَخَّرُ عَنْ ذَالِكَ الْاَجَلِ بِمِثْلِ صَدَقَةِ دِيْنَارٍ وَاحِدٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ۔ (ثواب الاعمال ۔ صفحہ ۷۶)

"اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو قرضہ دے اور اس کی ادائیگی کے لیے ایک مدّت مقرّر کرے لیکن مقروض مقرّرہ مدّت میں قرضہ ادا نہ کرسکے اور وہ (یعنی قرضخواہ) اسے مہلت دے دے تو جتنی مہلت وہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر دن کے بدلے میں ایک صدقہ اس کے نامۂ اعمال میں درج فرماتا ہے۔"

پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں:

اَلْفُ دِرْهَمٍ اُقْرِضُهَا مَرَّتَيْنِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَتَصَدَّقَ بِهَا مَرَّةً۔ (تہذیب ۔ جلد دوم ۔ صفحہ ۶۱)

"اگر میں اپنے مال میں سے ہزار درہم اپنے دینی بھائیوں کو دو مرتبہ بطورِ قرضِ حسنہ دوں تو میرے نزدیک یہ اس سے بہتر ہے کہ میں وہ تمام کے تمام ایک بار ہی اللہ کی راہ میں خرچ کردوں۔"

یہ تاکیدی احکامات اس لیے دیے گئے ہیں تاکہ مسلمان مادّی فوائد کو مدِّنظر رکھے بغیر اور سود پرستی میں آلودہ نہ ہوتے ہوئے اپنے مال کے ذریعے کاروبار میں وسعت کا موجب بنیں تاکہ مسلمان سود پرستی میں آلودہ نہ ہوتے ہوئے اپنے مال کے ذریعے کاروبار کو وسعت دیں اور مادّی فوائد کو مدِّنظر رکھے بغیر اپنے دینی بھائیوں کی فلاح وبہبود کے اسباب فراہم کریں۔

سُودی کاروبار کی ممانعت

ان فضیلتوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا کا تعلق اس شخص سے ہے جس کا قرضہ دینے کا مقصد حصّہ بٹانا یا سود لینا نہ ہو بلکہ وہ اس کام کا اقدام انسانیت کی خاطر اور فقط اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرے۔

اگر قرضہ دیا جائے اور اس کے عوض کوئی حصّہ معیّن کر لیا جائے یا وصول کیا جائے تو پھر یہ قرضِ حسنہ نہیں رہے گا بلکہ سود خوری تصوّر ہو گا جسے اسلام نے صرف کبیرہ گناہوں میں شمار ہی نہیں کیا ہے بلکہ سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

سورۂ بقرہ کی ربا (سُود) سے مربوط آیات کے سلسلے میں تفسیر المیزان میں لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ربا کے بارے میں اتنی سختی کا اظہار فرمایا ہے جتنا دشمنانِ دین سے دوستی کے علاوہ کسی فروعِ دین کے بارے میں نہیں فرمایا۔ جو کچھ دوسرے کبیرہ گناہوں مثلاً زنا، شراب نوشی، قمار بازی حتّٰی کہ آدم کُشی کے بارے میں کہا گیا ہے گو اس کا انداز بھی بہت تند و تیز ہے لیکن پھر بھی اُن کا لہجہ اِن دو گناہوں سے متعلق آیات کے لہجے تک نہیں پہنچتا۔ اس سختی کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے گناہوں کے بُرے اثرات ایک یا چند اشخاص سے تجاوز نہیں کرتے لیکن ان دو گناہوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین کی بنیاد تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ معاشرے کا نظام متزلزل ہو جاتا ہے اور پاک انسانی فطرت آلودہ ہو جاتی ہے۔ تاریخ کے دھارے نے ان دو گناہوں سے پیدا ہونے والے خطرات کے بارے میں مقنّنِ اسلام کے نقطۂ نظر کی صحّت کو واضح کر دیا کیونکہ دین کے دشمنوں سے دوستی مسلمانوں کو ایک ایسی خطرناک پستی کی جانب کھینچ لے گئی کہ وہ دینی اور دنیاوی شان و شوکت سے محروم ہو گئے

اور شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ اپنے مال، جان اور آبرو کے مالک بھی نہ رہے اور موت اور زندگی کے درمیان ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ سودی کاروبار کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو گئی اور معاشرہ دو طبقوں یعنی امیر اور غریب میں تقسیم ہو گیا بالآخر اس کا نتیجہ عالمی جنگ کی صورت میں نکلا اور ایسا فتنہ برپا ہوا جس نے پہاڑوں کو لڑ ھکا دیا اور زمین کو لرزا دیا اور اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں نوعِ انسانی صفحہ ہستی سے ہی نہ مٹ جائے چنانچہ اس کا انجام جو ہوا سو ہوا"۔[1]

اسلام نے بے حد کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے مابین خلوص، امدادِ باہمی اور مہربانی کی رُوح اپنی بہترین صورت میں برقرار رہے۔ سود خوری ایک ایسا اقتصادی مُبادلہ ہے جو ان جذبات اور تعلقات کو کمزور کر دیتا ہے، گہری دشمنی اور کینے کے بیج دلوں میں بو دیتا ہے اور معاشرے کی فضا کو انتقام کے جذبے سے آلودہ کر دیتا ہے۔

سود خوری کا نظام اس بنیاد پر قائم ہے کہ سود خور ہر حالت میں خواہ قرضہ لینے والے نے اس سے نفع حاصل کیا ہو یا نقصان اُٹھایا ہو، اپنی رقم پر سود لے لیتا ہے۔ اُسے مقروض کے نقصان کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ مقروض بیچارہ خواہ دیوالیہ ہی کیوں نہ ہو جائے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سود کی رقم بے کم و کاست ادا کرے جبکہ یہ اندوہناک صورت عدل و انصاف اور انسان کی عالی صفات کے معیار پر ہرگز پوری نہیں اترتی۔ عدل و انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر سود خور مقروض کو حاصل ہونے والے منافع میں سے سود لے تو اُسے جو نقصان ہو اس میں بھی حصے دار بنے۔ یہ تو کھُلی ناانصافی ہے کہ وہ ہمیشہ سود وصول کرنے کے درپے رہے اور مقروض کے نقصان سے اُسے کوئی سروکار نہ ہو۔ ایسے معاملے کی بنیاد فقط سو فی صد ذاتی نفع جوئی پر ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان - علّامہ محمد حسین طباطبائی - جلد دوّم

مقروض جانتا ہے کہ سود خور اپنا روپیہ نادار اور بے سرمایہ لوگوں کے استحصال کے لیے استعمال کرتا ہے اور اگرچہ وہ بہ امرِ مجبوری اس معاملے پر رضامند ہو جاتا ہے لیکن اس کی غیر منصفانہ اور خلافِ انسانیّت حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔

سود خوری کے نظام میں عموماً حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ مقروض اپنے گلے پر سود خور کے پنجے کا دباؤ بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ جب سود دینے والے بطور قرض لی گئی رقم سے کوئی منافع حاصل نہ کر سکیں لیکن سود کی رقم بڑھ کر اصل زر کا کئی گُنا ہو جائے اور بیچارے مقروض کی زندگی خطرے میں پڑ جائے تو پھر کیا صورت ہو گی؟ ایسے موقع پر اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ مقروض کا سارا وجود سود خور پر لعنت بھیجے اور اس کے خون کا پیاسا ہو جائے۔

ایسے ہی نازک حالات بہت سے وحشتناک اور تباہ کن جرائم کو جنم دیتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب مقروض اشخاص بے بس ہو جاتے ہیں تو وہ قرضخواہ کو بڑے ہولناک طریقے سے قتل کر دیتے ہیں اور یوں ان کے گھرانوں کو سرپرستوں سے محروم کر دیتے ہیں اور ان کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے مقروض ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی سے اس قدر بیزار ہو جاتے ہیں کہ اپنی زندگی ختم کرنے اور اقدامِ خودکُشی کرنے کے علاوہ انھیں اور کوئی راہِ نجات نظر نہیں آتی۔ ایوان ہائے عدالت خودکُشی کی ان ہولناک وارداتوں کے خونی مناظر کے گواہ ہیں اور روزناموں کے صفحات میں بھی قتل اور خودکشی کی ایسی بہت سی وارداتوں کی خبریں چھپتی ہیں جو سودی کاروبار کے نتیجے کے طور پر وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

آئیے، ایک سود خور شخص پر روحانی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالیں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اخلاق کو خیرباد کہہ رکھا ہے۔ اُسے فقط اپنے بہت بڑے اور مُفت ہاتھ آنے والے منافع کی فکر رہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ مقروض پر ہر قسم کا دباؤ ڈالنے

کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ انسانی احساسات سے عاری ہوتا ہے۔ ان اشخاص میں ایک خاص قسم کی قساوت اور بے رحمی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ہر چیز کو مادّی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تمام روحانی اور انسانی شخصیت سود خوری میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ سود پرستی انھیں اس قابل نہیں چھوڑتی کہ وہ مقروض کے حق میں سود خور کے خطرناک عواقب کو سمجھ سکیں۔ ان کی اخلاقی تشخیص کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ سود خوروں کے روحانی جمود اور کثافت کی اس حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

"جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا سوچنے کا انداز اور طور طریقے اس شخص سے ملتے ہیں جو شر کے عوامل کے زیرِ اثر خبط اور عقلی انحطاط سے دوچار ہو گیا ہو۔" [1]

سود خوری، سود خوروں کے اخلاق میں ان نقصانات اور نتائج کا موجب بنتی ہے۔ سود خوری کے نقصانات فقط اسی حد تک نہیں ہیں بلکہ یہ بہت سی معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی خرابیوں کا سبب بھی بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اسے اللہ تعالیٰ کے خلاف جنگ قرار دیا گیا ہے:

"اے ایمان والو! تقویٰ کو اپناؤ اور مقروض لوگوں کے ذمّے جو سود کی باقی رقم ہو اُسے چھوڑ دو بشرطیکہ تم واقعی ایمان رکھتے ہو اور اگر تم سود کی حُرمت کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو اور سود خوری کو ترک نہیں کرنا چاہتے تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو اور اگر تم توبہ کر لو اور اس کام سے دست بردار ہو جاؤ تو مقروض سے اپنا اصل مال وصول کر لو تاکہ سود خوری کے ذریعے تم ظلم نہ کرو اور نہ ہی تم پر ظلم ہو اور تمھارا مال ضائع نہ ہو جائے اور اگر تمھارے مقروض تنگی اور ناداری میں مبتلا ہوں تو انھیں مہلت دے

---

[1] سورۃ البقرۃ - آیت ۲۷۵

دو حتیٰ کہ ان کے کام میں کشائش پیدا ہو جائے اور اگر اُن کا قرضہ معاف کر دو اور صدقہ کر دو تو تمھارے لیے بہتر ہوگا۔" [1]

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ [2]

"اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ سوائے اس کے کہ تمھارے مابین باہمی رضامندی سے کوئی سودا طے پا جائے۔"

امام الباقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اس آیۂ شریفہ میں "باطل" سے مراد سود خوری، قمار بازی، خریدار کو فریب دینا اور ظلم کرنا ہے۔ [3]

قرآن مجید نے گناہوں کا مرتکب ہونے، سود کھانے اور ایک دوسرے کے اموال اور حقوق کا احترام نہ کرنے کے سبب یہودیوں پر تنقید کی ہے اور فرمایا ہے:

"یہودیوں کی ستمگاری کی وجہ سے ہم نے وہ پاکیزہ چیزیں جو پہلے ان پر حلال تھیں حرام کر دیں۔ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اگرچہ انھیں سود خوری سے منع کیا گیا تھا لیکن وہ سود کھاتے تھے اور لوگوں کا مال ناحق اور غیر شرعی طور پر اپنے تصرف میں لاتے تھے اور ہم نے کافر یہودیوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر دیا ہے۔" [4]

مفسرین نے کہا ہے کہ یہودی فیصلہ کرنے وقت رشوت لیتے تھے اور کتابیں لکھتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں اور یوں ان سے رقمیں وصول کرتے تھے۔

---

[1] سورۃ البقرۃ - آیات ۲۷۸ تا ۲۸۰ [2] سورۃ النساء - آیت ۲۹

[3] تفسیر مجمع البیان [4] سورۃ النساء آیات ۱۶۰، ۱۶۱

مقروض کی جانب سے ہدیہ

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ حرام سود سے مراد یہ ہے کہ قرضہ دینے والا قرضہ دیتے وقت قرضہ لینے والے سے طے کرے کہ وہ قرضے کی رقم سے کچھ زیادہ واپس کرے گا لیکن اگر قرضہ دینے والا بغیر کسی شرط کے قرضِ حسنہ کے طور پہ رقم دے اور مقروض قرضہ واپس کرتے وقت اصل زر سے کچھ زیادہ دے دے تو نہ صرف یہ کہ ایسا کرنا حرام نہیں ہے بلکہ وہ ایک جائز مستحب کام انجام دیتا ہے۔

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا:

اَلرِّبَا رِبَاآنِ اَحَدُ هُمَا رِبًا حَلَالٌ وَالْاٰخَرُ حَرَامٌ

"قرضے سے دو طرح منافع حاصل کیا جا سکتا ہے جن میں سے ایک طریقہ حلال اور دوسرا حرام ہے۔ منافع کی حلال قسم یہ ہے کہ کوئی شخص حصّہ حاصل کرنے کی غرض سے کسی شرط یا معاہدے کے بغیر کچھ رقم بطور قرض دے۔ اس صورت میں اگر قرض لینے والا کوئی چیز اُسے دے تو وہ چیز اس کے لیے مُباح ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کوئی اجر نہیں ہے اور حرام منافع یہ ہے کہ قرضہ دینے والا شرط عائد کرے کہ اُسے قرضے کی رقم سے کچھ زیادہ واپس کیا جائے گا۔ یہ عمل غیر مشروع اور حرام ہے۔"

امام محمد الباقر علیہ السّلام سے پوچھا گیا:

"اگر ایک شخص کا قرضہ کسی دوسرے شخص کے ذمّے ہو اور مقروض اس کے لیے کوئی ہدیہ بھیجے تو آیا حلال ہوگا یا حرام؟"

آپ نے فرمایا:

لَا بَأْسَ بِهَا

"بلاشک و شبہ حلال ہوگا"۔ [1]

اس موضوع پر اسلامی روایات بہت ہیں اور ان سب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بینکاری کا نظام صحیح خطوط پر چلایا جاسکتا ہے جس کے مطابق سرمائے کے مالکوں کے حقوق بھی محفوظ رہیں اور قرضہ لینے والے بھی بھاری منافع کی ادائیگی کی وجہ سے پریشانی اور تکلیف میں مبتلا نہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ کارکنوں کی تنخواہوں، ان سے متعلق کیے جانے والے دیگر اخراجات اور ان سے متعلقہ اسناد اور دستاویزات کی تیاری کا سود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس موضوع پر مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے قارئین کرام شیعی دنیا کے جیّد عالم آیت اللہ سیّد محمد باقر صدر طاب ثراہ کی کتاب "اقتصادنا" اور "البانک اللاربوی فی الاسلام" (اسلام میں بلا سود بینکاری) اور دیگر مسلمان علماء کی لکھی ہوئی دوسری کتابوں سے رجوع فرمائیں۔

لوگوں کے حقوق کی ادائیگی

اسلام نے قرضِ حسنہ دینے اور سود خوری سے اجتناب برتنے کے بارے میں جو احکام دیے ہیں ان کے ساتھ ساتھ قرضہ لینے والوں سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ قرضے کی ادائیگی کی انتہائی کوشش کریں۔

اسلامی قواعد و ضوابط کے قرض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی ادائیگی کی مدت طے کرلی گئی ہو۔ اس کے مطابق قرضخواہ مقرّرہ تاریخ کے آنے سے پہلے اس قسم کے قرضے کی ادائیگی کے مطالبے کا کوئی حق نہیں رکھتا ماسوا اس کے کہ مقروض مرجائے کیونکہ اس صورت میں قرضخواہ ترکے کی تقسیم سے پہلے اپنے قرضے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور

[1] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۹۲

اسے وصول کر سکتا ہے۔

دوسری قسم کا قرضہ وہ ہے جس کی ادائیگی کی مدّت معیّن نہ کی گئی ہو۔ جب بھی قرضخواہ اس قسم کے قرضے کا مطالبہ کرے مقروض پر واجب ہے کہ وہ بلا تاخیر اس کی ادائیگی کر دے خواہ اسے اس مقصد کے لیے بعض ایسی چیزیں فروخت ہی کیوں نہ کرنی پڑیں جو زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری نہ ہوں۔ اور اگر وہ ادائیگی میں کوتاہی کرے تو گناہ کا مرتکب ہوگا۔

پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں:

مَنْ مَطَلَ عَلٰى ذِىْ حَقٍّ حَقَّهٗ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى اَدَآءِ حَقِّهٖ فَعَلَيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَطِيْئَةُ عَشَّارٍ [1]

"جو شخص لوگوں کا حق ادا کرنے میں کوتاہی اور لاپروائی برتے حالانکہ وہ اسے ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو ہر دن کی تاخیر کے بدلے میں دس گُنا گُناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں۔"

امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

مَنِ اسْتَدَانَ دَيْنًا فَلَمْ يَنْوِ قَضَائَهٗ كَانَ بِمَنْزِلَةِ السَّارِقِ [2]

"جو شخص قرض لے اور اس کی واپسی کا ارادہ نہ رکھتا ہو وہ بمنزلہ چور کے ہے۔"

امامؑ نے ایک اور جگہ یوں فرمایا:

اَيُّمَا رَجُلٍ اَتٰى رَجُلًا فَاسْتَقْرَضَ مِنْهُ مَالًا وَفِىْ نِيَّتِهٖ اَنْ لَّا يُؤَدِّيَهٗ فَذٰلِكَ اللِّصُّ الْعَادِىْ [3]

---

[1] وسائل الشیعہ   [2] فروع الکافی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۵۵

[3] من لایحضرہ الفقیہ۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۶۰

"جو شخص قرضہ حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص سے رجوع کرے اور اس کا ارادہ اس کی واپسی کا نہ ہو وہ ایک ظالم چور ہے۔"

امام الباقر علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

كُلُّ ذَنْبٍ يُكَفِّرُهُ الْقَتْلُ فِي سَبِيْلِ اللهِ اِلَّا الدَّيْنَ لَا كَفَّارَةَ لَهُ اِلَّا اَدَائُهُ اَوْ يَقْضِيَ صَاحِبُهُ اَوْ يَعْفُوَ الَّذِيْ لَهُ الْحَقُّ [1]

"اللہ کی راہ میں شہادت ہر گناہ کی تلافی کر دیتی ہے بجز لوگوں کے قرضے کے جس کی تلافی کوئی چیز نہیں کر سکتی سوائے اس کے کہ وہ شخص اپنا قرضہ خود ادا کرے یا اس کا وصی اور ولی اسے بیباق کر دے یا قرضخواہ اسے معاف کر دے۔"

معاویہ بن وہب کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام سے عرض کیا:

"میں نے سُنا ہے کہ انصار میں سے ایک شخص فوت ہو گیا جب کہ وہ دو دینار کا مقروض تھا۔ رسولِ اکرمؐ نے اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھی اور اس کے لواحقین سے فرمایا کہ جاؤ اور خود اس پر نماز پڑھو۔ اس کے رشتہ داروں نے اس کا قرضہ ادا کرنے کی ذمّے داری قبول کر لی تب آنحضرتؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔"

امام الصّادق نے فرمایا:

"یہ حدیث درست ہے اور رسولِ اکرمؐ نے یہ کام اس لیے کیا تاکہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں اور اپنے مقروض ہونے کو معمولی چیز نہ سمجھیں اور جو کچھ کسی کا دینا ہو وہ ادا کریں۔"

امام محمد الباقر علیہ السّلام نے فرمایا:

---

[1] وسائل الشّیعہ۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۸۳

اَوَّلُ قَطْرَةٍ مِنْ دَمِ الشَّهِيْدِ كَفَّارَةٌ لِذُنُوْبِهٖ اِلَّا الدَّيْنَ فَاِنَّ كَفَّارَتَهُ قَضَائُهُ [1]

"شہید کے خون کا جو پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے وہ اس کے گناہوں کا کفّارہ ہوتا ہے بجز اُس کے قرضوں کے کیونکہ ان کا کفّارہ فقط ان کا ادا کرنا ہے"

عَنْ اَبِیْ ثُمَامَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ جَعْفَرِ الثَّانِیْ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنِّیْ اُرِيْدُ اَنْ اُلَازِمَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةَ وَعَلَیَّ دَيْنٌ فَقَالَ ارْجِعْ اِلٰى مُؤَدّٰى دَيْنِكَ، وَانْظُرْ اَنْ تَلْقَى اللّٰهَ وَلَيْسَ عَلَيْكَ دَيْنٌ، فَاِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَخُوْنُ [2]

"ابی ثمامہ کہتا ہے: میں نے امام محمد التقی علیہ السلام سے عرض کیا: "میں نے طے کیا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں سکونت اختیار کروں لیکن مجھے لوگوں کا کچھ قرض دینا ہے آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟"

امامؑ نے فرمایا: "اپنے شہر کو واپس جاؤ حتّٰی کہ اپنا قرضہ ادا کردو اور کوشش کرو کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت (موت کے وقت) کسی کے مقروض نہ ہو کیونکہ باایمان شخص خیانت نہیں کرتا"

اس حدیث میں امام نے قرضہ ادا کرنے میں سُستی اور لاپروائی برتنے اور لوگوں کو ان کے حقوق ادا نہ کرنے کو خیانت کہا ہے جیسے کہ رسولِ اکرمؐ نے اُسے مسلمانوں پر ظلم قرار دیا ہے۔

عَنْ عَلِیٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) يَقُوْلُ مَطْلُ الْمُسْلِمِ الْمُوْسِرِ ظُلْمٌ لِلْمُسْلِمِيْنَ [3]

---

[1] وسائل الشیعہ - جلد ۱۳ - صفحہ ۸۵ [2] علل الشرائع - صفحہ ۱۷۸

[3] الکافی

امام علیؑ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ:

"کسی ایسے شخص کا اپنا قرضہ ادا کرنے میں لاپرواہی برتنا جو ادائیگی کی قدرت رکھتا ہو مسلمانوں پر ظلم ہے۔"

ان دو احادیث میں لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں لاپرواہی برتنے کو اسلامی معاشرے کے خلاف خیانت اور ظلم قرار دیا گیا ہے اور یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کیونکہ ایک معاشرے میں لوگوں کی اقتصادی حالت ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہے۔ جس طرح ایک شخص دوسرے کا مقروض ہے ممکن ہے وہ قرضخواہ بھی کسی تیسرے شخص کا اور وہ تیسرا کسی اور کا مقروض ہو۔ اگر ان میں سے ایک شخص بھی خیانت کا مرتکب ہو اور اپنے قرضے کی ادائیگی میں لاپرواہی اور کوتاہی برتے تو ممکن ہے کہ دوسرا بھی اپنا قرضہ ادا نہ کر سکے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ یوں ایک شخص کی خیانت کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک گروہ کا گروہ مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی معاشرے کی بنیاد باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کے حقوق کے احترام پر رکھی گئی ہے اور اگر کوئی شخص اپنے بُزدلانہ فعل یعنی لوگوں کے حقوق سے لاپرواہی برتتے ہوئے عمومی اعتماد کو ٹھیس پہنچائے تو بلاشبہ وہ مسلمانوں کے معاشرے کے خلاف خیانت اور ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسلام دوسروں کے حقوق پامال کرنے کو ظلم اور ناقابلِ معافی گناہ تصوّر کرتا ہے اور اس گناہ سے توبہ کو اس بات پر منحصر سمجھتا ہے کہ یہ حقوق ادا کیے جائیں۔

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ: اَلظُّلْمُ ثَلَاثَةٌ: ظُلْمٌ یَغْفِرُهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَظُلْمٌ لَا یَغْفِرُهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَظُلْمٌ لَا یَدَعُهُ، فَاَمَّا الظُّلْمُ الَّذِیْ لَا یَغْفِرُهُ اللّٰهُ فَالشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَاَمَّا الظُّلْمُ الَّذِیْ یَغْفِرُهُ اللّٰهُ فَظُلْمُ الرَّجُلِ نَفْسَهُ فِیْمَا بَیْنَهُ وَبَیْنَ اللّٰهِ وَاَمَّا

اَلظُّلْمُ الَّذِیْ لَا یَدَعُهٗ فَالْمُدَایَنَةُ بَیْنَ الْعِبَادِ [1]

امام محمد الباقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ اوّل وہ ظلم جو کسی طرح بھی درگاہِ الٰہی سے معاف نہیں ہوسکتا اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔ دوّم وہ ظلم جو قابل معافی ہے اور وہ، وہ گناہ ہیں جو بندے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے مابین رکھتے ہیں اور سوّم وہ ظلم جس سے اللہ تعالیٰ درگزر نہیں کرتا اور وہ لوگوں کے حقوق اور قرضے ہیں۔"

اسلام نے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر حکم دیا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص فوت ہوجائے جو لوگوں کا مقروض ہو تو اس کے کفن دفن کے اخراجات پورے کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کا قرضہ ادا کیا جائے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ص)، اَوَّلُ شَیْئٍ یُبْدَءُ بِهٖ مِنَ الْمَالِ الْکَفَنُ، ثُمَّ الدَّیْنُ، ثُمَّ الْوَصِیَّةُ، ثُمَّ الْمِیْرَاثُ [2]

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جو شخص دنیا سے رحلت کر جائے تو پہلے اس کے مال سے کفن کے اخراجات ادا کیے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے، اگر اس نے کوئی وصیّت کی ہو تو پھر اس پر عمل کیا جاتا ہے اور اگر کوئی چیز بچ جائے تو وہ وارثوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔"

شیعہ مراجع تقلید اس مسئلے پر متّفق ہیں کہ اگر مقروض اپنا قرضہ ادا کرنے پر قادر ہو اور قرضخواہ بھی مطالبہ کرے تو وہ یہ حق نہیں رکھتا کہ وقت کی وسعت میں نماز پڑھے بلکہ اسے چاہیے کہ پہلے اپنا قرضہ ادا کرے اور بعد میں نماز پڑھے۔ فتویٰ کی اصل عبارت کی

---

[1] خصال صدوق، جلد اوّل، صفحہ ۱۳۴ [2] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۹۱

جانب توجّہ فرمائیے:

"اگر وقت کی وسعت میں کوئی شخص نماز میں مشغول ہو اور قرضخواہ اس سے اپنا قرضہ طلب کرے تو اگر وہ نماز کے دوران قرضہ ادا کرسکتا ہو تو اسے چاہیئے کہ اسی حالت میں ادا کرے اور اگر نماز توڑے بغیر قرضے کی ادائیگی ممکن نہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ نماز توڑ دے اور اس کا قرضہ ادا کرے اور بعد میں نماز پڑھے۔[1] اگر مقروض قرض ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور قرضخواہ بھی تقاضا کر رہا ہو تو اس کا (یعنی مقروض کا) اوّل وقت میں نماز پڑھنا حرام ہے۔[2] اگر قرضخواہ نے قرضے کا مطالبہ کیا ہو اور اس کی ادائیگی نماز توڑنے پر منحصر ہو تو مقروض پر واجب ہے کہ اگر وقت وسیع ہو تو نماز توڑ دے اور اپنا قرضہ ادا کرے۔"[3]

مقروض کے گھر پر قبضہ نہیں کرنا چاہیئے

ان تاکیدات کے باوجود جو اسلام نے لوگوں کے حقوق کے احترام اور قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں کی ہیں اور قرض ادا کرنے میں کوتاہی کو ظلم، خیانت اور گناہ قرار دیا ہے وہ ساتھ ہی ساتھ قرضخواہوں کو بھی سفارش کرتا ہے کہ جو لوگ ان کے مقروض ہوں انہیں مہلت دیں اور انھیں پریشانی اور مشکلات میں مبتلا نہ کریں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

كَمَا لَا يَحِلُّ لِغَرِيمِكَ اَنْ يَمْطُلَكَ وَهُوَ مُوسِرٌ فَكَذَالِكَ

---

[1] توضیح المسائل محشی بحاشیۂ ۹ نفر از مراجع تقلید۔ مسئلہ ۱۱۷۰

[2] جامع عباسی۔ تالیف مرحوم شیخ بہائی۔ صفحہ ۱۴۴

[3] عروۃ الوثقیٰ۔ صفحہ ۲۵۲

لَا يَحِلُّ لَكَ اَنْ تُعْسِرَهُ اِذَا عَلِمْتَ اَنَّهُ مُعْسِرٌ [1]

"جیسے کہ تمھارے مقروض کے لیے جائز نہیں کہ جب قدرت رکھتا ہو تو قرضہ ادا کرنے میں کوتاہی کرے اسی طرح تمھارے لیے بھی جائز نہیں کہ جب تمھیں علم ہو کہ وہ مشکل میں ہے تم اس پر دباؤ ڈالو۔"

اسلامی احکام کے مطابق قرضخواہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مقروض کا رہائشی مکان اور ایسے لوازمِ زندگی جو اس کی حیثیت سے بڑھ کر نہ ہوں (مثلاً لباس، فرش، برتن وغیرہ) اپنے قرضے کی وصولیابی کے سلسلے میں اپنے قبضے میں لے لے یا انھیں فروخت کرا دے۔

امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

لَا تُبَاعُ الدَّارُ وَلَا الْجَارِيَةُ فِي الدَّيْنِ وَذَالِكَ اَنَّهُ لَا بُدَّ لِلرَّجُلِ مِنْ ظِلٍّ يَسْكُنُهُ۔ [2]

"قرضے کے لیے رہائشی مکان نہیں بیچا جا سکتا کیونکہ ہر کوئی مجبور ہے کہ اس کے پاس رہنے کو ایک گھر ہو۔"

محمد بن ابی عمیر ایک بزّاز تھا اور امام جعفر الصّادق ؑ کے با اخلاص شیعوں میں سے تھا۔ خلفائے بنی عبّاس کے ظلم و ستم کے نتیجے میں اس کی مالی حالت سخت خراب ہو گئی۔ تمام سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہا اور وہ خانہ نشین ہو گیا۔ اس کا ایک واقف کار اس کا دس ہزار درہم کا مقروض تھا۔ جب اس نے محمّد بن ابی عمیر کی افسوسناک حالت کے بارے میں سُنا تو اپنا رہائشی مکان بیچ دیا اور رقم محمّد کے پاس لے آیا۔

محمّد نے پوچھا: "یہ رقم کیسی ہے؟"

اس نے جواب دیا: "یہ اس قرضے کی رقم ہے جو مجھے تمھیں ادا کرنا ہے۔"

محمّد نے پوچھا: "کیا تمھیں کچھ مال ورثے میں ملا ہے؟"

---

[1] وسائل الشّیعہ۔ ابواب دَین، باب ۲۵ [2] الکافی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۵۴

اُس نے جواب دیا : "نہیں"۔

محمّد نے پھر دریافت کیا : "کیا کسی نے یہ رقم تمھیں بطور ہدیہ دی ہے ؟"

اس نے کہا "نہیں"۔

محمّد نے پوچھا : "کیا تمھاری کوئی غیر منقولہ جائداد تھی جو تم نے بیچ دی ہے ؟"

اُس نے جواب دیا : "ان میں سے کوئی بات نہیں ہے بلکہ جب میں نے تمھاری خراب مالی حالت دیکھی تو اپنا مکان بیچ دیا اور یہ رقم لے کر آیا ہوں تاکہ اپنا قرضہ ادا کر دوں"۔

محمّد بن ابی عمیر نے کہا : "گو میں اس رقم کے ایک ایک درہم کا محتاج ہوں لیکن میں اس میں سے ایک درہم بھی نہیں لوں گا کیونکہ میرے امام جعفر ابن محمّد الصّادق ؑ نے فرمایا ہے :

لَا يُخْرَجُ الرَّجُلُ مِنْ مَسْقَطِ رَأْسِهِ بِالدَّيْنِ۔

(کسی کو قرضے کی خاطر اس کے رہائشی مکان سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا)

یہ رقم اٹھا کر لے جاؤ اور اپنا مکان واپس لے لو"۔ [1]

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ :

اسلام سود خوری کا شدید مخالف ہے بالخصوص اس صورت میں کہ وہ لوگوں کے زیاں کا موجب ہو۔

قرضِ حسنہ بہت بڑی معاشرتی خدمت اور گرانبہا عبادات میں سے ہے ۔

سود خوری کسی وجہ سے اور کسی صورت میں بھی جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔

مسلمانوں پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں اور اپنے قرضے کی ادائیگی میں کوتاہی نہ برتیں۔

جب قرضخواہوں کو علم ہو کہ مقروض مشکل میں ہے تو انھیں چاہیئے کہ اسے مہلت

---

[1] وسائل الشّیعہ - جلد دوّم - صفحہ ۶۲۲

دیں حتیٰ کہ اس کے کاروبار میں کشائش پیدا ہو جائے۔

مقروض کے رہائشی مکان اور ضروریاتِ زندگی پر قرضے کے عوض تصرّف نہیں کیا جا سکتا۔

خاتمۂ کلام پر ہم برادرانِ ملّت کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسلام کے اقتصادی لائحۂ کار کا مطالعہ ان مفصّل کتابوں میں کریں جو اس مضمون پر لکھی گئی ہیں اور جن کی تعداد خوش قسمتی سے کم نہیں ہے۔ اس طرح وہ اسلام اور اس کے جاودانی احکام کی عظمت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے۔ اُنھیں چاہیے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس پر عملدرآمد بھی کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے معاشرے کی خاطر خواہ خدمات انجام دی جائیں اور دنیا اور آخرت کی خوش بختی کی جانب قدم اُٹھایا جا سکے۔

اِسلام میں گناہ کے خلاف جنگ

انسان کے وجود میں ایسی بہت سی غیر مرئی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کی زندگی کے عظیم آثار کا سرچشمہ ہے۔

اگرچہ ان میں سے اکثر قوتوں کی ابھی تک مکمّل طور پر شناخت نہیں ہوئی لیکن ماہرینِ نفسیات کی مدد سے ان کی نشانیوں کا کم و بیش پتا چلا لیا گیا ہے۔

انسان کی سرشت میں عدل و انصاف، سچائی سے محبّت، مردانگی، بنی نوعِ انسان سے اُنس، رحم، اور نیکی سے رغبت وغیرہ کے احساسات موجود ہیں۔ اسی طرح اس میں خود غرضی، خود پسندی، تفوّق طلبی، انتقام جوئی، راحت طلبی وغیرہ کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ پوشیدہ قوّتیں ہیں جو انسان کو پاکیزگی اور فضیلت یا ناپاکی اور کمینگی کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

اگر وہ بنیادی نیک صفات جو ہر انسان کو عطا ہوئی ہیں مناسب حالات میں اور صحیح تربیّت کی بدولت پروان چڑھیں اور بارآور رہوں تو انسان اپنے مقصد کے کمال تک

پہنچ جاتا ہے اور اگر ناپسندیدہ خواہشات اور صفات قوت پکڑ جائیں اور زندگی کے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اس کا نتیجہ خرابی، تباہی اور گناہ کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

انسان طبعاً یہ خواہش رکھتا ہے کہ جسمانی لذتوں سے بلا روک ٹوک اور آزادانہ طور پر بہرہ مند ہو حالانکہ صورت یہ ہے کہ ناجائز لذتیں اس کی خوش بختی کو ٹھیس پہنچاتی ہیں اور اس کے لیے دردناک مصیبتیں پیدا کر دیتی ہیں۔

ناجائز لذتیں جنھیں دینی اصطلاح میں **گناہ** کہا جاتا ہے بلاشبہ زندگی کے مختلف شعبوں میں نامبارک حادثات اور ناقابلِ تلافی نقصانات کا باعث بنتی ہیں۔ پیشوایانِ اسلام کی نظر میں تمام شخصی اور اجتماعی بدبختیاں اور گوناگوں مصائب جن سے انسان دوچار ہیں ان کی اپنی لغزشوں اور گناہوں کا حاصل ہیں۔

قرآنِ مجید بہت سی ایسی قوموں کی ہلاکت اور بربادی کو جو کبھی اس دنیا میں زندگی بسر کرتی تھیں اور اب تاریخ کے صفحات میں ان کے ناموں کے علاوہ کچھ باقی نہیں ان کے بُرے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"انھوں نے اپنے پروردگار کی آیات کی تکذیب کی اور ہم نے بھی ان کے گناہوں کی بنا پر انھیں ہلاک اور نابود کر دیا۔" [1]

اسی طرح قرآنِ مجید گناہوں کو نعمتوں کے ہاتھ سے کھو بیٹھنے کا سبب گردانتا ہے اور فرماتا ہے:

"جب اللہ کسی قوم کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو اسے تبدیل نہیں کرتا اور ان سے واپس نہیں لیتا بجز اس کے کہ وہ خود اسے بدل دیں اور گناہ اور ناپاکی میں آلودہ ہو جائیں۔" [2]

امام الباقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] سورۃ الانفال ۔ آیت ۵۴ [2] سورۃ الانفال ۔ آیت ۵۳

اِنَّ اللّٰہَ قَضٰی قَضَآءً حَتْمًا اَلَّا یُنْعِمَ عَلَی الْعَبْدِ بِنِعْمَۃٍ فَیَسْلُبَھَا اِیَّاہُ حَتّٰی یُحْدِثَ الْعَبْدُ ذَنْبًا یَسْتَحِقُّ بِذٰلِکَ النِّقْمَۃَ [1]

"اللہ نے قطعی حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو اُس سے اس وقت تک واپس نہیں لیتا جب تک وہ گناہ کا مرتکب نہ ہو کیونکہ اُس کے نتیجے میں وہ نعمت سلب کر لیے جانے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔"

امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اِنَّ الذَّنْبَ یَحْرِمُ الْعَبْدَ الرِّزْقَ [2]

"بلاشُبہ گناہ اِس امر کا سبب بنتا ہے کہ انسان اپنی روزی سے محروم ہو جائے اور فقر و فاقہ میں گرفتار ہو جائے۔"

مشہور ماہر عضویات ڈاکٹر الیکسس کارل (Dr. Alexis Carrel) کہتا ہے:

"اگر ہم گناہ کے وجود کو بھُلا دیں تو یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے کیونکہ گناہ اصولاً نقصان دہ ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں جلد یا بدیر زندگی ان لوگوں کو ختم کر دیتی ہے جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

گناہ ارادی یا غیر ارادی طور پر زندگی کے قوانین کو پامال کرنے کا نام ہے اور زندگی کے قوانین بھی گیس کے مرکّبات یا اجسام کے سقوط کے قوانین کی طرح ناقابل شکست ہیں لیکن چونکہ گناہ کی سزا بہت دیر سے ملتی ہے اس لیے انسان میں ابھی تک گناہ کے خطرناک نتائج کا شعور پیدا نہیں ہوا۔ ہر گناہ انسان میں ناقابل تلافی عضوی، نفسیاتی اور اجتماعی خلل پیدا ہونے کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح افسوس کرنے سے ایک شرابی کے بدن

---

[1] الکافی۔ جلد دوّم۔ ۲۰۹

[2] الکافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۰۸

کے نقائص یا اس کے بچّوں کو ورثے میں ملنے والے عیوب دُور نہیں ہو سکتے اسی طرح حسد، افترا، کینہ اور غیبت سے پیدا ہونے والے اختلالات کی تلافی بھی ممکن نہیں۔ گناہ کا نتیجہ جلد یا بدیر اضمحلال اور موت کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ یہ اضمحلال اور موت خود گناہگار کا بھی ہو سکتا ہے اور اس کی نسل اور قوم کا بھی ہو سکتا ہے لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ اچھے اور بُرے میں تمیز کرے اور یہ سمجھ لے کہ ممکنات کی قلمرو میں صواب اور خطا کے درمیان غیر مرئی خط کہاں کھینچا گیا ہے۔"

امام علی الرّضا علیہ السّلام نے ہر نئے گناہ کی پیدائش کو ایک نئی مصیبت کی پیدائش کا سبب قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

كُلَّمَا اَحْدَثَ الْعِبَادُ مِنَ الذُّنُوبِ مَالَمْ يَكُونُوا يَعْمَلُونَ اَحْدَثَ اللّٰهُ لَهُمْ مِنَ الْبَلَاءِ مَالَمْ يَكُونُوا يَعْرِفُونَ [1]

"جب کبھی لوگ ایسا نیا گناہ کرتے ہیں جس کے وہ پہلے مرتکب نہ ہوئے ہوں تو اللہ تعالیٰ اُنھیں ایک ایسی نئی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے جس سے انھیں پہلے سابقہ نہ پڑا ہو۔"

امام علی علیہ السّلام نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

وَاَيْمُ اللّٰهِ مَا كَانَ قَوْمٌ قَطُّ فِيْ غَضِّ نِعْمَةٍ فِيْ عَيْشٍ فَزَالَ عَنْهُمْ اِلَّا بِذُنُوبٍ اِجْتَرَحُوهَا لِاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ۔

"اللہ کی قسم کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ ایک قوم آرام و آسائش میں زندگی بسر کر رہی ہو اور وہ نعمت اور آسائش ان سے لے لی جائے بجز ان

---

[1] الکافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۱۱

گناہوں کی وجہ سے جو اُن سے سرزد ہوئے ہوں کیونکہ اللہ اپنے بندوں پر
ظلم نہیں کرتا"۔

قرآنِ مجید میں لوگوں کو دعوت دی گئی ہے کہ سیر و سیاحت اختیار کریں اور سابقہ اقوام کے حالات کا مطالعہ کر کے ان کی بربادی کا شعور حاصل کریں جو اُن پر اُن کے گناہوں کی وجہ سے وارد ہوئی۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ [1]

"(اے رسول) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ زمین پر گھومیں اور گناہگاروں کا انجام دیکھیں"۔

ایک اور جگہ قرآنِ مجید کہتا ہے:

"کیا انھوں نے زمین کے مختلف نقاط میں گردش نہیں کی تاکہ ان گزرے ہوؤں کا انجام دیکھیں جو اُن سے زیادہ طاقتور اور بااثر تھے۔ اللہ نے انھیں اُن کے گناہوں کے بدلے ہلاک کر دیا اور کوئی طاقت اُنھیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکی"۔ [2]

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ گناہ کس طرح انسان کو بدبختی کی جانب دھکیل کر عدم کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

کتاب 'اعلام النّاس' میں یوں تحریر ہے:

"معتصم عبّاسی کے ایک وزیر نے جسے ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں اپنے لیے ایک کئی منزلہ عالیشان محل تعمیر کرایا۔ وہ بالائی منزل پر بیٹھتا، کھڑکیوں سے لوگوں کے گھروں میں جھانکتا اور ان کی لڑکیوں اور عورتوں

---

[1] سورۃ النمل۔ آیت ۶۹ [2] سورۃ المومن۔ آیت ۲۱

کو دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن اُس کی نگاہ ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی پر پڑی اور وہ بے اختیار اسے دل دے بیٹھا اور اس کا عاشقِ زار ہو گیا۔ اب وہ اِس جستجو میں لگ گیا کہ اس کا نام ونشان دریافت کرے اور بالآخر اُسے پتا چلا کہ وہ شہر کے ایک سوداگر کی بیٹی ہے۔

اب اُس نے اس لڑکی سے شادی کا پیغام بھجوانے کا سوچا لیکن اس سلسلے میں اُسے لڑکی کے باپ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی تمام تر کوشش کے باوجود معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔

اس نے اپنی اس مشکل کا ایک دوست سے ذکر کیا اور اس سے کہا کہ کوئی حل تلاش کرے۔ اُس نے کہا کہ اگر تم ایک ہزار دینار میرے سپرد کر دو تو تمھارا کام بن جائے گا۔

وزیر نے کہا کہ میں تو اس مقصد کے حُصول کے لیے دس ہزار دینار خرچ کرنے کو تیار ہوں اور فوراً ایک ہزار دینار اس شخص کے حوالے کر دیے۔

اس نے ایک ہزار دینار لیے اور دس ایسے معروف اشخاص کے پاس گیا جن کی گواہی قاضی قبول کر لیا کرتا تھا۔ اُس نے اُن سے تمام ماجرا بیان کیا اور کہا کہ اب میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ تم میں سے ہر شخص ایک سو دینار لے لے اور قاضی کے سامنے شہادت دے کہ وزیر نے اس لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔ اس نے اُنھیں سمجھایا کہ ایسی شہادت دینے سے تم پر بھی کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک انسان کی جان خطرے میں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وزیر اُس کا لاکھوں دینار مہر مقرّر کرنے پر تیار ہے۔ علاوہ ازیں لڑکی کا باپ اسے

ازدواج سے محروم کرنا چاہتا ہے اور اس ترکیب پر عمل کرکے تم ایک شرعی کام انجام دو گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وزیر کی نگاہ میں تمہارا رُتبہ بہت بلند ہو جائے گا اور وہ عمر بھر تمہاری محبّت کو فراموش نہیں کرے گا۔

وہ دس اشخاص دولت کے لالچ میں اور ان سے کیے گئے وعدوں کی خاطر جھوٹی گواہی دینے پر تیار ہو گئے جو ایک بہت بڑا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہے۔

اُن دس اشخاص کے آمادگی ظاہر کرنے کے بعد وزیر نے قاضی سے شکایت کی کہ میں نے فلاں سوداگر کی بیٹی سے نکاح کیا ہے اور اتنا مہر بھی مقرّر کیا ہے اور دس معتبر گواہ اس معاملے سے آگاہ ہیں لیکن لڑکی کے باپ نے اُسے اپنے پاس روک رکھّا ہے اور میرے سپرد نہیں کرتا۔

گواہوں کی شہادتیں سُننے کے بعد قاضی نے حکم دیا کہ لڑکی کو جبراً وزیر کے گھر منتقل کر دیا جائے اور اس کے باپ کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کیجائے۔

لڑکی کو وزیر کے گھر منتقل کر دیا گیا لیکن اس کا باپ بھی خاموش نہ بیٹھا بلکہ کوشش اور مقابلہ جاری رکھّا لیکن بدقسمتی سے وہ واحد شخص جو وزیر سے اس کا حق اسے دلا سکتا تھا خلیفہ معتصم تھا اور سوداگر کی اُس تک رسائی نہ تھی۔ آخر کافی دوڑ دھوپ کے بعد اسے پتا چلا کہ خلیفہ ایک محل بنوا رہا ہے اور ہر روز تعمیر کا کام دیکھنے کی غرض سے تھوڑی دیر کے لیے وہاں جاتا ہے۔

سوداگر نے راج کا لباس پہنا اور کاریگروں میں شامل ہو کر کام کرنے لگا۔ جب خلیفہ آیا تو سوداگر نے رونا دھونا اور فریاد کرنا شروع کر دیا۔ خلیفہ نے ماجرا پوچھا تو اس نے سارا قصّہ بیان کیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ وزیر

کو وہیں حاضر کیا جائے ۔ وزیر نے آکر اس امّید پر اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا کہ اُسے معاف کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد گواہوں کو حاضر کیا گیا اور انھوں نے بھی اپنے جُرم کا اعتراف کر لیا ۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ تمام گواہوں کو محل کی دہلیز پر پھانسی دے دی جائے وزیر کو بھی ایک تھیلے میں لپیٹ دیا گیا اور اتنے آہنی گُرز مارے گئے کہ اس کا گوشت پوست اور ہڈیاں سب برابر ہو گئیں ۔ اس کے بعد خلیفہ نے لڑکی کے باپ کو حکم دیا کہ وہ پورا مہر جس کا گواہوں نے ذکر کیا تھا وصول کر کے لڑکی کو اپنے گھر لے جائے۔" [1]

یہ تاریخی واقعہ اُن واقعات میں سے ہے جو گناہ کے منحوس نتائج کی نشاندہی کرتے ہیں اور اگر گزشتہ لوگوں کی تاریخ حتّٰی کہ ہم عصروں کی زندگی پر غور کیا جائے تو ایسے بہت سے واقعات دیکھنے میں آئیں گے ۔

کتنے ہی خاندان ایسے ہیں جو گناہ میں آلودہ ہونے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے ہیں اور کتنی ہی عورتیں اور مرد ایسے ہیں جنھوں نے گناہ کے غار میں گر کر اپنی شرافت اور حیثیّت کو داغدار کر لیا ہے ۔ کتنے ہی نوجوان ایسے ہیں جن کی صحّت اور خوش بختی ناجائز لذّتوں اور وقتی عیّاشیوں کی نذر ہو گئی ہے ۔ اسلام نے لوگوں کی نیک بختی کو یقینی بنانے اور گناہوں سے پیدا ہونے والی بدبختی کا سدّ باب کرنے کے لیے گناہ کے خطرناک نتائج کی تشریح کر دی ہے اور لوگوں کو اس سے اجتناب برتنے کی دعوت دی ہے ۔

چونکہ اکثر لوگ جو کام کرتے ہیں ان کے نتائج سے بے خبر اور جسمانی لذّتوں کے بارے میں بے قرار اور لاأبالی ہوتے ہیں ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں اس غلط روش سے خبردار کیا ہے اور فرمایا ہے :

---

[1] اعلام النّاس اتلیدی ۔ مطبوعہ مصر ۔ صفحہ ۱۹۰

"اکثر تم کسی چیز کو پسند نہیں کرتے لیکن وہ تمھارے لیے بہتر ہوتی ہے اور اکثر تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو لیکن وہ تمھارے لیے خراب اور نقصان دہ ہوتی ہے۔ اللہ کاموں کی اچھائی اور بُرائی سے آگاہ اور واقف ہے اور تم آگاہ نہیں ہو"۔ [1]

مشہور برطانوی مصنّف لارڈ آویبوری نے بھی اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ:

"عیّاشی اور بے لگام زندگی ایسے خطرات کی حامل ہیں جنھیں مدِّنظر رکھتے ہوئے بہتر ہے کہ اس وقتی لذّت سے جو ہمیں بعد میں خلافِ توقّع مہنگی پڑتی ہے اجتناب برتا جائے۔

ہمیں اس نکتے کو ہمیشہ کے لیے اپنا نصب العین قرار دینا چاہیے کہ زندگی تکلیف اور محنت سے منسلک ہے اور اگر ہم کبھی اس مسلّمہ قانون سے سرتابی کرنا چاہیں اور اپنے آپ کو فریب دہ لذّتوں کے سپرد کر دیں تو جلد ہی اس خودسری کا نتیجہ بھی بھگت لیں گے۔ یہ قول ہماری زندگی کا دستور ہونا چاہیے کہ "شبِ شراب نیرزد بہ بامداد خمار"۔

جسمانی لذّتیں خواہ کتنی ہی جاذب اور دلکش کیوں نہ ہوں محض وقتی ہوتی ہیں اور عموماً ہمیں ان کی حقیقی قیمت سے کئی گُنا زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے لہٰذا ہمیں وقتی لذّت کی خاطر نقصان اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ وقتی لذّتیں اس خطرناک آسمانی بجلی کی مانند ہیں جو زندگی کے اندھیرے میں کوندتی ہے اور اس کا جلوہ غافلوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے لیکن جلد ہی اس کا شعلہ اقبال کے خرمن کو جلا کر خاک کر دیتا ہے اور بے یار و مددگار

---

[1] سورۃ البقرۃ - آیت ۲۱۶

لوگوں کو حسرت اور ناکامی کے ساتھ اس کی راکھ کے ڈھیر پر بٹھا دیتا ہے۔

ناجائز لذّتیں ایک سراب کی مانند ہیں جو دُور سے دُنیا کے ریگستان میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور جونہی ہم اس کے نزدیک پہنچتے ہیں وہاں گرم اور جھلسا دینے والی ریت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ جو فریب دہ لذّتیں نوجوانوں کو اپنی جانب راغب کرتی ہیں اُس دُھند اور کہر کی مانند ہیں جو صبح کے وقت آسمان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ایک عقلمند شخص ان پر فریفتہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ ناپائیدار بخارات سورج کی تپش سے بہت جلد نیست و نابود ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر الیکسس کارل کہتا ہے:

"ایک خودسر انسان ہرگز اس عقاب کے مشابہ نہیں جو آسمان کی بیکراں فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک ایسے کتّے سے زیادہ ملتا جلتا ہے جو اپنی جائے رہائش سے بھاگ نکلا ہو اور پکڑے جانے کا خوف اُسے موٹر کاروں وغیرہ کے شور و غل کے درمیان ہر طرف بھگائے پھرتا ہے۔"

اکثر گناہگار لوگ گناہوں کے نتائج سے غفلت یا بے خبری کی بنا پر ان میں آلودہ ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ ان کے جسمانی، روحانی، دنیاوی اور اُخروی نقصانات سے آگاہ ہو جائیں تو بلاشبہ ان سے احتیاط برتنے کی کوشش کریں گے اور جو نقصان دہ لذّتیں خداوندِ متعال نے حرام قرار دی ہیں ان سے پرہیز کریں گے۔

ظاہر ہے کہ "اللہ کی خاطر گناہ سے اجتناب" کی اصطلاح ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو ایمان اور مذہبی اعتقادات کے حامل ہوں ورنہ بے ایمان گنہگاروں کو تو طاقت کے ذریعے ہی گناہوں سے باز رکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں ہر چیز سے پہلے ایمان کے مسئلے کی جانب توجہ دی گئی ہے اور پوری کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان دینی

حقائق کا مطالعہ کر کے اپنا ایمان پختہ کریں تاکہ ایمان کی قوّت انھیں گناہوں میں ملوّث ہونے سے باز رکھے۔

ایمان کی یہی غیر مرئی قوّت جس کی کمان لوگوں کے دل اور رُوح کی گہرائیوں میں ہے اتنے مُوثّر اختیار کی حامل ہے کہ گناہ کا خطرہ لاحق ہونے پر لوگوں کو گراوٹ اور بے راہ روی سے باز رکھتی ہے۔ یہی وہ قوّت ہے جو اپنی ملکوتی آواز کے ساتھ لوگوں کو نیکوکاری، پاکی، احسان، عدالت، خدمتِ خلق اور دوسری عالی انسانی صفات کی جانب مائل کرتی ہے۔

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی کمزور قوّتِ ایمانی کا مالک ہو وہ لغزش کے وقت فقط ایک ہی ذکر یا یاد کے ذریعے گناہ کے عمیق غار سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ:

" فضیل بن عیاض ایک مشہور ڈاکو تھا۔ قافلوں پر ڈاکے ڈالتا اور زبردستی لوگوں کا مال لُوٹ لیتا۔ جو قافلے سرخس کے علاقے سے گزرتے وہ تمام ضروری تدابیر اختیار کرتے تاکہ فضیل کے پنجے میں نہ پھنس جائیں۔

یہ خطرناک ڈاکو ایک لڑکی کے عشق کے جال میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ رات کے وقت اپنی محبوبہ کے گھر جائے گا اور اس کے وصل کی لذّت حاصل کرے گا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت وہ اس لڑکی کے گھر کی دیوار پر جا چڑھا لیکن ابھی اس نے اس کے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا کہ اسے ساتھ والے مکان سے ایک دلکش آواز سُنائی دی۔ اُس نے کان لگا کر سُنا تو پتا چلا کہ کوئی آدمی قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہا ہے اور اس آیت پر پہنچا ہے:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ

لِذِکْرِ اللّٰہِ..... [1]

"کیا ابھی اس بات کا وقت نہیں آیا کہ باایمان لوگوں کے دلوں میں اللہ کی یاد سے خشوع اور خضوع پیدا ہو؟"

اس آیت کے سننے سے فضیل کے دل میں ایسا انقلاب برپا ہوا کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھا: "یا اللہ! اس کا وقت آگیا ہے۔" وہ فوراً دیوار سے نیچے اُترا اور جو گناہ کرنے والا تھا اس سے باز رہا۔ اسی ذکر کی بدولت فضیل نے تمام بُرائیوں سے نجات پائی اور گناہ سے کنارہ کشی اختیار کی

جس رات فضیل کا دل منقلب ہوا تھا اُسی رات اُس کا گزر ایک کاروان سرائے میں ہوا جہاں ایک قافلہ آکر اُترا تھا اور لوگوں نے اپنا سامان اتارا تھا۔

فضیل دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گیا اور سر جھکائے ہوئے اپنے سابقہ گناہوں پر افسوس کرنے لگا۔ اسی دوران میں اُس نے سُنا کہ قافلے والے کُوچ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

قافلے والوں میں سے ایک شخص نے کہا: ساتھیو! آج کی رات کوچ نہ کرو اور فضا صاف ہو لینے دو کیونکہ پتا چلا ہے کہ فضیل اسی راستے پر کمین گاہ میں بیٹھا ہے اور قافلے کو اس سے شدید خطرہ ہے۔

قافلے والوں کی اضطراب آمیز باتوں نے فضیل کے دل میں احساس کی چنگاری بھڑکا دی اور اُس پر اِس بات کا بڑا شدید اثر ہوا کہ اس کے جرائم نے خلقِ خدا کو اس قدر پریشان اور بے چین کر رکھا ہے۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھا اور کہنے لگا:

---

[1] سورۃ الحدید۔ آیت ۱۶

"اے لوگو! یہ جان لو کہ میں فضیل بن عیاض ہوں۔ اطمینان رکھو کہ اب فضیل ڈاکہ نہیں ڈالے گا اور قافلے والوں کا راستہ نہیں روکے گا وہ اللہ کی درگاہ کی جانب لوٹ آیا ہے اور اس نے گناہوں سے توبہ کر لی ہے"۔ [1]

جس چیز نے اس شخص کو گناہ سے باز رکھا اور اس کی تقدیر بدل دی وہ ایک یاد دہانی تھی۔ وہ ضعیف اعتقادات اور ایمان کا مالک تھا جب کہ اس یاد دہانی نے اس کے دل پر اثر کیا اور اس میں انقلاب اور تبدیلی پیدا کر دی۔

لہٰذا گناہ سے مقابلے کی جانب پہلا قدم یہ ہے کہ لوگ دینی حقائق سے آگاہ ہوں اور اللہ، قیامت، حساب کتاب، ثواب اور عذاب وغیرہ پر ایمان کا بیج اُن کے دلوں میں اُگے اور بار آور ہو۔

ڈاکٹر کی نیا کہتا ہے:

"ایمان کا چراغ لوگوں کے دلوں میں روشن کرو کیونکہ ایمان تمام اجتماعی اور اخلاقی خرابیوں سے جنگ کے لیے مؤثر ترین حربہ ہے"۔

ایک اور اقدام جو اسلام میں گناہ کے خلاف جنگ کے لیے انجام دیا گیا ہے وہ "گناہ کے آلات اور عوامل کو محدود کرنا ہے"۔

جس طرح حفظانِ صحت کے ادارے ایک بیماری کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے اس کی پیدائش کے تمام عوامل کا محاصرہ کر لیتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بیماری کا مقابلہ کرنے کے لیے لوگوں کو ٹیکے لگاتے ہیں، حکماً قرنطینہ میں رکھتے ہیں اور ضروری دوائیاں کافی مقدار میں لوگوں کو مہیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح گناہ کی ریشہ کنی اور اس سے مقابلے کے لیے لوگوں کو لیس کرنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ماحول کو آلودگی سے پاک کرنا چاہیے اور جو

---

[1] روضات الجنات، فضیل

چیزیں گناہ کی پیدائش کا موجب ہوں انھیں محدود اور محصور کرنا چاہیئے۔ اسلام نے الکحلی مشروبات، قمار بازی، چوری، زنا، قتل اور سود خوری کے خلاف جنگ کے لیے اسی قسم کے اقدامات کیے ہیں۔

اوّل تو یہ کہ مسلمانوں کے ایمان اور دینی اعتقادات سے بہرہ اندوز ہو کر ان کاموں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ان کے ارتکاب کو اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ٹھہرایا گیا ہے اور دوّم یہ کہ مسلمانوں کے شخصی اور اجتماعی فرائض کا تعیّن کر کے گناہ کے وجود میں آنے کی راہ کو مسدود کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [1]

"نیکوکاری اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو لیکن گناہ اور سرکشی میں شرکت اور تعاون نہ کرو۔"

گناہ کا مشتہر کرنا

معاشرے کو پاکیزہ رکھنے کے لیے اسلام لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک دوسرے کے گناہوں کا پتا چلانے کے لیے تجسّس کریں اور یہ صریح حکم دیتا ہے کہ:

"اے اہلِ ایمان! بہت زیادہ گمان کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ کچھ گمان گناہ ہیں اور دوسرے کی لغزشوں کے بارے میں تجسّس نہ کرو۔" [2]

اگر کسی شخص کو کبھی دوسرے کے پوشیدہ گناہ کا علم ہو جائے تو اُسے اِس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اس کا پردہ چاک کر دے اور اس کے گناہ کا ذکر دوسروں کے

---

[1] سورۃ المائدہ - آیت ۲
[2] سورۃ الحجرات - آیت ۱۲

سامنے کرے کیونکہ اس کے گناہ کا مشتہر کرنا اس کی رسوائی کا موجب ہوگا اور نتیجۃً وہ گناہ کرنے میں اور زیادہ دلیر ہو جائے گا۔

لوگوں کی لغزشوں اور جرائم کی اشاعت گناہ کو معاشرے کی نظروں میں ناقابلِ توجہ اور بے اہمیت بنا دیتی ہے اور گناہ کے پھیلاؤ کا موجب بنتی ہے۔ قرآنِ مجید ایسے لوگوں کو جو اس قسم کی خبریں نشر کر کے گناہ کے پھیلنے میں مدد دیتے ہیں دردناک عذاب کی وعید سُناتا ہے اور فرماتا ہے:

وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاشرے میں بُرے کام رواج پا جائیں وہ دُنیا اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔"[1]

اسلام کے عالی مرتبت پیغمبرؐ فرماتے ہیں:

مَنْ اَذَاعَ فَاحِشَۃً كَانَ كَمُبْتَدِيْهَا[2]

"جو شخص کسی بُرے کام کی خبر لوگوں کے درمیان منتشر کرے اس کا گناہ اس شخص کے گناہ کی مانند ہے جو اس کام کا مرتکب ہوا ہے۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا:

مَنِ اطَّلَعَ مِنْ مُؤْمِنٍ عَلٰى ذَنْبٍ اَوْ سَيِّئَةٍ فَاَفْشٰى ذَالِكَ عَلَيْهِ وَلَمْ يَكْتُمْهَا وَلَمْ يَسْتَغْفِرِاللّٰهَ لَهٗ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ كَعَامِلِهَا[3]

"جس شخص کو کسی مومن کے گناہ کا علم ہو جائے اور وہ اُسے پوشیدہ نہ رکھے اور اس کے لیے بارگاہِ الٰہی میں معافی کا طلبگار نہ ہو بلکہ اس کی پردہ دری کر کے اُس کے گناہ کو لوگوں میں مشتہر کرے اللہ کے نزدیک اُس کا

---

[1] سورۃ النّور۔ آیت ۱۹

[2] سفینۃ البحار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۹۵

[3] سفینۃ البحار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۹۶

گناہ اُس شخص کے گناہ کے برابر ہے جو اس کا مرتکب ہوا ہے۔"

عالمگیر نگرانی

اسلام نے گناہ اور طرح طرح کی بُرائیوں سے جنگ لڑنے کے لیے جو طریقے پیش کیے ہیں اُن میں سے ایک عالمگیر نگرانی کا قانون ہے۔

یہ قانون تمام مسلمانوں کو اجازت دیتا ہے بلکہ انھیں ذمّے دار ٹھہراتا ہے کہ قوانینِ الٰہی پر عملدرآمد کی نگرانی کریں اور اگر کسی کو قانون شکنی کرتے دیکھیں تو لاپرواہی اور بے اعتنائی نہ برتیں بلکہ عاقلانہ اور صحیح روش سے اس کی اصلاح کی تدبیر کریں اور ناجائز کاموں سے منع کریں اور گناہ کی پیدائش کی پیش بندی کریں۔

اس بارے میں قرآنِ مجید ارشاد فرماتا ہے:

"تم ملّتِ مسلمان، بہترین ملّت ہو جس نے جہانِ بشریّت میں جنم لیا ہے تم لوگوں کو نیک کاموں کی دعوت دیتے ہو اور بُرے کاموں کے انجام سے خبردار کرتے ہو۔" [1]

پیشوایانِ اسلام نے اپنے ارشادات میں تاکید فرمائی ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارے معاشرے میں بُرائیاں، تباہ کاریاں، مظالم اور ایسی ہی دوسری بُرائیاں رواج پذیر نہ ہوں اور معاشرہ بدبختی اور بربادی کا شکار نہ ہو جائے تو نگرانی کے اس قانون کو نہ بھولو اور دو اہم اصولوں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہمیشہ کاربند رہو۔

قرآنِ مجید ان نصائح کو نقل کرتے ہوئے جو لقمان حکیم نے اپنے فرزند کو کیں یوں ارشاد فرماتا ہے:

"اے میرے فرزند! نماز پڑھ، لوگوں کو نیکوکاری کی جانب دعوت دے

---

[1] سورۂ آلِ عمران - آیت ۱۱۰

اور بُرے کاموں سے منع کر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں تجھے جو مصائب اور مشکلات پیش آئیں ان میں خود دار رہ کیونکہ یہ ان کاموں میں سے ہیں جن پر ثابت قدمی سے جما رہنا چاہیئے"۔ [1]

رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

لَا یَزَالُ النَّاسُ (اُمَّتِی) بِخَیْرٍ مَا اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ فَاِذَا لَمْ یَفْعَلُوْا ذَالِکَ نُزِعَتْ مِنْهُمُ الْبَرَکَاتُ وَسُلِّطَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَلَمْ یَکُنْ لَهُمْ نَاصِرٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ [2]

"جب تک میرے پیرو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے اور نیکوکاری میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے وہ سعادت اور خوش بختی سے بہرہ مند رہیں گے اور جب وہ اسے ترک کر دیں گے تو ان سے برکت اُٹھالی جائے گی اور بعض، بعض پر تسلّط حاصل کرلیں گے جس کے نتیجے میں وہ درماندہ ہوجائیں گے اور انھیں کسی جانب سے کوئی مددگار اور معاون میسّر نہ ہوگا"

اگر ہم ان دو اہم اصولوں کے بارے میں قدرے سوچ بچار کریں تو پتا چلتا ہے کہ یہ قانون قرآنِ مجید کے عظیم ترین معجزات میں سے ہے کیونکہ اب بھی جب کہ اسلام کے ظہور کو چودہ صدیاں گزر چکی ہیں متمدّن اقوام نے اس سے ملتے جلتے قوانین وضع کرکے نافذ کیے ہیں اور انھیں جمہوریّت کی اور اپنی ترقّی کی بنیاد سمجھتی ہیں۔

ابراہیم خواجہ نوری اپنے مکتوب نمبر ۲۸۵ میں جو آذر ماہ ۱۳۴۲ھ کے روزنامہ اطلاعات میں شائع ہوا یوں تحریر کرتا ہے۔

---

[1] سورۂ لقمان۔ آیت ۱۷۔ مجمع البیان۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۳۱۹

[2] تہذیب۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۵۸

"لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عدالت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ سویس SWISS قوم کی طرح ہمارے سب لوگ بھی فرداً فرداً عدالت کے محافظ ہوں اور جیسا کہ ان کے بنیادی قانون میں ایک مقدس آسمانی آیت کی مانند لکھا ہے "ایک چھوٹی سے چھوٹی بے انصافی کو دیکھتے ہی سب لوگوں کا فرض اور ذمّہ داری ہے کہ جب تک اس ناانصافی کی تلافی نہ ہو جائے چین سے نہ بیٹھیں"۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ یہ بعینہٖ وہی ذمّہ داری ہے جو اسلام نے مسلمانوں پر فرداً فرداً عائد کی ہے۔ بلاشبہ اگر معاشرے میں ایسا رویّہ معمول اور عادت بن جائے تو خود بخود عدالت کی ضمانت مہیا ہو جاتی ہے اور اس کے خلاف اقدام کرنا طبعاً ناممکن ہو جاتا ہے"۔

امام علی علیہ السلام نے بسترِ شہادت پر کی گئی اپنی تاریخی وصیّت میں اس اہم امر کی تاکید فرمائی کہ:

لَا تَتْرُكُوا الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ فَيُوَلّٰى عَلَيْكُمْ شِرَارُكُمْ ثُمَّ تَدْعُوْنَ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ [1]

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرو کیونکہ ایسا کرنے کے نتیجے میں شریر لوگ تم پر مسلّط ہو جائیں گے اور تم اللہ سے دعا کرو گے کہ وہ ان کا شر تم پر سے رفع کرے لیکن تمھاری دعا قبول نہ ہو گی"۔

گنہگاروں کو آخرت میں عذاب

قرآنِ کریم اور اسلامی روایات میں عالمِ آخرت میں گنہگاروں کی کم نصیبی اور بدبختی کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کی مفصّل تشریح کی گئی ہے اور یہ بجائے خود گناہ کے خلاف

[1] نہج البلاغہ۔ شرح محمد عبدہ۔ جلد سوّم۔ صفحہ ۸۶

جنگ کا ایک طریقہ ہے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے :

"اگر تم قیامت کے دن گنہگاروں کی افسوسناک حالت دیکھو کہ کس طرح اللہ کی بارگاہ میں شرمسار اور پریشان سر جھکائے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے پروردگار! اب ہم نے حقیقت کو بے پردہ دیکھ لیا ہے اور تیری باتیں سن لی ہیں اور حقائق کو سمجھ لیا ہے ہمیں دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک کام کر سکیں ......

لیکن دنیا میں واپس جانا ناممکن ہے اور پشیمانی گنہگاروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔" [1]

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے :

"قیامت کے دن گنہگار عذاب سے نجات کے لیے یہ آرزو کریں گے کہ وہ اپنی اولاد، بیوی (یا شوہر)، بھائی، کنبے اور روئے زمین کے تمام انسانوں کو قربان کر کے پیش کر سکیں تاکہ عذابِ الٰہی سے چھٹکارا پائیں لیکن وہ ہرگز کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گے اور ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔" [2]

یہ اور اسی جیسی دوسری آیات گنہگاروں کو اس وحشتناک مستقبل کی جانب متوجہ کرتی ہیں جو اُن کے سامنے ہے تاکہ عذابِ الٰہی میں مبتلا ہونے سے پہلے وہ اس کی چارہ جوئی کرلیں اور توبہ و استغفار کر کے اور اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر کے نجات اور خوش بختی کی جانب قدم اٹھائیں۔

گنہگاروں کو دنیا میں سزا

اسلام نے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں اور قانون توڑنے والوں کے

---

[1] سورۃ السجدۃ ۔ آیت ۱۲   [2] سورۃ المعارج ۔ آیات ۱۱ تا ۱۶

لیے سزائیں مقرّر کی ہیں جنھیں جاری کرنے پر فساد اور خرابی کی جڑیں معاشرے سے کٹ جاتی ہیں یا ان میں بے حد کمی واقع ہو جاتی ہے۔

چونکہ اسلام کے تعزیراتی قوانین خدائے دانا کی جانب سے صادر کیے گئے ہیں اس لیے ان کا تعیّن جرم کی مناسبت سے کیا گیا ہے یعنی یہ سزائیں نہ تو بہت معمولی اور بے اہمیت ہیں کہ بدکردار لوگوں کے گناہ کی جانب مائل ہونے کا سبب بنیں اور نہ ہی اتنی سخت اور ظالمانہ ہیں کہ خلافِ عقل ہوں۔

ان قوانین پر اسلامی فقہ کی کتابوں میں "حدود" کے نام سے بحث کی گئی ہے اور جو اشخاص ان ضوابط کی گہرائی اور عظمت سے آگاہ ہونا چاہیں انھیں چاہیے کہ اس موضوع پر جو مبسوط کتابیں تحریر کی گئی ہیں ان سے رجوع کریں۔

جن مطالب کا ذکر کیا گیا ہے وہ گناہ، فساد اور بداعمالیوں کے خلاف اسلام کی بنیادی جنگ کا نمونہ ہیں۔ ہم اُمّید کرتے ہیں کہ اسلام کے حیات بخش احکام پر صحیح طور پر عملدرآمد سے مسلمانوں کا معاشرہ گناہوں اور بُرائیوں سے پاک ہو کر صالح ہو جائے گا اور وہ دنیا اور آخرت میں نیک بختی سے بہرہ ور ہوں گے۔

اسلام میں
بیوی اور شوہر کے حقوق

اکیلا مَرد ایک ناقص ہستی ہے اور اسی طرح اکیلی عورت بھی ایک ناقص ہستی ہے۔ ان کے ناقص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نسل کی بقا اور زندگی کی تشکیل میں دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

شرعی اور قانونی ازدواج دونوں کے نقائص دُور کرتا ہے اور ان کے وجود کے بار آور ہونے کا سبب بنتا ہے۔

بقائے نسل کے مسئلے کے علاوہ ہر مَرد اور عورت کے لیے جسمانی اور روحانی صحت اور زندگی کی نعمتوں سے صحیح طور پر بہرہ ور ہونے کے لیے بھی خاندان کی تشکیل ضروری ہے۔

جو عورتیں اور مرد تجرّد کی زندگی بسر کرتے ہیں انھیں زیادہ تر اعصابی اور نفسیاتی تکالیف میں مُبتلا ہونے کا خطرہ رہتا ہے کیونکہ اگر جنسی خواہشات کو دبا دیا جائے تو اس کا نتیجہ وحشتناک بیماریوں کی صورت میں نکلتا ہے اور اگر وہ شُتر بے مہار بن جائیں اور خلافِ شرع طریقوں سے ان خواہشات کو پورا کریں تو اس کے زیادہ خطرناک نتائج

برآمد ہوتے ہیں۔

ازدواج اور خاندان کی تشکیل کی ضروری شرائط پوری کرتے ہوئے ان امور کو انجام دینا فطرت کا فرمان اور خلقت کا ایسا قانون ہے جس سے سرتابی کی بڑی سنگین سزا ملتی ہے۔ جو عورت اور مرد اس اہم کام کو رشتۂ ازدواج کے ذریعے انجام دیں انھیں چاہیے کہ اس رشتے کے ذریعے ان پر جو فرائض اور ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی جانب توجّہ دیں اور خوشحال زندگی گزارنے کے لیے اپنے فرائض پر پورا پورا عمل کریں۔

اپنے ازدواج کی بنیاد ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات پر نہ رکھیں اور مال و دولت یا حسن و جمال کی خاطر ازدواج نہ کریں کیونکہ ایسے رشتے کمزور اور ایسی شادیاں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اس کام کے اقدام سے جو عظیم مقصد پیشِ نظر ہونا چاہیے اُسے فراموش نہ کریں اور کافی غور و خوض اور چھان بین کے بعد اپنے آئندہ جیون ساتھی کا انتخاب باایمان، عقلمند اور لائق افراد میں سے کریں۔

عورت اور مَرد، عورت ہونے یا مرد ہونے کی بنا پر ایک دوسرے پر کوئی تفوّق نہیں رکھتے۔ خلّاقِ عالم کی نظروں میں دونوں انسان ہیں اور اپنے اپنے حقوق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قُرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت (آدم اور حوّا) کی نسل سے پیدا کیا اور تمھیں گروہوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (لیکن یہ قبیلوں اور گروہوں کا اختلاف برتری کا معیار نہیں ہے) بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ مکرّم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔"[1]

ہر دوسرے نظام کی طرح گھر کی ترتیب و تنظیم کے لیے بھی ایک سرپرست اور ذمّے دار شخص کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ہر وہ تنظیم جس میں کوئی ذمّے دار اور جوابدہ

---

[1] سورۃ الحجرات۔ آیت ۱۳

شخص نہ ہو اس کی خرابی اور بربادی ایک یقینی امر ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس تنظیم (یعنی گھر اور خاندان) کی فلاح وبہبود کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کس کو ذمّے دار اور جوابدہ ٹھہرایا جائے۔ مَرد کو، عورت کو یا دونوں کو؟

بلاشک وشبہ مَرد اور عورت دونوں کے سربراہ بن جانے سے نہ صرف یہ کہ مشکل حل نہیں ہوسکتی بلکہ پریشانی اور بدنظمی میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ تجربے سے ثابت ہوچکا ہے کہ کسی ادارے کے دو سربراہ ہونا کوئی سربراہ نہ ہونے سے زیادہ نقصان دہ ہے اور جس مملکت کے دو مستقل حکمراں ہوں وہ ہمیشہ بدنظمی کا شکار رہتی ہے۔

بدنظمی کے علاوہ اگر ماں اور باپ میں گھر کی سربراہی کے سلسلے میں اختلاف اور کشمکش ہو تو ماہرینِ نفسیات کے نظریے کے مطابق جو بچّے ایسے گھر میں تربیت پائیں وہ روحانی اور اعصابی پیچیدگیوں اور خللِ دماغ کا شکار ہوجاتے ہیں۔

مندرجہ بالا مشکلات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ گھر اور خاندان کے امور کی ذمّے داری عورت یا مرد میں سے کسی ایک کے سپرد ہونی چاہئیے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی جسمانی ساخت اور ذہنی رجحان کی بدولت مَرد اس ذمّے داری سے عہدہ برآ ہونے کا زیادہ اہل ہے۔

ماہرین اور دانشمندوں کی تصدیق کے مطابق جہاں تک جذبات کا تعلق ہے عورت کو مَرد پر برتری حاصل ہے اور سوچ بچار کے معاملے میں مَرد فائق ہے اور چونکہ انتظامی امور کے لیے عقل وفکر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لہٰذا عقلِ سلیم یہ حکم دیتی ہے کہ خاندان کے نظم ونسق کی اہم ذمّے داری مَرد کے کندھوں پر ڈالی جائے اور سربراہی اور سرپرستی کا کام اس کے سپرد کیا جائے۔

مقننِ اسلام کی نظر میں بھی فطرت کا حکم یہی ہے چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"ان خصوصیات کی بنا پر جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی ہیں اور اُن مالی ذمّے داریوں کی وجہ سے جو انھوں نے (اپنی بیوی کے اخراجات کے سلسلے میں) قبول کی ہیں مَرد، عورتوں کے سرپرست ہیں۔" ؎

اپنی بیوی کی بہ نسبت مَرد کی سرپرستی دنیا کے تمام ممالک میں تسلیم کی جاتی ہے اور عورتیں بھی اس صورتِ حال سے خوش ہیں۔

فرانس کے جدید قانون کی دفعہ ۲۱۳ کی رُو سے گھر کی سربراہی، نظم ونسق اور سرپرستی مرد کے ذمّے ہے اور دوسری اقوام کے قوانین وضوابط میں بھی قانون یا روایت کے مطابق یہی صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاندان کے امور کے نظم ونسق کی رہنمائی اور ذمّے داری مَرد کے سپرد کی ہے اور یہ وظیفہ اسے سونپ دیا ہے۔ مَرد کو یہ ذمّے داری تفویض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے زیادہ طاقتور ہے اور سخت کام کرنے اور اپنے اہل و عیال کا دفاع کرنے کا زیادہ اہل ہے۔

جسمانی اور روحانی لحاظ سے عورت کی بناوٹ ایک خاص لطافت رکھتی ہے اور اس کے جذبات اور احساسات بھی نازک ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں عورت اپنی ماہانہ نقاہت کے دنوں میں، حمل کے دوران اور بچّے کو دودھ پلانے کی مدّت میں نہ صرف یہ کہ لامحدود سرگرمیوں کی قوّت نہیں رکھتی بلکہ کسی دوسری جانب سے نگہداشت اور سرپرستی کی محتاج ہوتی ہے۔

مَرد کا اپنے خاندان کا سربراہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا مالک ہے اور وہ اس کے غلام ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مَرد نے خاندان کی مالی اعانت، ذہنی پرورش اور جسمانی حفاظت کی جو ذمّے داریاں سنبھالی ہیں ان کی بنا پر وہ سربراہ

؎ سورۃ النساء - آیت ۳۴

کہلا سکتا ہے لیکن اس کے اختیارات کی حدود اللہ تعالیٰ کی جانب سے قطعی طور پر متعین کر دی گئی ہیں اور اسے معقولیت کی حد سے تجاوز کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسلام نے مرد کو خاندان کے سربراہ کا رتبہ عطا کرتے وقت عورت کی حُبِّ جاہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اسے امورِ خانہ داری کا سربراہ قرار دیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ سَيِّدٌ فَالرَّجُلُ سَيِّدُ أَهْلِهٖ وَالْمَرْئَةُ سَيِّدَةُ بَيْتِهَا۔

"ہر بشر آزاد اور خود مختار ہے۔ مرد کو اہلِ خانہ کے انتظام اور عورت کو خانہ داری کے امور میں آزادی اور خود مختاری حاصل ہے۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى أَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ وَالْمَرْئَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَعَلٰى وَلَدِهٖ فَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ [1]

"تم سب اپنے اپنے حصّے کے سرپرست اور نگراں ہو اور سبھی اپنی اپنی ذمّے داری کے لیے جوابدہ ہو۔ حاکم اور امام قوم کے لیے جوابدہ ہے مرد خاندان کے لیے جوابدہ ہے، عورت گھر کے امور اور اولاد کے لیے جوابدہ ہے اور جو کوئی جتنا اختیار رکھتا ہے اس کے لیے جوابدہ ہے، اور جو فرائض اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیے ہیں ان کی انجام دہی کا

---

[1] صحیح البخاری۔ جلد سوم۔ باب النکاح

ذمّے دار ہے۔"

اس کے علاوہ قرآنِ مجید میں مردوں کو صریحاً یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ:

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ [1]

"اپنی بیویوں سے نیکی اور مہربانی کا سلوک کرو اور ناانصافی اور ترش رُوئی سے پرہیز کرو۔"

سعد بن معاذ، رسول اکرمؐ کے ایک وفادار ساتھی تھے جن پر حضورؐ خاص توجّہ فرماتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئے تو آنحضرتؐ نے ان کی تجہیز کی رسوم انجام دینے میں بنفسِ نفیس شرکت کی اور فرمایا کہ فرشتے بھی سعد کے جنازے کی تشییع میں شامل ہوئے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور جب انھیں قبر میں اتارا گیا تو آنحضرتؐ قبر میں داخل ہوئے۔ اپنے دستِ مبارک سے لحد کو درست کیا۔ اینٹوں کے درمیان جو شگاف تھے انھیں مکمّل طور پر بند کیا اور پھر صحابۂ کرام سے فرمایا:

"گو مجھے علم ہے کہ یہ لحد جلد ہی ٹوٹ پھوٹ جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ جب اس کے بندے کوئی کام انجام دیں تو اُسے پختہ اور ٹھیک ٹھیک انجام دیں۔"

قبر پر مٹّی ڈال دی گئی اور اسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیا گیا۔ جب سعد کی ماں نے جو تدفین کے آغاز سے انجام تک موجود تھی اپنے بیٹے کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کی خاص توجّہ دیکھی تو بے اختیار کہنے لگی:

هَنِيْئًا لَكَ الْجَنَّةُ

(اے میرے بیٹے! تجھے جنّت مبارک ہو!)

---

[1] سورۃ النّساء - آیت ۱۹

رسولِ اکرمؐ نے اُس عورت سے فرمایا:
"خاموش رہ! تو اللہ سے کیا توقّع رکھتی ہے؟ ابھی ابھی قبر نے سعد کو بڑی سختی سے بھینچا ہے۔"
اس نے پوچھا: "یارسولؐ اللہ! ایسا کیوں ہوا؟"
آپ نے فرمایا: "اس لیے کہ سعد گھر میں اپنی بیوی سے بداخلاقی سے پیش آتا تھا۔"[1]
امام الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

رَحِمَ اللّٰہُ عَبْدًا اَحْسَنَ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ زَوْجَتِہٖ [2]

"اُس مرد پر اللہ کی رحمت ہو جو اپنی بیوی کے ساتھ اپنے تعلّقات کی بنیاد احسان اور نیکی پر رکھّے۔"
رسولؐ اللہ نے فرمایا:

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ [3]

"تم میں سے بہترین مرد وہ ہے جو اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ زیادہ اچّھا سلوک کرتا ہو اور میں تم سب کے مقابلے میں اپنے خاندان والوں سے بہتر سلوک کرتا ہوں۔"
رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا:

مَلْعُوْنٌ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَیَّعَ مَنْ یَعُوْلُ [4]

"جو شخص اپنے بیوی بچّوں کے حقوق ضائع کرے وہ لعنت اور نفرین کا مستحق ہے۔"

---

[1] طبقات ابن سعد۔ جلد سوّم [2] من لا یحضرہ الفقیہ۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۴۲
[3]، [4] وسائل الشّیعہ۔ جلد ہفتم۔ صفحہ ۱۲۲

ظاہر ہے کہ اسلام میں جیسے مَردوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اسی طرح بیویوں سے بھی کہا گیا ہے کہ شوہروں کے بارے میں اپنی ذمّے داریاں پوری کریں اور اپنے آپ کو لائق بیویاں ثابت کریں۔

امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام نے فرمایا:

جِهَادُ الْمَرْأَةِ حُسْنُ التَّبَعُّلِ [1]

"عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ اچھی بیویاں ثابت ہوں"

اپنی شادی کے ابتدائی ایّام میں امام علیؑ اور آپ کی زوجۂ گرامی حضرت فاطمہؑ دونوں مل کر رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم میں سے ہر ایک کی ذمّے داریوں کی حدود متعیّن فرما دیجیے۔ آنحضرتؐ نے باہر کے تمام کام امام علیؑ کے سپرد فرمائے اور حضرت فاطمہؑ کو گھر کے تمام کام کاج کا ذمّے دار قرار دیا۔ [2]

مَرد اور عورتیں صحیح اور عاقلانہ طور طریقوں سے خوش بختانہ زندگی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور جو کام ان کی پُر سکون زندگی کے لیے مضر ہوں ان سے اجتناب برت سکتے ہیں۔ بعض اوقات معمولی اور غیر اہم کام پیار اور محبّت میں اضافے کا موجب بن سکتے ہیں اور اسی طرح کبھی بالکل معمولی باتیں تفرقہ اور جدائی پیدا کر دیتی ہیں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"مناسب یہ ہے کہ عورت گھر کا چراغ روشن کرے اور کھانا تیّار کرے اور جب اس کا شوہر گھر آئے تو گھر کے دروازے کے نزدیک جا کر اس کا استقبال کرے اور اُسے خوش آمدید کہے اور پانی اور تولیہ لا کر شوہر کے ہاتھ دھونے میں اس کی مدد کرے اور بلا وجہ اس کی خواہشیں پوری کرنے سے انکار نہ کرے۔" [3]

---

[1] الکافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۶۰ [2] قرب الاسناد۔ صفحہ ۲۵

[3] مستدرک الوسائل۔ باب مقدمات النکاح

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

وَمَنِ اتَّخَذَ زَوْجَةً فَلْيُكْرِمْهَا [1]

"جو مرد کسی عورت سے شادی کرے اُسے چاہیئے کہ اُس کا احترام کرنے اور اُسے عزیز رکھنے کی کوشش کرے۔"

بیوی کی غلطی کا ذکر بچوں کے سامنے نہ کرو حتیٰ کہ اگر تمھارے بچے اپنی ماں کی غلطی کا ذکر کریں تو تمھیں بچوں کے اذہان کو اس بارے میں مطمئن کر دینا چاہیئے اور ان کے دلوں میں ماں کا احترام قائم کرنا چاہیئے۔ البتہ ماں کا بھی یہ فرض ہے کہ ہمیشہ بچوں کو باپ کا احترام کرنے کی تلقین کرے۔

عورت اور مرد دونوں کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کے سامنے باوقار اور پرکشش بنا کر پیش کریں اور غلاظت اور قابلِ نفرت حالت میں رہنے سے پرہیز کریں۔

حسن بن جہم کہتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ امام موسیٰ الکاظمؑ نے خضاب کر رکھا ہے۔ میں نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"مرد کا اپنے چہرے مہرے اور لباس کو آراستہ کرنا عورت کی عفّت میں اضافہ کرتا ہے۔ (کیونکہ اگر عورت اپنے شوہر میں دلچسپی لے تو پھر وہ بیگانہ مردوں کی جانب نہیں دیکھتی) بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کی بے توجّہی اور عدم دلچسپی کے باعث بدکردار ہو جاتی ہیں۔"

پھر آپ نے فرمایا:

"کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ اپنی بیوی کو پژمردہ و پریشان حال دیکھو؟"

میں نے جواب دیا: "نہیں۔"

اس پر آپ نے فرمایا:

---

[1] مستدرک الوسائل۔ باب مقدمات النکاح

"وہ بھی تمھاری طرح ہی ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ اس کا شوہر گندہ رہے اور پریشان وضع ہو۔ بلاشبہ پاکیزگی، خوشبو لگانا اور سر اور چہرے کو درست حالت میں رکھنا انبیائے کرامؑ کے اخلاق میں سے ہیں۔"

ایک خلیفہ کے دورِ حکومت میں ایک عورت نے خلیفہ کے پاس اپنے شوہر کے خلاف شکایت کی اور تقاضا کیا کہ اس کے شوہر کو حاضر کر کے اُسے اس سے طلاق دلائی جائے۔

خلیفہ نے وجہ پوچھی تو عورت نے جواب دیا:

"میں اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی اور مجھے اس کے ساتھ زندگی گزارنا ناگوار ہے۔"

خلیفہ عورت کی مایوسی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے مختلف طریقوں سے معاملے کی چھان بین کی۔ اس سلسلے میں ان کے مابین یوں گفتگو ہوئی:

خلیفہ : کیا تمھارا شوہر تمھارے اخراجاتِ زندگی ادا کرنے میں کوتاہی برتتا ہے؟

عورت : نہیں۔

خلیفہ : کیا وہ تمھیں مارتا پیٹتا اور اذیّت دیتا ہے؟

عورت : نہیں۔

خلیفہ : کیا وہ تم سے بے اعتنائی برتتا ہے؟

عورت : نہیں۔ ان میں سے کوئی بات نہیں۔ میرا شوہر ایک اچھا آدمی ہے لیکن وہ مجھے پسند نہیں ہے۔

خلیفہ نے اُس عورت کے شوہر کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر گزرنے پر سرکاری پیادے ایک شخص کو خلیفہ کی خدمت میں لے آئے جو بے حد غلیظ اور پریشان وضع تھا۔ اس کے بال بے ترتیب اور اُلجھے ہوئے تھے ناخن بڑھے ہوئے تھے اور لباس پھٹا پرانا تھا۔

خلیفہ نے اس پر بھی جرح کی تاکہ شاید سوالات اور جوابات سے عورت کی مایوسی کے سبب کا پتا چلایا جا سکے لیکن کوئی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔ پھر خلیفہ کو خیال آیا کہ شاید عورت

کی بیزاری کی وجہ اس کے شوہر کی یہی پریشان وضع ہو۔ لہٰذا اس نے عورت کو حکم دیا کہ آج تم واپس جاؤ اور کل اپنے شوہر کے ساتھ طلاق کے اجرا کے لیے یہاں آ جاؤ۔

عورت چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد خلیفہ نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ اس کے شوہر کو حمّام میں لے جائیں اور اس کے سر اور چہرے کی اصلاح کرائیں اور اسے صاف ستھرا لباس پہنائیں۔ اس کام سے فراغت کے بعد اس نے اسے بھی رخصت کر دیا اور حکم دیا کہ کل صبح اپنی بیوی کے ساتھ یہاں حاضر ہو جاؤ۔

دوسرے دن خلیفہ نے کافی انتظار کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ آیا۔ اُس نے کسی کو بھیجا تاکہ انھیں حاضر کیا جائے۔ جب وہ آئے تو خلیفہ نے عورت سے کہا کہ اب ہم تمھاری طلاق کے اجرا کے لیے تیّار ہیں۔

عورت نے تشویش اور اضطراب سے کہا:

"نہیں! اب میں اپنے شوہر سے جُدا ہونے پر ہرگز تیّار نہیں ہوں۔ میں اُسے چاہتی ہوں اور جو کچھ کل کہہ چکی ہوں اُس پر نادم ہوں۔"

خلیفہ ہنسا اور انھیں پیار اور محبّت سے زندگی گزارنے کی تلقین کی۔

خلیفہ کی سوچ درست تھی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ عورت یا مرد کی پریشان وضع مایوسی اور نفرت حتّٰی کہ طلاق اور جُدائی کا موجب بن جائے۔

امام محمد الباقر علیہ السّلام فرماتے ہیں:

لَا يَنْبَغِيْ لِلْمَرْئَةِ اَنْ تُعَطِّلَ نَفْسَهَا وَلَوْ اَنْ تُعَلِّقَ فِيْ عُنُقِهَا قِلَادَةً ..... [1]

"عورت کو اپنے شوہر کی خاطر زیور کے بغیر نہیں رہنا چاہیئے خواہ وہ گردن میں گلوبند ہی پہن لے۔"

---

[1] الکافی ۔ جلد دوّم ۔ صفحہ ۶۱

اگر عورت ان مسائل کی جانب توجّہ دے جو بظاہر بے اہمیّت نظر آتے ہیں اور اپنی آرائش اور گھر کے امور سلجھانے کا اہتمام کرے تو وہ اپنے علیحدگی پسند اور مایوس شوہر کو اپنے آپ میں اور گھر کے معاملات میں دلچسپی لینے پر مائل کر سکتی ہے اور گھر کی فضا کو خلوص اور محبّت سے معمور کر سکتی ہے۔

ڈیل کارنیگی کہتا ہے:

"جب گھر سجا ہوا ہو اور کمرے ایسے سلیقے سے آراستہ کیے گئے ہوں کہ مکان کو جاذب بنا دیں اور عورت گھر میں شوہر کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کرے تو شوہر اِدھر اُدھر دوسروں کے پاس بھٹکنے کی بجائے سیدھا اپنے گھر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو شوہر فخر محسوس کرتا ہے کہ اس کی حالت اتنی اچھّی ہے اور بعد میں وہ گھر سے مانوس ہو جاتا ہے۔ شوہر کو گھر میں آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس کا جہاں جی چاہے بیٹھے، جو جی چاہے کھائے، اپنا سگار اور روزنامہ جہاں جی چاہے رکھّے اور بالآخر اُسے گھر میں مکمل آسائش حاصل ہو۔"

خوشی اور سکون ایسی چیزیں نہیں جنھیں بازار سے خریدا جا سکے بلکہ انھیں فقط شوہر اور بیوی کے نیک اخلاق، طور طریقوں اور گفتگو سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

امام السجّاد علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

اَلْقَوْلُ الْحَسَنُ یُثْرِی الْمَالَ وَیَنْمِی الرِّزْقَ وَیُنْسِیُٔ فِی الْاَجَلِ وَیُحَبِّبُ اِلَی الْاَهْلِ وَیُدْخِلُ الْجَنَّةَ [1]

"اچھی باتیں انسان کی دولت اور روزی کو بڑھاتی ہیں۔ اس کی عمر کو دراز کرتی ہیں۔ بیوی اور اولاد کے درمیان محبّت کا موجب بنتی ہیں اور انسان

---

[1] الزواج فی الاسلام۔ صفحہ ۱۹۸

کو بہشت میں پہنچاتی ہیں۔"

شوہر اور بیوی کی ذمّے داریوں کے بارے میں مغرب کے دانشوروں نے کئی ایک بیانات دیے ہیں جن کے ایک زاویے کی جانب ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں لیکن اس نکتے کا ذکر کردینا ضروری ہے کہ اسلامی احکام اور دانشمندوں کے درمیان تفاوت ہے اور وہ یہ کہ اسلامی احکام کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہے جو ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک ہے جبکہ دانشمندوں کے نظریات جو تجربے وغیرہ سے حاصل کیے گئے ہیں اشتباہ سے خالی نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مسائل کے بارے میں خود ان کے مابین بہت سے اختلافات موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ہر روز سابقہ دانشمندوں کے بہت سے نظریات رَد کردیے جاتے ہیں اور نئے نظریات ان کی جگہ لے لیتے ہیں لیکن اسلام کے احکام چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی مکمّل طور پر اپنی قوّت اور اعتبار کے بل بوتے پر باقی ہیں اور دورِ حاضر کے دانشمند بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔

مغرب کے فلسفیوں کے نظریات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

سموئیل اسمائلز کہتا ہے:

"اگرچہ مَرد کی صفات اور امتیازات کا تعلّق اس کی سوچ بچار سے ہے اور عورت کے اوصاف اور خصوصیات کا تعلّق اس کے قلب سے ہے لیکن ضروری ہے کہ مَرد اپنے قلب کی تربیّت اپنی سوچ بچار کی مانند کرے اور عورت پر بھی واجب ہے کہ اپنی فکر کی تربیّت اپنے قلب کی طرح کرے۔ بدنیّت اور فاسد دل کا مالک مَرد ایک جاہل اور معمولی عورت کی طرح ایک متمدّن معاشرے میں بے اہمیّت ہوتا ہے۔ جو عورت اور مَرد صحّت مند اور پاکیزہ اخلاق کے مالک بننا چاہیں انھیں چاہیے کہ اپنے تمام فکری اور اخلاقی پہلوؤں کی تربیّت اور پرورش کی کوشش کریں کیونکہ اگر مَرد شفقت اور دوسروں کی

حالت کا احساس کرنے سے عاری ہو تو وہ ایک حقیر، بے فائدہ اور خود غرض ہستی ہے اور عورت خواہ کتنی ہی خوبصورت ہو اگر وہ عقل و ہوش نہ رکھتی ہو تو وہ ایک ایسی گڑیا کی مانند ہے جسے لباس پہنا دیا گیا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عورت کی خصوصیات اس کے دوسروں سے روابط قائم کرنے کے موقع پر اور اس کے جذبات اور محبت کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں۔

عورت ایک نرس ہے جسے بنی نوعِ انسان کی پرورش پر مقرر کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ کمزور اور ناتوان بچوں کی نگہداشت کرتی ہے اور فطری رجحان کی بنا پر انھیں مہر و محبت کی آغوش میں پالتی ہے۔ عورت گھر کا محافظ فرشتہ ہے اور اپنے حسنِ سیرت اور نیک کردار کی بدولت خاندان کے لیے ایسا آرام و آسائش فراہم کرتی ہے جو اخلاق اور نیک خصلتوں کو قوت بخشتی ہے اور اُن کی پرورش کرتی ہے۔ عورت فطرتاً اور اپنی طبیعی ساخت کی وجہ سے شریف، مہربان، حوصلہ مند اور ایثار پسند ہوتی ہے اور اس کی پُر محبت آنکھوں سے امید اور اعتماد کا نُور جھلکتا ہے۔ یہ نورُ جہاں کہیں چمکے بیکسوں کو امید بخشتا ہے اور غم زدہ اور مصیبت کے مارے لوگوں کو تسلّی دیتا ہے۔

معاشرے کے ہمیشہ پاک و پاکیزہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کی تربیت کے مابین توازن قائم رہے کیونکہ عورت کی طہارت اور عفّت اور مَرد کی طہارت اور تقویٰ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں پر اخلاقی قوانین کا برابر برابر اطلاق ہوتا ہے لہٰذا اگر معاشرہ اخلاقی عیوب سے پاک رہنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی عورتیں اور مَرد پرہیز گار اور اخلاقی فضیلت کے حامل ہوں اور جو عمل ضمیر اور اخلاق کی تعلیمات کے منافی ہو دونوں اس سے پرہیز کریں اور اسے ایک ایسا مہلک زہر سمجھیں جو ایک دفعہ

بدن میں داخل ہو کر پھر خارج نہیں ہوگا اور اس کے بُرے اثرات آئندہ زندگی کی سعادت اور خوش بختی کو زائل کر دیں گے۔

مَرد کے خوشگوار متاہلانہ زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی سے روحانی یک جہتی رکھتا ہو لیکن عورت کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ مَرد کی ہی بدلی ہوئی شکل ہو اور ہر بات میں اس کی تقلید کرے کیونکہ جس طرح عورت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے شوہر کے اخلاق اور اطوار عورتوں جیسے ہوں اسی طرح مَرد بھی یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کی عادات مَردوں جیسی ہوں۔

عورت کے فضائل اور خوبیاں اس کی عقل و فکر میں نہیں بلکہ دل اور جذبات میں ہیں اور مَرد اس کی عقل اور معلومات سے نہیں بلکہ اس کی مہربانی اور شفقت سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور لذت حاصل کرتا ہے۔"

الیوزونڈل ہلمز کہتا ہے:

"ہم عقلی اور فکری قوتیں رکھنے والی عورت کے مقابلے میں اس عورت کی جانب زیادہ مائل ہوتے ہیں جو مشفقانہ جذبات کی مالک ہو۔

مَرد کبھی کبھی اپنے آپ سے اس قدر بیزار ہو جاتے ہیں کہ وہ ان تمام صفات اور خصوصیات کی تعریف کرتے ہیں جو خود ان سے مختلف ہوں۔"

وہ مزید کہتا ہے:

"اگر کوئی شخص مجھ سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کی دلیل مانگے تو میں اسے جواب دوں گا کہ اللہ کی رحمت اور عنایت کی دلیل ہمارے حق میں وہ عجیب اختلاف ہے جو مَرد اور عورت کے مزاج کی افتاد میں پیدا کیا گیا ہے تاکہ اس کے وسیلے سے ان کا ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا ممکن ہو سکے۔"

ہنری تبیلور کہتا ہے:

"ایک اچھی عورت کو ایسی صفات اور عادات کا مالک ہونا چاہیے کہ وہ گھر کو مرد کے لیے راحت اور آسائش کا مقام بنادے اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عورت میں اتنی قابلیت ہو کہ مرد کو گھر کا انتظام چلانے کی زحمت سے فارغ کردے اور بالخصوص اُسے قرضے کے خطرے سے محفوظ رکھے۔ نیز عورت کو چاہیے کہ مرد کے سامنے پسندیدہ شکل میں آئے کیونکہ مرد کی پسند اس کی باطنی طبیعت سے مکمل ارتباط رکھتی ہے اور اس کے بغیر کوئی محبت بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ایک ایسی زندگی میں جس کے ساتھ تکالیف اور آلام بھی پیوستہ ہیں اگر گھر پیار اور محبت کا مقام نہ ہو تو وہ یقیناً آرام اور راحت کی جگہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فکر و روح کی آسائش فقط مہر و محبت کے دامن میں ہی ممکن ہے۔

مرد اپنی بیوی سے دلربائی اور بناؤ سنگھار سے زیادہ عقل و ہوش، خوش و خرم طبیعت اور روشن خیالی کی توقع رکھتا ہے اور تند و تیز عشق، جذباتی پن اور سرکش احساسات کے مقابلے میں اس کی دلی مہربانی کی جانب زیادہ مائل ہوتا ہے۔

متاہلانہ زندگی بسر کرنے والے اشخاص کا دستور زندگی "صبر اور شکیبائی" ہوتا ہے۔ یہ زندگی حکومت کی مانند اپنی ایک مخصوص سیاست رکھتی ہے اور شادی شدہ شخص کو "کچھ لو کچھ دو" کے اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس کو بات ماننی بھی پڑتی ہے اور منع بھی کرنا پڑتا ہے۔ اسے صبر اور حوصلے سے کام لینا پڑتا ہے۔ انسان کے لیے یہ لازم نہیں کہ دوسروں کے احساسات کے معاملے میں اندھا بن جائے اور انھیں نہ دیکھے۔ اس کے برعکس ضروری ہے

کہ وہ درگزر اور چشم پوشی کی قوت رکھتا ہو اور جو کچھ دیکھے اسے نرمی اور مہربانی سے برداشت کرے۔

ازدواجی زندگی میں تمام صفات اور عادات میں سے معتدل مزاجی سب سے زیادہ مفید، ضروری اور دیرپا ہوتی ہے اور اگر یہ پسندیدہ خصلت خودداری سے وابستہ ہو تو انسان کو حوصلے اور بُردباری کا عادی بنا دیتی ہے اور وہ اس بات کا خوگر ہو جاتا ہے کہ سختیوں اور خلافِ مزاج باتوں کے مقابلے میں حوصلے سے کام لے اور اگر کوئی سخت الفاظ سُنے تو جواب نہ دے اور چُپ چاپ بیٹھا رہے حتّٰی کہ دوسرے فریق کا غصّہ ٹھنڈا پڑ جائے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ نرم جواب غصّے کے شعلے کو بُجھا دیتا ہے، اس کا اطلاق سب سے زیادہ ازدواجی زندگی پر ہوتا ہے۔

انگریزی کی مشہور مثل ہے کہ: لڑکیاں جال بنانے میں مہارت رکھتی ہیں لیکن ان کی بہتری اس میں ہے کہ پنجرہ بنانے کا طریقہ سیکھیں۔

مردوں کو عموماً پرندوں کی طرح جال میں آسانی سے پھنسایا جا سکتا ہے لیکن پرندوں ہی کی طرح ان کی نگہداشت بھی بے حد مشکل اور دقت طلب ہے۔ اگر عورت اپنے گھر کو یوں نہ سنوار سکے کہ وہ مرد کے لیے سب سے زیادہ آراستہ اور مسرّت انگیز جگہ ثابت ہو اور مَرد دن بھر کی محنت کے بعد خوش خوش وہاں جانے پر آمادہ ہو تو اس بدنصیب مَرد کی حالت پر آنسو بہانے چاہئیں اور درحقیقت اسے ایک بے خانماں شخص سمجھنا چاہیئے۔۔۔ کوئی عقلمند شخص فقط عورت کے حسن و جمال کی خاطر اس سے رشتۂ ازدواج قائم نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ شروع شروع میں عورت کی خوبصورتی مَرد کو اس پر فریفتہ کرنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہوتی ہے لیکن بعد میں اس کی زندگی

میں کسی نفوذ اور تاثیر کی حامل نہیں ہوتی۔ بلاشبہ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ خوبصورتی کی مذمت کریں یا اس کی قدر و قیمت کو گھٹانے کی کوشش کریں کیونکہ چہرے اور جسم کی خوبصورتی عموماً صحت مند مزاج کی علامت ہوتی ہے۔ دراصل جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک ایسی حسین وجمیل عورت سے شادی کرنا جو اخلاقی اور روحانی خوبیوں سے عاری ہو ایک بہت بڑی غلطی ہے جس کی تلافی ہرگز ممکن نہیں۔

ظاہری زیبائش ایک نہ ایک دن مرجھا جاتی ہے اور اس کی کوئی قدرو قیمت نہیں رہتی۔ اس کے برعکس معنوی حسن اور خوبی ہر صورت میں ہمیشہ شاداب اور دلکش رہتی ہے اور جوں جوں وقت گزرتا ہے اس کی رونق اور دلفریبی گھٹنے کی بجائے بڑھتی رہتی ہے۔ شادی ہوئے جب ایک سال گزر جاتا ہے تو مرد اور عورت میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے حسن صورت کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ اس کے برعکس دونوں ایک دوسرے کے خلق اور طور طریقوں پر توجہ دیتے ہیں۔"

دوتو کوپل کہتا ہے:

"مرد کو اپنی زندگی میں ایک نیک سیرت اور با اخلاق بیوی سے بڑھ کر کوئی سہارا میسر نہیں آسکتا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے کمزور اور ناتواں اشخاص بھی دیکھے ہیں جنھوں نے اجتماعی امور میں بڑے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کی بیویاں لائق اور با اخلاق تھیں جنھوں نے ازدواجی ذمے داریاں انجام دیتے وقت اپنے شوہروں کی روحانی معاونت کی اور انھیں غلطیوں سے محفوظ رکھا۔"

جو کچھ اب تک بیان کیا گیا وہ بیوی اور شوہر کے حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات

کا ایک نمونہ تھا۔ اب بحث کے خاتمے پر ہم بیویوں اور شوہروں کے کچھ حقوق کی فہرست دیتے ہیں اور ان کی تفصیل اور ایک دوسرے کے حقوق کا ذکر مفصّل کتابوں پر چھوڑ دیتے ہیں:

- شوہر پر واجب ہے کہ اپنی بیوی کو جانے پہچانے معیار کے مطابق اخراجات مہیّا کرے۔ ان اخراجات میں لباس، خوراک، گھر کا ساز و سامان، خدمت گار اور دوسری تمام ضروریاتِ زندگی شامل ہیں جو عورت کو اس کی حیثیّت کے مطابق دی جانی چاہئیں۔
- ضروریاتِ زندگی مہیّا کرنے میں بیوی کو تکلیف اور عُسرت میں مبتلا نہ کرے اور آرام و آسائش کے وسائل اسے فراہم کرے۔
- بیوی کی عزّت و احترام کرے اور اسے دُکھ نہ دے۔
- بیوی کو ایسے کام کرنے کو نہ کہے جو اس کے لیے مناسب اور اس کے شایانِ شان نہ ہوں مثلاً تجارت، زراعت وغیرہ بلکہ گھر کے کام مثلاً کپڑے دھونے کھانا پکانے اور بچّوں کو صاف ستھرا رکھنے کی ذمّے داری بھی اس پر نہ ڈالے البتّہ عورت کے لیے مستحب ہے کہ گھر کے کام اور شوہر اور اولاد سے متعلّق خدمات انجام دے۔
- بیوی کی غلطیوں اور لغزشوں کو نظر انداز کرے اور اسے معاف کر دے اور اس کی بداخلاقیوں پر (اگر وہ کبھی کبھی بداخلاقی کا مظاہرہ کرے تو) صبر سے کام لے اور بلاوجہ اس کی جانب سے بدگمانی کا اظہار نہ کرے۔
- اپنے جسم اور لباس کی پاکیزگی کا خیال رکھّے۔
- دورانِ گفتگو اچھّی باتیں کرے اور سوالات کے اچھّے جواب دے۔
- بیوی کو اچھّائیوں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے۔
- اگر بیوی، بیٹی کو جنم دے تو اس کے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہ آئے اور

تقدیر الٰہی کو اس سے منسوب نہ کرے۔

- اس سے کنارہ کشی نہ کرے۔
- بیوی پر واجب ہے کہ شوہر سے بد اخلاقی نہ کرے اور غصّے، تُرش روئی اور بدزبانی سے اُسے دُکھ نہ دے۔
- بیوی کے لیے مستحب ہے کہ کام کاج میں شوہر کی مدد کرے اور بالخصوص گھر کے امور اور غذا کی تیاری وغیرہ کی ذمّے داریاں سنبھال لے۔
- شوہر کو عزیز رکھے اور اس کی عزّت و احترام میں کوتاہی نہ کرے۔
- شوہر کے علاوہ کسی اور کی خاطر بناؤ سنگھار نہ کرے۔
- شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال صدقے اور صلۂ رحمی کے طور پر بھی خرچ نہ کرے۔
- شوہر کی موجودگی اور غیر موجودگی میں اس کی آبرو کی حفاظت کرے۔

عورت اور مرد کے ان ضوابط پر کاربند ہونے سے ان کی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور ان کے گھر کی خوش بختی میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تقریباً تمام کی تمام جدائیوں اور خاندانوں کی پریشانیوں کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عورت اور مرد اپنی ذمّے داریوں کو نہیں سمجھتے یا ان کی انجام دہی سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

باایمان عورتیں اور مرد جو اپنے آپ کو احکامِ خداوندی انجام دینے کا مکلّف سمجھتے ہیں وہ ان پر بے چون و چرا عمل پیرا ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دنیا اور آخرت کی خوش بختی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

اِسلام میں اُستاد کا مقام

اگر لوگوں کی قدر و قیمت کا تعین ان کے کام کے معیار سے کیا جائے تو بلاشبہ معلّمین کا مقام ممتاز ترین مقامات میں سے ہے کیونکہ یہ طبقہ بے حد اہم اور نازک کاموں کی ذمّے داری سنبھالتا ہے اور ان کے کاموں کے نتائج کا مقابلہ بہت کم دوسرے طبقات سے کیا جا سکتا ہے۔

پہلے نمبر پر یہ اہم ذمّے داری انبیائے کرامؑ نے قبول کی اور لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بیڑا اُٹھایا۔ انبیاء علیہم السلام کا معلّم خود خدائے بزرگ و برتر ہے اور قرآنِ مجید میں بار بار اس امر کی وضاحت کی گئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور رفقا انھیں معلّم الخیر کہتے تھے اور بلاشبہ یہ جملہ ان کی عالی منزلت کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

جو لوگ کسی نہ کسی طریقے سے دوسروں کی تعلیم و تربیت کی ذمّے داری سنبھالتے ہیں ان کے لیے یہ افتخار کچھ کم نہیں کہ ان کا کام انبیائے کرامؑ کے کام کے زمرے میں آتا ہے اور اگر کسی دن بنی نوعِ انسان کی طبقہ بندی کام کے لحاظ سے کی جائے تو ان کے طبقے کا شمار عالمِ بشریت

کے بزرگ رہنماؤں میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبرؑ بے حد تکالیف برداشت کرکے اور لوگوں کی جانب سے کسی صلے کی توقع رکھے بغیر اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ اللہ کے بندوں کو پاکیزگی اور بھلائی کی دعوت دیں اور انھیں علم اور ایمان کی زرہ بکتر سے آراستہ کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی اور لوگوں کی ہدایت کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہ تھا۔

حضرت عیسیٰؑ ابن مریم اپنے شاگردوں سے بڑی تواضع سے پیش آتے تھے اور انھیں محبت سے اپنے پاس بٹھاکر تعلیم دیا کرتے تھے۔ جب آپ کے شاگرد آپ کی تعلیمات ازبر کرلیتے تو آپ انھیں اردگرد کے مقامات کی جانب روانہ کردیتے تاکہ انھوں نے جو کچھ خود سیکھا ہے وہ دوسروں کو بھی سکھائیں۔ کوئی معلم یہ کام نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اگر وہ مذہبی کام پر مامور ہو تب بھی عموماً کوشش کرتا ہے کہ سب لوگوں کو خود تعلیم دے اور جماعت کے تمام افراد سے اس کا براہِ راست رابطہ ہو مثلاً سقراط جب کسی کو کوئی چیز سکھانا چاہتا تھا تو خود سکھاتا تھا اور گو اس کے ایسے شاگرد بھی تھے جو معلمی کے رتبے پر پہنچ چکے تھے لیکن کبھی بھی یہ نہیں سنا گیا کہ اُس نے اپنے شاگردوں کو اس کام پر مامور کیا ہو اور انھیں لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے اِدھر اُدھر بھیجا ہو۔

قَالَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ يَا مَعْشَرَ الْحَوَارِيِّينَ لِي إِلَيْكُمْ حَاجَةٌ اقْضُوهَا لِي قَالُوا قُضِيَتْ حَاجَتُكَ يَا رُوحَ اللهِ فَقَامَ فَغَسَلَ أَقْدَامَهُمْ فَقَالُوا كُنَّا نَحْنُ أَحَقُّ بِهٰذَا يَا رُوحَ اللهِ فَقَالَ إِنَّ أَحَقَّ النَّاسِ بِالْخِدْمَةِ الْعَالِمُ إِنَّمَا تَوَاضَعْتُ هٰكَذَا لِكَيْمَا تَتَوَاضَعُوا بَعْدِي فِي النَّاسِ كَتَوَاضُعِي لَكُمْ [1]

حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

---

[1] وافی - جلد اوّل - صفحہ ۴۴

"میں تم سے ایک حاجت رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس کے انجام دینے پر راضی ہو جاؤ۔" سب نے جواب دیا: "آپ جو فرمائیں ہم اطاعت کریں گے۔" حضرت عیسیٰؑ اُٹھے اور اُن کے پاؤں اپنے دستِ مبارک سے دھوئے اصحاب نے کہا: "اے پیغمبرِؑ خدا! مناسب تو یہ تھا کہ ہم آپ کے پاؤں دھوتے۔" آپ نے فرمایا: "لوگوں کی خدمت کے لیے عالم سب سے زیادہ موزوں ہے اور میں نے تمھارے ساتھ یہ تواضع اور انکسار اس لیے برتا ہے کہ تم بھی لوگوں کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔"

دوسرے انبیائے کرامؑ بھی لوگوں کو تواضع اور کریمانہ اخلاق کام میں لاتے ہوئے تعلیم دیتے تھے اور ان کی ہدایت فرماتے تھے اور یوں عملی طور پر دوسروں کو انسانیت اور فضیلت سکھاتے تھے۔

اسلام کے عالی مرتبت پیغمبرؐ جنھوں نے تعلیم اور تربیت کو آپس میں ملا دیا تھا، دن میں اور رات میں، سفر میں اور حضر میں غرضیکہ جب بھی موقع ملتا لوگوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔

قرآنِ مجید کی آیات اور رسولِ اکرمؐ کے ارشادات ایسے اسباق تھے جو لوگوں کو پڑھ کر سُنائے جاتے تھے اور ان اسباق نے چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اس زمانے کی دُنیا میں ایک ایسا عظیم انقلاب برپا کیا جس نے قوموں کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ انھوں نے لوگوں کو بُت پرستی، دُختر کُشی، قتل و غارت گری، جرائم اور دوسری ہزاروں برائیوں سے نجات دلا کر انسانیت کے راستے پر ڈال دیا۔

آنحضرتؐ کے سچّے جانشین امام علی علیہ السّلام نے بھی اسی روش کو اپنایا۔ نہج البلاغہ آپ کے انہی اسباق کا ایک حصّہ ہے جو آپ نے ضروری موقعوں پر لوگوں کو دیے۔

کلماتِ قصار، حکمت پر مبنی اقوال، خطوط، پند و نصائح اور آپ کی یادگار دوسری چیزیں علم و فضیلت کی ایک دنیا ہیں جن سے فقط آپ کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ گزشتہ ادوار

اور دورِ حاضر میں موجود آپ کے تمام شاگرد استفادہ کرتے چلے آئے ہیں۔

امام علی علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو "سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ" کہہ کر اس بات کی رغبت دلائی کہ اپنے سوالات پیش کریں اور جو کچھ چاہیں آپ سے پوچھیں۔ آپ کی شہادت کے بعد بنی امیہ کا تسلط قائم ہو جانے کی بنا پر ائمہ طاہرینؑ خانہ نشین ہو گئے۔ ان کا دائرۂ کار محدود ہو گیا اور ان کی مجالسِ درس معطل ہو گئیں۔ یہ صورتِ حال امام الباقرؑ کے زمانے تک باقی رہی۔ تاہم تمام سختیوں اور پابندیوں کے باوجود ائمہ طاہرینؑ نے لوگوں کو تعلیم و تربیت کا جو موقع بھی ملا اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

امام محمد الباقر علیہ السلام کی عمر کے آخری دور میں بنی امیہ کا اقتدار رُو بہ زوال ہو گیا تھا اور بنی عباس کو بھی ابھی غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ مملکتِ اسلامیہ انقلاب کی آگ میں جل رہی تھی اور بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کی یہی درمیانی مدت تھی جس کے دوران میں امام محمد الباقرؑ اور امام جعفر الصادقؑ کو لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اسلام کے حقائق کی نشر و اشاعت کا موقع ملا اور انھوں نے مدینے کی مسجد میں اپنی درس کی محفلیں قائم کیں۔

امام الصادقؑ کے مکتب میں بیس ہزار سے زیادہ شائقینِ علم نے تربیت حاصل کی جن میں سے چار ہزار افراد نے بیک وقت تعلیم حاصل کرنے کا آغاز کیا۔

امام الصادقؑ کے مکتب کی اہم بات یہ تھی کہ آپ پہلے اپنے شاگردوں کی تربیت کرتے تھے اور بعد میں انکی تعلیم پر توجہ مرکوز فرماتے تھے۔ آپ پہلا سبق یہ دیتے تھے کہ علم اور دانش کو دین و ملت کی خدمت اور روح کی سرفرازی کے لیے حاصل کرنا چاہیے۔ آپ فرماتے تھے کہ جو شخص اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے علم حاصل کرے وہ علم کی حقیقت سے دُور ہو جاتا ہے۔

امام الصادقؑ کے تقریباً چار ہزار راویانِ حدیث ایسے تھے جنھوں نے آپ کے زمانے میں ہی تالیف کا کام شروع کیا اور فقہ جعفری پر چار سو کتابیں لکھیں جو "چہار صد اصل"

کے نام سے مشہور ہیں۔ کتبِ اربعہ یعنی الکافی ، من لایحضرہ الفقیہ ، التہذیب اور الاستبصار انہی سے اخذ کی گئی ہیں۔

امام الصادق کے ممتاز شاگردوں میں سے ایک معروف کیمیاداں جابر بن حیّان ہے جس نے امامؑ کی درس کے دوران کی گئی تقاریر پر مشتمل ایک ہزار اوراق کی کتاب بطور یادگار چھوڑی ہے۔

محمد بن طلاحہ شافعی (متوفی ۶۵۴ھ) امام الصادقؑ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"آپ کے علم کے بحرِ بیکراں سے گرانبہا موتی ہاتھ لگتے تھے اور آپ کا دیدار انسان کو آخرت کی یاد دلاتا تھا۔ آپ کے ارشادات سننے سے تقویٰ اور فضیلت کا درس ملتا تھا۔ آپ کے مناقب اور فضائل بے شمار تھے۔ آپ نے علم کو اخلاقی فضیلت سے ملادیا تھا اور یہ طریقہ اللہ کے انبیاءؑ اور اولیا کا خاص طریقہ ہے۔" [۱]

جہاں تک دوسرے ائمۂ طاہرینؑ کا تعلق ہے گو ان پر عباسی خلفاء کی جانب سے مکمل پابندیاں عائد تھیں پھر بھی وہ مناسب موقع ملنے پر لوگوں کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کی کوشش فرماتے تھے۔

جب زمانے کے نامساعد حالات ان کو مجالسِ درس تشکیل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے تو وہ اپنی روش سے لوگوں کو فضیلت اور تقویٰ کا سبق دیتے تھے اور عملی تعلیم زبانی تعلیم سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام نے ارشاد فرمایا:

مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ إِمَامًا فَعَلَيْهِ أَنْ يَبْدَءَ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ غَيْرِهِ وَلْيَكُنْ تَأْدِيبُهُ

---

[۱] مطالب السؤال ۔ صفحہ ۸۱

بِسِيْرَتِهٖ قَبْلَ تَادِيْبِهٖ بِلِسَانِهٖ وَمُعَلِّمُ نَفْسِهٖ وَ مُؤَدِّبُهَا اَحَقُّ بِالْاِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَ مُؤَدِّبِهِمْ [1]

"جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کا رہنما قرار دے اُس کے لیے لازم ہے کہ دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے خود اپنے آپ کو تعلیم دے اور اسے چاہیئے کہ پہلے اپنی صحیح اور نیک روش سے اور پھر اپنی زبان سے لوگوں کی رہنمائی کرے اور جو شخص اپنی تعلیم اور تادیب کا بیڑا اٹھائے اور اپنی اصلاح میں لگ جائے وہ اس معلّم سے زیادہ عزّت اور احترام کا مستحق ہے جو لوگوں کی اصلاح کرتا ہے۔"

انبیائے کرامؑ جو عالمِ بشریت کے معلّم تھے ان کی کامیابی کا راز اس نکتے میں پوشیدہ تھا کہ وہ لوگوں کو جو حکم دیتے تھے اس پر خود بھی عمل کرتے تھے اور جن چیزوں سے انھیں منع فرماتے تھے انھیں خود بھی ترک کر دیتے تھے۔ جو کچھ کہتے تھے اس پر خود بھی ایمانِ راسخ رکھتے تھے اور چونکہ ان کی باتیں دل سے نکلتی تھیں اس لیے دل میں سرایت کر جاتی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ جو معلّم خود خوبیوں سے آراستہ ہوں اور اپنے اقوال پر عمل کریں ان کی تعلیم و تربیت شاگردوں پر بڑا خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔

معلّم کے حقوق

اسلامی اخبار اور روایات میں معلّم کے کچھ حقوق کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

امام السجّاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] نہج البلاغہ [2] بحار الانوار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۴

وَحَقُّ سَائِسِكَ بِالْعِلْمِ التَّعْظِيمُ لَهُ وَالتَّوْقِيرُ لِمَجْلِسِهِ وَحُسْنُ الْاِسْتِمَاعِ اِلَيْهِ وَالْاِقْبَالُ عَلَيْهِ وَاَنْ لَاتَرْفَعَ عَلَيْهِ صَوْتَكَ وَلَا تُجِيْبَ اَحَدًا يَسْئَلُهُ عَنْ شَيْئٍ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَالَّذِيْ يُجِيْبُ وَلَا تُحَدِّثَ فِيْ مَجْلِسِهِ اَحَدًا .... [1]

"تم پر معلّم کا یہ حق ہے کہ تم ہمیشہ اسے تعظیم اور تکریم کی نگاہ سے دیکھو اور اس کی صحبت کو عزیز رکھّو، اس کی باتیں غور سے سنو، اُس کی جانب مُنہ کر کے بیٹھو، اس کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو، اگر کوئی شخص اس سے سوال کرے تو تم جواب نہ دو بلکہ اُسے جواب دینے دو۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے کسی دوسرے شخص سے گفتگو نہ کرو۔ اگر اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کی برائی کرے تو اس کا دفاع کرو۔ اس کے عیبوں پر پردہ ڈالو۔ لوگوں کے سامنے اس کی خوبیاں بیان کرو۔ اس کے دشمنوں کے ساتھ میل جول نہ رکھّو۔ اس کے دوستوں سے دشمنی نہ کرو۔ اگر تم ان باتوں پر عمل کروگے تو فرشتے گواہی دیں گے کہ تم نے معلّم کا حق ادا کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معلّم کے علم سے استفادہ کیا ہے۔"

پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں :

مَنْ عَلَّمَ مُسْلِمًا مَسْئَلَةً فَقَدْ مَلَكَ رَقَبَتَهُ۔ فَقِيْلَ لَهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيَبِيْعُهُ؟ قَالَ لَا وَلٰكِنْ يَاْمُرُهُ وَيَنْهَاهُ [2]

"جو شخص کسی مسلمان کو دینی امور کی تعلیم دے وہ اس کا آقا بن جاتا ہے"

---

[1] بحار الانوار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۲ [2] بحار الانوار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۲

لوگوں نے پوچھا: "یارسول اللہ! کیا وہ اسے فروخت کر سکتا ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "نہیں لیکن وہ اُسے حکم دے سکتا ہے اور کسی کام سے منع کر سکتا ہے۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ مِنْ حَقِّ الْمُعَلِّمِ عَلَى الْمُتَعَلِّمِ اَنْ لَا یُکْثِرَ السُّؤَالَ عَلَیْهِ وَلَا یَسْبِقَهُ فِی الْجَوَابِ وَلَا یُلِحَّ عَلَیْهِ اِذَا اَعْرَضَ وَلَا یَاْخُذَ بِثَوْبِهِ اِذَا کَسِلَ وَلَا یُشِیْرَ اِلَیْهِ بِیَدِهِ وَلَا یَغْمِزَهُ بِعَیْنِهِ .... [1]

"معلّم کا حق یہ ہے کہ شاگرد اس سے بہت زیادہ سوال نہ کرے اور جب تک معلّم کوئی بات نہ پوچھے اُس کا جواب نہ دے۔ کسی معاملے میں اس سے اصرار نہ کرے اگر وہ تھک جائے تو اسے بحث جاری رکھنے پر مجبور نہ کرے۔ ہاتھ اور آنکھ کو حرکت دے کر اس کی جانب اشارہ نہ کرے۔ اُس کے سامنے کسی کے بارے میں بدگوئی نہ کرے۔ معلّم کی موجودگی اور غیر موجودگی میں اس کا ادب ملحوظ رکھے۔ جب کبھی اس کی مجلس میں وارد ہو تو سب حاضرین کو عموماً اور معلّم کو خصوصاً سلام کرے اور اس کا احترام بجا لائے۔ اس کے سامنے نہایت ادب سے بیٹھے۔ اگر معلّم کو کوئی حاجت درپیش ہو تو دوسروں سے پہلے اس کی خواہش پوری کرنے کا اقدام کرے۔ اگر معلّم کی گفتگو لمبی ہو جائے تو بیزاری کا اظہار نہ کرے۔ بلاشبہ معلّم کھجور کے درخت کی مانند ہے۔ انسان کو انتظار کرنا چاہیئے تاکہ جب اس سے استفادہ کرنے کا وقت آئے تو استفادہ کرے۔"

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۴۴

إِنَّ مُعَلِّمَ الْخَيْرِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ دَوَابُّ الْأَرْضِ وَحِيتَانُ الْبَحْرِ وَكُلُّ ذِي رُوحٍ فِي الْهَوَاءِ وَجَمِيعُ أَهْلِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ [1]

"جو معلّم اللہ کے بندوں کو بھلائی اور خوش بختی کے طریقے سکھاتا ہے اس کے لیے زمین کے تمام حرکت کرنے والے اور ہوا کے جاندار اور آسمان اور زمین کے رہنے والے اللہ کی درگاہ سے بخشش اور مغفرت طلب کرتے ہیں۔"

ایک دفعہ مدینہ کی ایک مسلمان عورت، صدیقہ طاہرہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا:

"میری ماں بے حد ضعیف اور کمزور ہے اور اسے نماز کے مسائل کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے اور اب اس نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ آپ سے ان مسائل کے متعلق دریافت کروں۔"

آپ نے فرمایا:

"تم جو کچھ پوچھنا چاہو پوچھو۔"

اس عورت نے ایک مسئلہ پوچھا اور حضرت فاطمہؑ نے اس کا جواب دیا۔ پھر اس نے ایک اور سوال کیا اور آپ نے اس کا جواب بھی مرحمت فرمایا۔ پھر وہ اور سوال پوچھتی رہی حتیٰ کہ آپ نے اس کے دس سوالوں کے جواب دیے۔

وہ عورت شرمندہ ہوگئی اور کہنے لگی کہ اب میں آپ کو مزید زحمت نہ دوں گی۔

حضرت فاطمہؑ نے خندہ پیشانی سے فرمایا:

"جو چاہو پوچھو۔ اگر کسی کو ایک بھاری بوجھ چھت پر لے جانے کے لیے ایک لاکھ دینار دیے جائیں تو کیا اس مزدوری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اسے تھکن

---

[1] بحارالانوار۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۷

کا احساس ہوگا؟"

اس عورت نے جواب دیا: "نہیں۔"

اس پر آپ نے فرمایا:

"میں تجھے جو مسئلہ بتاتی ہوں اس کے بدلے ہزار گنا معاوضہ حاصل کرتی ہوں لہٰذا مناسب ہے کہ ہرگز تھکاوٹ یا ملال محسوس نہ کروں۔ میں نے اپنے والدِ بزرگوار حضرت رسولؐ اللہ سے سُن رکھا ہے کہ قیامت کے دن مسلمان علماء اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک کو ان کے علم کے مطابق اور اس محنت اور کوشش کے اندازے سے جو انھوں نے اللہ کے بندوں کی ہدایت کے لیے کی ہوگی اجرِ عظیم عطا فرمایا جائے گا۔" [1]

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثَلَاثٌ لَا يَسْتَحْيِي مِنْهُنَّ اَحَدٌ: خِدْمَةُ الرَّجُلِ ضَيْفَهُ وَقِيَامُهُ عَنْ مَجْلِسِهِ لِاَبِيْهِ وَمُعَلِّمِهِ وَطَلَبُ الْحَقِّ وَاِنْ قَلَّ [2]

"تین چیزیں ایسی ہیں جن سے کسی شخص کو شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے اوّل مہمان کی خدمت، دوّم باپ اور معلّم کے رُوبرُو ہونے پر احتراماً کھڑا ہو جانا اور سوّم اپنا حق حاصل کرنا خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ عَلَّمَ خَيْرًا فَلَهُ بِمِثْلِ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهٖ قُلْتُ فَاِنْ عَلَّمَهُ غَيْرَهُ يَجْرِىْ ذٰلِكَ لَهُ قَالَ اِنْ عَلَّمَهُ النَّاسَ كُلَّهُمْ جَرٰى لَهُ قُلْتُ فَاِنْ مَاتَ؟

---

[1] تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام، بحار الانوار جلد دوّم۔ صفحہ ۳ - [2] غرر الحکم

قَالَ وَإِنْ مَاتَ [1]

"اگر کوئی شخص کسی کو کوئی نیک کام سکھائے تو جو جزا اس نیک کام کرنے والے کو ملتی ہے اس کے برابر ہی معلّم کو بھی ملتی ہے۔" (راوی کہتا ہے کہ) میں نے پوچھا: "سیکھنے والا شخص اگر وہی کام کسی دوسرے کو سکھا دے تو کیا پھر بھی پہلے معلّم کو ثواب میں سے حِصّہ ملتا ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "اگر وہ سب لوگوں کو سکھا دے تب بھی پہلے معلّم کا ثواب میں حصّہ ہوگا۔" میں نے عرض کیا: "اگر وہ فوت ہو چکا ہو تب بھی؟" آپ نے فرمایا: "ہاں۔"

ایک اہم نکتہ جس کی جانب معلّمین کو پوری پوری توجّہ دینی چاہیے یہ ہے کہ انسان کا مغز اپنے کم حجم کے باوجود عقل و تفکّر کا مقام بھی ہے اور جذبات اور احساسات کا مرکز بھی ہے۔ اگر ہم فقط عقل اور سوچ بچار سے کام لیں اور انھیں تقویّت بخشیں اور جذبات کے حصّے کی جانب توجّہ نہ دیں تو بلاشبہ ہم مغز کے آدھے حصّے کو تو سرگرمِ عمل کر دیں گے لیکن باقیماندہ آدھے حصّے کو مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔

موجودہ دَور میں بہت سے ممالک میں یہ بڑی مشکل پیش آئی ہے کہ اسکول اور تعلیم کے مراکز بچّوں اور نوجوانوں کے فقط عقلی اور فکری پہلو کی جانب توجّہ دیتے ہیں کہ تاریخی اور دوسرے علمی مطالب اور اصول طالب علموں کے ذہنوں میں ڈال دیں اور وہ بھی دانشمندوں کے نظریات کو ذہن نشین کر لیتے ہیں لیکن جذبات سے کام لینے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔

مشہور فرانسیسی ماہرِ عضویات ڈاکٹر الیکسِس کارل کہتا ہے:

"پہلی بنیادی چیز قوائے عقلی کی نشو و نما نہیں بلکہ اپنے اندر جذبات کی تعمیر ہے جو تمام اندرونی عوامل کا سہارا بن سکے۔ اخلاقی حِس کی ضرورت کسی طرح بھی بینائی اور شنوائی کی حِسوں سے کمتر نہیں۔ ہمیں عادت ڈالنی چاہیے کہ جس

---

[1] بصائر الدرجات

احتیاط سے ہم روشنی کو اندھیرے سے اور آواز کو خاموشی سے شناخت کرتے ہیں اسی طرح اچھائی اور بُرائی کے درمیان بھی امتیاز کریں اور پھر اپنے آپ کو اس امر کا پابند بنالیں کہ بُرائی سے پرہیز کریں اور نیکی پر عمل کریں لیکن بدی سے پرہیز کرنا بدن اور روح کی اچھی ساخت کا متقاضی ہے جسم اور روح کی حقیقی نشوونما تزکیۂ نفس کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

ذہین، اہلِ علم اور عاقبت اندیش افراد زندگی اور غور و فکر کے دقیق ضوابط کی پیروی کرتے ہیں۔ جو لوگ روح کی سربلندی چاہتے ہوں ان کے لیے کسی قسم کی بے اعتدالی جائز نہیں۔ اندرونی نظم و ضبط ہمیشہ اپنا معاوضہ حاصل کرتا ہے یہ معاوضہ قوّت ہے۔ قوّت خوشی لاتی ہے۔ ایک اندرونی، خاموش اور ناقابلِ بیان خوشی جو زندگی کا معمول بن جاتی ہے۔ گو یہ جسمانی اور روحانی وضع زمانۂ حاضر کے معلّمین اور ماہرینِ مدنیات کو عجیب معلوم ہوتی ہے اس کے باوجود یہ شخصیّت کے ایک ضروری رکن کی تعمیر کرتی ہے اور ایک طیّارہ گاہ کی مانند ہے جہاں سے روح اُوپر کی جانب پرواز کرسکتی ہے۔"

علمی سرمایہ اسی صورت میں انسان کو خوش بخت بنا سکتا ہے جب اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی فضائل بھی اس کی فطرت میں جاگزیں ہوں۔

رسولِ اکرمؐ نے جو بنی نوعِ انسان کے سب سے بڑے معلّم ہیں اپنی بعثت کا مقصد مختصراً ایک جملے میں بیان کردیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ

"میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔" [1]

انبیائے کرامؑ نے جو بنی نوعِ انسان کی تعلیم اور تربیّت پر مامور کیے گئے تھے اپنی

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۱۱

تعلیمات کی بنیاد تزکیۂ نفس پر رکھی اور اخلاقی وجذباتی مسائل کو ہر دوسری چیز سے زیادہ اہمیت دی۔
قرآنِ مجید، رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے بیان کے دوران تزکیہ کا ذکر تعلیم کے فریضہ سے پہلے کرتا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ق [1]

"وہی خدا ہے جس نے دانش سے عاری لوگوں کے درمیان ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ اُس کی آیات اُنھیں پڑھ کر سُنائے اور انھیں اخلاقی اور روحانی کثافتوں سے پاک کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔"

بیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے بوعلی سینا نے اپنے زمانے کے تمام علوم وفنون پر عبور حاصل کر لیا تھا اور علم کے ہر شعبے میں ممتاز تھا۔ ایک دن وہ ابوعلی مسکویہ کی مجلسِ درس میں حاضر ہوا۔

مسکویہ ایک فاضل شخص اور اپنے زمانے کے معروف دانشمندوں میں سے تھا اور بالخصوص اخلاقی اور تربیتی مسائل کے بارے میں استاد اور صاحبِ نظر تھا "طہارت الاعراق" نامی کتاب اسی کی یادگار ہے۔

ابنِ سینا کے ہاتھ میں ایک اخروٹ تھا۔ اُس نے وہ اخروٹ گستاخانہ طریقے سے مسکویہ کے آگے پھینکا اور کہا کہ اس کا رقبہ بتائیے۔

ابوعلی مسکویہ نے کتابِ اخلاق کا ایک جزو اس کی طرف بڑھایا اور کہا:

"اے جوان! تجھے اپنے اخلاق کی اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے۔ پہلے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لے اور پھر میرے پاس آنا تاکہ میں حساب لگا کر تجھے اخروٹ کا رقبہ بتا سکوں۔" [2]

---

[1] سورۃ الجمعہ۔ آیت ۲ [2] تاریخ علوم عقلی در اسلام۔ تربیت کودک۔ صفحہ ۲۵۱

ابنِ سینا نے یہ جملہ ساری زندگی فراموش نہ کیا اور اسے پلّے باندھ لینے اور اس پر عمل کرنے کی بدولت کبھی بھی صحیح زندگی کے دائرے سے قدم باہر نہ رکھا۔

فرانسیسی دانشمند ہ۔موسیر (H. Mossier) کہتا ہے:

"شاگردوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دینی چاہیے کہ علم کے علاوہ کچھ اور بھی قیمتی چیزیں ہیں۔ تعلیم کے علاوہ افراد اور اقوام کے درمیان طبقہ بندی کے دیگر عوامل بھی کارفرما ہیں۔ فنّی استعداد، رفاہِ عامّہ کے لیے دولت اور وسائل پیدا کرنے کی قوّت، انتظام چلانے یا اختراع کرنے کی قابلیّت اور دوسرے عوامل۔ یہ سب کی سب چیزیں بڑی اہم اجتماعی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر اور علم سے بھی بڑھ کر ایک اور عامل بھی وجود رکھتا ہے اور وہ تقویٰ اور پرہیزگاری سے عبارت ہے۔"

امام علی علیہ السّلام نے اپنے فرزند حضرت امام حسن المجتبیٰ ع سے فرمایا:

إِنَّ أَغْنَى الْغِنَى الْعَقْلُ وَ أَكْبَرَ الْفَقْرِ الْحُمْقُ وَأَوْحَشَ الْوَحْشَةِ الْعُجْبُ وَأَكْرَمَ الْحَسَبِ حُسْنُ الْخُلُقِ [1]

"بلاشبہ عقل بہترین سرمایہ اور جہل بدترین مفلسی ہے۔ سب وحشتوں سے زیادہ وحشتناک تکبّر اور خودپسندی ہے اور سب سے بلند کردار اچّھا اخلاق ہے۔"

معلّم کے کام کا اثر

عظیم فرانسیسی مصنّف آندرا موروآ (Anbre Maurois) اپنے اُستاد امیل شارتیر کے بارے میں کہتا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ۔ صفحہ ۱۱۰۴

"میں اپنے آپ کو جتنا اس معلم کا مرہونِ منّت سمجھتا ہوں اتنا اپنے باپ کا بھی نہیں سمجھتا اور جو کچھ میں جانتا ہوں وہ اس کی تعلیم کا فیض ہے۔"

معلم کے گہرے اثر کے بارے میں اس مشہور مصنّف اور دوسری ممتاز شخصیتوں کے اعترافات اور اسی طرح بہت سے تاریخی واقعات سے معلم کے مؤثر کردار کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

جو معلم اپنی ذمّے داری سے آگاہ ہو اور اپنا فریضہ صحیح طور پر انجام دے وہ بڑا بہترین اثر بطور یادگار چھوڑ جاتا ہے جو ایک مملکت کے افراد کی زندگی کا موجب بنتا ہے جیسا کہ مشہور انگریزی مثل میں کہا گیا ہے:

"اگر حضرت عیسیٰ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے تو معلم ایک پوری قوم کو زندہ کر دیتا ہے۔"

تاریخ بتاتی ہے کہ جن فرمانرواؤں نے اپنے لڑکپن اور جوانی میں نیک اور باایمان معلّمین سے صحیح تعلیم و تربیت حاصل کی انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں اچھے طور طریقے اختیار کیے۔

عُمر بن عبدالعزیز گو بنی امیّہ کے خاندان میں سے تھا لیکن اس نے اپنے دَورِ خلافت میں خلفائے بنی امیّہ سے مختلف روش اختیار کی اور اس کے اپنے اعتراف کے مطابق اپنے معلم کی تعلیم کے زیرِ اثر بہت سی برائیاں ترک کر دیں۔ وہ کہتا ہے:

"میں مدینہ میں تعلیم حاصل کرتا تھا اور ابنِ مسعود کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ انھیں خبر ملی کہ میں بھی دوسرے بنی امیّہ کی مانند امام علی علیہ السّلام پر تبرّا روا رکھتا ہوں ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نماز میں مشغول تھے اس لیے میں بیٹھ گیا کہ وہ نماز پڑھ لیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجّہ ہوئے اور فرمایا:

مَتٰی عَلِمْتَ اَنَّ اللهَ غَضِبَ عَلٰی اَھْلِ بَدْرٍ وَ بَیْعَتِہٖ

الرِّضْوَانِ بَعْدَ اَنْ رَضِيَ عَنْهُمْ ؟ [1]

"تجھے کہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ بدر و بیعتِ رضوان سے راضی ہو کر پھر ان پر غضب کیا ہے ؟"

میں نے جواب دیا کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں سُنی۔

انھوں نے فرمایا : "تیرے متعلق حضرت علیؑ کے بارے میں مجھے جو خبر ملی ہے وہ کیا ہے ؟"

"میں نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور اس دن سے میں نے حضرت علیؑ پر تبرّا کرنا ترک کر دیا۔"

اُستاد اور شاگرد کے مابین مدینہ میں جن سوالات اور جوابات کا تبادلہ ہوا وہ بے حد مختصر تھے۔ ان دونوں میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ چند جملے اسلامی مملکت میں ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بن جائیں گے تاہم اُستاد کے اُس دن کے کہے ہوئے الفاظ بچّے کے دل پر نقش ہو گئے اور اس پر ان کا بہت اثر ہوا۔ چند سال گزر گئے۔ بچہ بڑا ہو گیا اور اس کا شمار معاشرے کی ممتاز شخصیتوں میں ہونے لگا۔ غیر متوقع واقعات اور گوناگوں حوادث نے مملکت میں عظیم تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ ان کے نتیجے میں اُس دن کا بچہ تختِ خلافت پر متمکن ہو گیا اور لاکھوں لوگوں کے انتظامی امور کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آگئی۔

معلّم نے جو کچھ کہا وہ ایک بیج تھا جو اس دن بچّے کے دل میں بویا گیا۔ فرمانروائی اور ریاست کی بدولت اس بیج نے پرورش پائی اور بالآخر خوش بختی کے ایک خرمن کی شکل میں ظاہر ہوا اور لاکھوں افراد نے اس سے فائدہ اٹھایا اور امام علی ابن ابی طالب علیہ السّلام پر تبرّا کرنے کی شرمناک بدعت سے نجات پائی۔

یہ ایک معلّم کے الفاظ کے عظیم نتائج کا ایک نمونہ ہے اور تاریخ میں ایسے نمونے

---

[1] کامل ابنِ اثیر ۔ جلد ۵ ۔ صفحہ ۱۷

کافی ملتے ہیں۔

ہمیں معلّم بننا چاہیے

پیشوایانِ اسلام کے اقوال میں معلّم کے مقام کو جو عزت بخشی گئی ہے وہ ان اشخاص پر منحصر نہیں جو تعلیم کے شغل میں مصروف ہوں بلکہ لفظ 'معلّم' کے عام معنی میں ہر وہ شخص شامل ہے جو کسی دوسرے کو کوئی مفید چیز سکھادے۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ تعلیم دینے میں مشغول ہوں ان پر لفظ 'معلّم' آشکارا طور پر صادق آتا ہے تاہم ہر شخص، خواہ اس کے حالات کچھ بھی ہوں معلّم بن سکتا ہے اور اسے معلّم بننا چاہیے۔ وہ یوں کہ جو کچھ وہ جانتا ہو دوسروں کو بھی سکھائے۔ لوگوں کو سعادت اور نیک بختی کی راہ دکھائے اور بنی نوعِ انسان اور اپنے دینی بھائیوں کی ہدایت کی کوشش کرے تاکہ دنیا اور آخرت میں اللہ کی جانب سے اجر اور جزا سے بہرہ مند ہو۔

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

اَرْبَعٌ تَلْزِمُ كُلَّ ذِي حِجًى مِنْ اُمَّتِي قِيْلَ وَمَا هُنَّ يَا رَسُوْلَ اللهِ ؟ قَالَ اِسْتِمَاعُ الْعِلْمِ وَحِفْظُهٗ وَالْعَمَلُ بِهٖ وَنَشْرُهٗ [۱]

"چار چیزیں ہیں جو میری امّت کے تمام خردمندوں کے لیے لازمی ہیں۔ اوّل علمی مطالب سُننا، دوم ان مطالب کو حفظ کرنا اور ذہن نشین کر لینا سوم ان پر عمل کرنا اور چہارم انھیں دوسروں کو سکھانا۔"

ایک دوسرے موقع پر آنحضرتؐ نے فرمایا:

مَا تَصَدَّقَ النَّاسُ بِصَدَقَةٍ مِثْلَ عِلْمٍ يُنْشَرُ [۲]

---

[۱] کنز الفوائد۔ کراجکی

[۲] بحار الانوار۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۵

"ان صدقات میں سے جو لوگ دیتے ہیں کوئی صدقہ علم سکھانے سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔"

نبی کریمؐ کا ایک اور ارشاد ہے:

مَا اَهْدَى الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ عَلٰى اَخِيْهِ هَدِيَّةً اَفْضَلَ مِنْ كَلِمَةِ حِكْمَةٍ يَزِيْدُهُ اللّٰهُ بِهَا هُدًى وَيَرُدُّهُ عَنْ رَدًى [1]

"کوئی ہدیہ اس سے زیادہ گرانبہا نہیں کہ انسان ایک کلمۂ حق اپنے مسلمان بھائی سے کہے جس کے وسیلے سے وہ اللہ کے راستے کی جانب ہدایت پائے اور گمراہی سے نجات حاصل کرے۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

شُكْرُ الْعَالِمِ عَلٰى عِلْمِهٖ اَنْ يَبْذُلَهُ لِمَنْ يَسْتَحِقُّهُ [2]

"اللہ تعالیٰ نے جو نعمت دانشمندوں کو دی ہے اس کے مقابلے میں ان کی شکرگزاری یہ ہے کہ وہ اپنا علم ان لوگوں کو سکھائیں جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔"

امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ بَعَثَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ الْعَالِمَ وَالْعَابِدَ فَاِذَا وَقَفَا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ قِيْلَ لِلْعَابِدِ انْطَلِقْ اِلَى الْجَنَّةِ وَقِيْلَ لِلْعَالِمِ قِفْ تَشْفَعْ لِلنَّاسِ بِحُسْنِ تَاْدِيْبِكَ لَهُمْ [3]

"جب قیامت کا دن آئے گا تو خداوندِ عالم عالموں اور دانشمندوں کو

---

[1]، [2] بحار الانوار۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵ [3] بحار الانوار۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۶

اور اسی طرح عابدوں اور زاہدوں کو اپنی بارگاہ میں حاضر فرمائے گا پھر عابد کو بہشت میں جانے کی اجازت دی جائے گی اور عالم کو حکم دیا جائے گا کہ تجھے چاہیے کہ جو زحمتیں تو نے لوگوں کی ہدایت اور تادیب کی راہ میں اُٹھائی ہیں اُن کی خاطر ان لوگوں کی شفاعت کرے"۔

صاحب دِلے بمدرسہ آمد زخانقاہ
بشکست عہد صحبتِ اہلِ طریق را

(ایک صاحبِ دل شخص خانقاہ سے مدرسے میں آگیا اور اس نے اہلِ طریق کی صحبت کا عہد توڑ دیا۔)

گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود
تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را

(میں نے اس سے پوچھا کہ عالِم اور عابد کے درمیان کیا فرق تھا کہ تُو نے اُس گروہ کو چھوڑ کر اِس گروہ کو چُن لیا۔)

گفت آں گلیم خویش برون میکشد زِموج
واین جہد میکند کہ بگیرد غریق را [1]

(اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی گدڑی موج سے باہر کھینچ لے جاتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ ڈوبتے ہوئے کا ہاتھ تھام لے۔)

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ معلّم کے مقام اور اس کی نازک ذمے داری اور معاشرے پر اس کے گہرے اثرات کا اور اسی طرح اس اجر کا جو اللہ تعالیٰ نے ہمدرد، خیرخواہ اور خدمت گزار معلّمین کے لیے مقرر فرمایا ہے ایک نہایت ہی مختصر جائزہ تھا۔ ہمیں امّید ہے کہ ان مسائل کی جانب توجہ دیتے ہوئے ہم

---

[1] سعدی شیرازی

سب بنی نوعِ انسان کی ہدایت ، تعلیم و تربیت اور بالخصوص بچوں اور نوجوانوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیں گے تاکہ اس دنیا میں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں۔

اسلام میں
امانت کی ادائیگی

اسلام فقط انسانی زندگی میں ایک انقلاب کا مبدا ریا ایک انسانی تحریک کی اساس یا ترقّی اور کاملیّت کی جانب ایک جست کا موجب ہی نہ تھا بلکہ اسلام نے بشریت کو ایک تازہ زندگی اور ایک تازہ وجود بخشا اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے ظہور کے ساتھ انسان نے دوبارہ جنم لیا۔

انسان دنیا میں ظہورِ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا لیکن وہ تمدّن سے بے بہرہ تھا۔ لاتعداد طبقوں میں منتشر تھا اور شرک، بت پرستی، جرائم، قتل و غارت اور ہزاروں دوسری خرابیوں اور برائیوں میں مبتلا تھا۔

اگر زمانۂ قبل از اسلام کی کیفیّت اور ظہورِ اسلام کے بعد کی انسانی طرزِ حیات کا مختصر مقابلہ کیا جائے تو یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کیونکر زندگی کی ایک نئی راہ پر گامزن ہوا۔

اسلام کی تعلیمات نے ایک چوتھائی صدی سے بھی کمتر مدّت میں ایسے اشخاص کو پروان چڑھایا جو انسانیت کے اعلیٰ نمونے اور انسانی معاشرے کے لیے موجب افتخار ثابت ہوئے۔

لوگوں میں پرہیزگاری اور فضیلت کی روح پھونک دی گئی۔ برادر کُشی اور قتل وغارت کی جگہ نیکوکاری اور انسان دوستی نے لے لی۔ باہمی تفرقے اور خودغرضی کی بجائے لوگ مواسات اور بھائی چارے کے خوگر ہو گئے۔ ظلم وستم اور زیادتی کی بجائے عدل وانصاف اور دوسروں کے حقوق کے احترام کا چرچا ہونے لگا۔

اسلام کے مکتب نے مسلمانوں کو عالی ترین تربیّتی اصولوں سے روشناس کرایا اور رسولِ اکرمؐ نے عملاً لوگوں کو عدل وانصاف، امانتوں کی ادائیگی اور دوسری پسندیدہ صفات کی دعوت دی۔

ہمارے زیرِبحث موضوع "امانت کی ادائیگی" کا تعلّق اُن مسائل سے ہے جو انسانی معاشروں کی ترقّی اور سعادت کے سلسلے میں ناقابلِ تردید کردار ادا کرتے ہیں اور اسلام نے اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیّت دی ہے۔ جو چیز امانت کی ادائیگی کی اہمیّت کو خود زندگی کا مسئلہ بنا دیتی ہے وہ، وہ اثر ہے جو یہ لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ڈالتی ہے۔

ہر شخص اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی یا تو اپنی امانت دوسرے کے سپرد کرتا ہے اور یا دوسرے کی دی ہوئی چیز بطور امانت اپنے پاس رکھتا ہے۔ اب اگر لوگ امانتوں کی حفاظت اور واپسی کے پابند ہوں اور معاشرے میں باہمی اعتماد موجود ہو تو آسائش اور بہبود کا دَور دَورہ ہوتا ہے اور اگر امانت اور راستبازی کی جگہ خیانت اور بدنیّتی لے لے تو لوگوں کے دلوں سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ اس صورت کے نتیجے میں بہت سی مشکلات جنم لیتی ہیں۔

قرآنِ مجید نے متعدد آیات میں مسلمانوں کے لیے امانتوں کی ادائیگی لازمی قرار دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"بلاشبہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کرو۔" [1]

قرآنِ مجید یہ بھی فرماتا ہے کہ:

"یقیناً وہ اہلِ ایمان فلاح پانے والے ہیں جو نماز کی حالت میں خشوع و خضوع اختیار کرتے ہیں..... امانتوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور اپنا عہد پورا کرتے ہیں۔" [2]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت کی نجات اور بہشت سے جاودانی بہرہ مندی کو باایمان اشخاص کے لیے مخصوص قرار دیتا ہے اور ان لوگوں کی خصوصیات اور صفات بیان فرماتا ہے۔

ان آیات میں باایمان لوگوں کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ امانتوں اور اپنے کیے ہوئے وعدوں کا پاس کرتے ہیں اور انھیں قابلِ احترام شمار کرتے ہیں۔

ان دو مقامات کے علاوہ قرآنِ مجید میں اور آیات بھی ہیں جن میں امانتوں کی حفاظت اور ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے۔

پیشوایانِ اسلام کے اکثر مواعظ اور نصائح میں بھی امانتوں کی ادائیگی کی سفارش کی گئی ہے۔

جب رسولِ اکرمؐ نے معاذ بن جبل کو یمن کے ایک صوبے کا حاکم مقرّر فرمایا تو اُسے اُس کے بنیادی فرائض بھی بالتفصیل سمجھائے۔

اس سلسلے میں آپ نے فرمایا:

وَاُوْصِیْكَ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَ وَفَاءِ

---

[1] سورۃ النساء - آیت ۵۸ [2] سورۃ المومنون - آیات ۱-۲ اور ۸

بِالْعَهْدِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَةِ وَتَرْكِ الْخِيَانَةِ.... [1]

"... اے معاذ! میں تجھے تقویٰ، راست گوئی، ایفائے عہد اور امانت ادا کرنے اور خیانت ترک کرنے کی وصیت کرتا ہوں...."

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور موقع پر فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ اَخْلَفَ الْاَمَانَةَ [2]

"جو شخص امانت کے معاملے میں غلط روش اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

ایک اور ارشاد میں آپؐ نے امانت سے لاپروائی برتنے پر تنقید کی ہے اور فرمایا ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ يُحَقِّرُ الْاَمَانَةَ وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ خَانَ مُسْلِمًا فِيْ اَهْلِهِ وَمَالِهِ [3]

"جو شخص لوگوں کی امانت کو حقیر سمجھے وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو شخص کسی مسلمان کے گھرانے اور مال میں خیانت کرے وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔"

امام محمد الباقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

عَلَيْكُمْ بِالْوَرَعِ وَالْاِجْتِهَادِ وَصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَةِ اِلٰى مَنْ اِئْتَمَنَكُمْ عَلَيْهَا بَرًّا كَانَ اَوْ فَاجِرًا فَلَوْ اَنَّ قَاتِلَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْطَالِبٍ (ع) اِئْتَمَنَنِيْ عَلٰى اَمَانَةٍ لَاَدَّيْتُهَا اِلَيْهِ [4]

"تمھارے لیے پاکدامنی اور فرائض ادا کرنے کی کوشش کرنا اور جس کسی نے تمھیں

---

[1] ناسخ التواریخ۔ حالاتِ رسولِ خداؐ۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۲۶۷ [2] وافی۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۱۲

[3] مستدرک الوسائل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۰۵ [4] تحف العقول۔ صفحہ ۲۹۹

امین بنایا ہو اس کی امانت واپس کرنا ضروری ہے خواہ امانت کا مالک نیکوکار ہو یا بدکار۔ بلاشبہ اگر امام علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کا قاتل کوئی امانت میرے سپرد کرے تو میں اس کی امانت صحیح و سالم اُسے لوٹا دوں گا۔"

عبدالرحمٰن بن سبابہ کہتا ہے:

"جب میرا باپ فوت ہوگیا تو اُن کا ایک دوست تعزیت کے لیے ہمارے گھر آیا۔ ہماری دلجوئی کے بعد اس نے ہماری مالی حالت کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وفات کے وقت میرے باپ کے پاس کوئی مال نہ تھا اور فی الوقت ہمارے پاس بھی کچھ نہیں۔"

اس نے مجھے ہزار درہم دیے اور کہا: "اس رقم سے خرید و فروخت کرو۔ اس سے جو منافع ہو اس سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرو اور اس کی حفاظت اور نگہداشت کا خیال رکھو۔"

میں اُس شخص کے اس اقدام سے بہت خوش ہوا اور بھاگا بھاگا اپنی ماں کے پاس گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو گشائش ہمارے لیے پیدا کی تھی اس کے بارے میں اسے بتایا۔ وہ رات ہم نے بڑے اطمینان سے گزاری۔

دوسرے دن میں بازار گیا اور اپنے باپ کے ایک اور رفیق سے ملا۔ اس نے مجھے کچھ کپڑا خرید کر دیا اور میں بازار کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اسے بیچنے لگا۔

کپڑے کی خرید و فروخت جاری رہی اور اس ذریعے سے میں نے اپنے گھر کا خرچ چلانے کے علاوہ کچھ رقم پس انداز بھی کر لی اور میرا کاروبار چمک اُٹھا۔

حج کا موسم آگیا اور مجھے خانۂ خدا کی زیارت اور مناسکِ حج ادا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے اپنے اس ارادے کا ذکر اپنی ماں سے کیا۔

میری ماں نے کہا: "اس سے پیشتر کہ تو حج کو جائے تجھ پر ایک اور بڑی اہم ذمّے داری ہے اور وہ یہ کہ اس شخص کی امانت یعنی ہزار درہم اُسے لوٹا دے اور اپنے آپ کو لوگوں کے قرضے سے نجات دلائے۔"

میں نے اس شخص کی رقم فراہم کی اور اس کے پاس جا کر اسے پیش کر دی۔ اس نے کہا: "تو یہ رقم واپس کیوں لایا ہے؟ اگر یہ کم ہے تو میں اس میں اضافہ کیے دیتا ہوں۔"

میں نے جواب دیا: "یہ بات نہیں۔ میں حج کی خاطر سفر کرنے کا قصد رکھتا ہوں لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ سفر پہ روانہ ہونے سے پہلے تمھاری امانت لوٹا دوں۔"

پھر میں نے سفر کی تیاری کی اور بیت اللہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد میں مدینہ گیا۔ وہاں ایک دن امام جعفر الصّادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ میں چونکہ نوجوان تھا اس لیے سب سے آخر میں جا بیٹھا۔

لوگ یکے بعد دیگرے اپنے مسائل کے بارے میں امام علیہ السّلام سے دریافت کرتے تھے اور جواب حاصل کر کے چلے جاتے تھے۔ جب سب لوگ چلے گئے تو امامؑ نے مجھ سے پوچھا: "کیا تمھیں کچھ کام ہے؟" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ آپ نے میرے باپ کا حال احوال پوچھا۔ میں نے عرض کیا: "ان کا انتقال ہو گیا ہے۔" آپ نے دریافت فرمایا: کیا وہ کچھ مال تمھارے لیے چھوڑ کر فوت ہوئے؟" میں نے جواب دیا: "نہیں۔"

آپ نے فرمایا: "پھر تم نے اخراجاتِ حج کہاں سے حاصل کیے؟"
اس پر میں نے اپنے باپ کے دوست کا ماجرا کہہ سنایا جس نے مجھے ہزار درہم دیے تھے۔

امام علیہ السلام نے بڑی فکرمندی سے مجھ سے پوچھا: "تم نے اس آدمی کی رقم کا کیا کیا؟"

میں نے عرض کیا: "وہ رقم میں نے اُسے واپس کر دی۔"

آپ نے فرمایا: "شاد باد! تم نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔" پھر فرمایا:

اَلَا اُوْصِیْكَ؟ قُلْتُ بَلٰی جَعَلْتُ فِدَاكَ. قَالَ عَلَیْكَ بِصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَةِ تَشْرِكُ النَّاسَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ....

"کیا میں تمہیں ایک نصیحت نہ کروں؟" میں نے عرض کیا "میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ ضرور کیجیے۔"

آپ نے فرمایا:

"تم پر لازم ہے کہ دورانِ گفتگو سچ بولو اور امانتیں ادا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو لوگوں کے مال میں شریک ہو جاؤ گے۔" [1]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے:

مَنْ خَانَ اَمَانَةً فِی الدُّنْیَا وَلَمْ یَرُدَّهَا اِلٰی اَهْلِهَا ثُمَّ اَدْرَكَهُ الْمَوْتُ مَاتَ عَلٰی غَیْرِ مِلَّتِیْ وَیَلْقَی اللّٰهَ وَهُوَ عَلَیْهِ غَضْبَانُ. [2]

"جو شخص امانت میں خیانت کرے اور اُسے اُس کے مالک کو واپس نہ

---

[1] وافی۔ جلد سوّم۔ صفحہ ۱۱۲
[2] من لایحضرہ الفقیہ۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۹۸

کرے وہ موت کے وقت میری ملّت سے خارج ہوکر دنیا سے جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے غضب کا مورد قرار پائے گا۔"

نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک جگہ فرمایا:

وَمَنِ اشْتَرٰى خِيَانَةً وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهَا خِيَانَةٌ فَهُوَ كَمَنْ خَانَهَا فِىْ عَارِهَا وَاِثْمِهَا، وَمَنِ اشْتَرٰى سِرْقَةً وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهَا سِرْقَةٌ فَهُوَ كَمَنْ سَرَقَهَا فِىْ عَارِهَا وَاِثْمِهَا [1]

"اگر کوئی شخص یہ جانتے ہوئے کہ یہ مال خیانت کے ذریعے ہاتھ آیا ہے اسے خریدے تو خیانت کرنے والے کی ذلّت اور گناہ اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور اگر کوئی شخص یہ علم ہوتے ہوئے کہ ایک مال چوری کا ہے اسے خریدے تو چوری کی ذلّت اور گناہ اس کا دامن بھی پکڑیں گے۔"

خیانت گھر کو تباہ کردیتی ہے

بہت سی روایات میں ان کڑی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے جو خیانت کاروں کو بھگتنی پڑتی ہیں تاکہ مسلمان اس مسئلے پر آنکھیں کھول کر توجہ دیں۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اَرْبَعَةٌ لَاتَدْخُلُ وَاحِدَةٌ مِنْهُنَّ بَيْتًا اِلَّا خَرِبَ وَلَمْ يَعْمُرْ بِالْبَرَكَةِ: اَلْخِيَانَةُ وَالسِّرْقَةُ وَشُرْبُ الْخَمْرِ وَالزِّنَا۔ [2]

"چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی گھر میں پیدا ہوجائے

---

[1] عقاب الاعمال۔ صفحہ ۴۷ [2] خصال الصدوق۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۱۰

تو اسے ویران کر دیتی ہے اور اس گھر سے ترقّی اور برکت اٹھ جاتی ہے۔

اوّل خیانت دوّم چوری سوّم شراب خواری اور چہارم زِنا۔"

پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے:

اَلْاَمَانَۃُ تَجْلِبُ الْغِنیٰ وَالْخِیَانَۃُ تَجْلِبُ الْفَقْرَ[1]

"امانت کی حفاظت اور ادائیگی دولت کے حصول کا موجب ہے اور امانت میں خیانت ناداری لاتی ہے۔"

جو لوگ راستباز اور امین ہوتے ہیں عوام ان پر اعتماد کرتے ہیں اور لوگوں کے اعتماد اور توجّہ کی وجہ سے وہ مشکلاتِ زندگی پر آسانی سے قابو پالیتے ہیں اور اپنے کاروبار کو ترقّی دے سکتے ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ خائن اور بدنیّت ہوتے ہیں ان پر کوئی اعتماد نہیں کرتا معاشرہ انھیں دھتکار دیتا ہے اور وہ بدبختی اور فلاکت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو بدنیّتی کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس حقیقت کو بخوبی سمجھنے کے لیے کہ خیانت اور بدنیّتی کیونکر انسان کو بدبختی سے دوچار کرتی ہے تاریخ کے صفحات بھی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

عضد الدّولہ دیلمی کے زمانے میں امیر لوگوں میں سے ایک جوان جس نے عمر کے کئی سال گناہ، شراب خوری اور عیش وعشرت میں گزارے تھے بیمار پڑ کر بستر سے لگ گیا۔

اس حالت میں جب کہ وہ زندگی سے ناامّید ہو چکا تھا اُس نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اگر وہ شفایاب ہو گیا تو گناہ ترک کر دے گا اور پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اسے شفا بخشی۔ اس نے بھی اپنے عہد کا پاس کیا اور قمار بازی، شراب اور لہو ولعب کے آلات گھر سے دُور پھینکے اور پختہ ارادہ کر لیا کہ بیت اللہ کی زیارت کو جائے گا۔

---

[1] قرب الاسناد۔ صفحہ ۵۵

اس کے پاس تیس ہزار طلائی دینار تھے۔ اس نے یہ رقم شہر کے قاضی کے پاس بطورِ امانت رکھ دی جو کہ اپنی دیانت داری کے لیے مشہور تھا اور خود مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کا سفر لمبا ہو گیا۔ راستے میں اسے کئی حادثات پیش آئے اور بہت سی تکالیف جھیلنی پڑیں۔ ایک عرصے کے بعد وہ تھکا ہارا اور پریشان حال وطن واپس لوٹا۔

اسے جو تکالیف اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں اُن کے باوجود وہ مطمئن تھا کہ اس کے تیس ہزار دینار نقد موجود ہیں اور اس رقم کے ذریعے وہ اپنے حالات درست کرلے گا۔ تاہم جب وہ قاضی سے اپنی رقم وصول کرنے گیا تو قاضی نے کہا کہ میں تجھے نہیں جانتا اور نہ ہی میں نے تجھ سے کوئی رقم لی ہے۔

اس نے بہت منت سماجت کی لیکن بے سود۔ آخر کار قاضی نے اُسے دھمکی دی کہ اگر تم مجھے زیادہ دِق کرو گے تو میں تمھیں پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھجوا دوں گا جہاں تم تمام عمر سڑتے رہو گے۔

وہ شخص نا اُمید اور پریشان ہو کر جنگل کی جانب نکل گیا اور اپنی بدبختی پر آنسو بہانے لگا اور فریاد کرنے لگا۔

عضدالدّولہ کے ایک درباری نے اسے دیکھا تو اس کا احوال پوچھا اور جو کچھ اس پر گزری تھی اس سے آگاہ ہوا۔ اُس نے جا کر یہ تمام قصّہ بادشاہ کے گوش گزار کر دیا۔

عضدالدّولہ نے اس شخص کو چند دن کے لیے اصفہان بھیج دیا پھر اس نے قاضی کو اپنے پاس طلب کیا اور کہا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور دنیا بھی سخت بے اعتبار ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ اچانک میری موت واقع ہو جائے اور سلطنت میرے دشمنوں کے ہاتھ آجائے اور میرے بچے مصیبت اور بدبختی سے دوچار ہو جائیں۔ چونکہ تم ایک دیانتدار شخص ہو اس لیے میں نے یہ پیش بندی کی ہے کہ اپنی دولت کی کچھ مقدار جو دس لاکھ طلائی دینار سے بھی

زیادہ ہے تمھارے پاس بطور امانت رکھ دوں تاکہ تم یہ رقم میرے مرنے کے بعد میرے بچّوں کو دے دو اور انھیں کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر میں ایک تہہ خانہ تعمیر کراؤ تاکہ ایک رات خفیہ طور پر یہ دولت وہاں منتقل کر دی جائے۔

قاضی نے اس کام پر اپنی آمادگی ظاہر کی اور بادشاہ سے رخصت چاہی۔ وہ خوشی سے اپنی کھال میں نہیں سما رہا تھا اور اسی وقت سے اُس نے اپنے دماغ میں دس لاکھ طلائی دینار ہضم کرنے کا منصوبہ تیّار کرنا شروع کر دیا۔

چند روز بعد جب قاضی نے خزانے کی منتقلی کے لیے تہہ خانہ تیّار کر لیا تو بادشاہ نے مظلوم نوجوان کو بُلوا بھیجا اور اس سے کہا:

"قاضی کے پاس جاؤ اور اپنی رقم طلب کرو۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے دھمکی دو کہ میں ابھی عضدالدّولہ کے پاس جا کر تمھاری شکایت کرتا ہوں۔"

جوان نے بادشاہ کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ جب قاضی نے اس کی دھمکی سُنی تو اُسے خیال آیا کہ اگر اس شخص نے واقعی یہ ماجرا عضدالدّولہ کے سامنے بیان کر دیا تو وہ اپنی امانت میرے سپرد نہیں کرے گا لہٰذا اُس نے جوان کی دلجوئی کی اور اس کی پوری رقم جو تانبے کے دو برتنوں میں رکھّی تھی اس کے سپرد کر دی۔ جوان وہ رقم لے کر عضدالدولہ کے پاس آیا اور سارا ماجرا کہہ سُنایا۔

بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پیادے گئے اور قاضی کو ننگے سر اور ننگے پاؤں انتہائی ذلّت اور رسوائی کے ساتھ کشاں کشاں دربار میں لے آئے۔

انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہر چیز ظاہر ہو چکی تھی اور تمام پردے اُٹھ چکے تھے۔ بادشاہ نے کہا:

"لعنت ہو تجھ پر! اب تو بُوڑھا ہو چکا ہے اور موت کی سرحدوں کو چھُو رہا ہے۔ تو قاضی کے بلند رتبے پر فائز ہے اور اس کے باوجود مسلمانوں

کی امانت میں خیانت روا رکھتا ہے۔ اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تُو نے
یہ تمام دولت اور جائداد رشوت اور بے ایمانی سے جمع کی ہے اور یہ سب
کا سب مسلمانوں کا مال ہے۔"

پھر بادشاہ نے اس کی تمام جائداد ضبط کرنے کا حکم دیا اور اسے قاضی کے عہدے سے ہٹا دیا۔ [1]

اس شخص کی زندگی کا یہ واقعہ اور اس کا بُرا انجام جس کے نتیجے میں وہ دولت، رُتبہ، آبرو اور اجتماعی حیثیت غرضیکہ ہر چیز کھو بیٹھا فقط خیانت کی وجہ سے رونما ہوا اور یہ وہی حقیقت ہے جو رسولِ اکرمؐ نے واضح فرمائی ہے کہ:

"امانت کا احترام خوشحالی لاتا ہے اور امانت میں خیانت کا نتیجہ ناداری
اور بدبختی ہوتا ہے۔"

امانت انسانی حقوق میں شامل ہے

شاید بعض لوگوں کا خیال ہو کہ امانت کی ادائیگی کی ذمّے داری اسی وقت عائد ہوتی ہے جب کہ امانت کا مالک مسلمان ہو اور صالح ہو اور اگر یہ صورت نہ ہو تو ان کے لیے خلاف ورزی کرنا جائز ہے۔ تاہم اسلامی احکام کی جانب معمولی سی توجّہ دینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امانت کی ادائیگی ایک ایسا فریضہ ہے جس کی رعایت مسلمان کو ہر شخص کی نسبت کرنی لازم ہے خواہ اس کا تعلّق کسی قوم، مذہب یا نسل سے ہو۔

اسلامی احکامات میں فرائض کا ایک سلسلہ تو ایسا ہے جس پر مسلمانوں کو فقط اپنے مابین عملدر آمد کرنا ہوتا ہے اور دوسرے فرقوں کے بارے میں ان پر کوئی ذمّے داری عائد نہیں ہوتی لیکن تعلیماتِ اسلام کے مطابق فرائض کا ایک اور سلسلہ

---

[1] سیاست نامۂ خواجہ نظام الملک۔ صفحہ ۸۷

بھی ہے جس کی رعایت مسلمانوں کو تمام لوگوں کے بارے میں کرنی پڑتی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ اچھے ہوں یا بُرے، مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ ان فرائض میں امانتوں کی ادائیگی اور ایفائے عہد وغیرہ شامل ہیں۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

ثَلٰثَةٌ لَا بُدَّ مِنْ اَدَائِهِنَّ عَلٰى كُلِّ حَالٍ اَلْاَمَانَةُ اِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ وَالْوَفَاءُ بِالْعَهْدِ اِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ وَبِرُّ الْوَالِدَيْنِ بَرَّيْنِ كَانَا اَوْ فَاجِرَيْنِ [1]

"تین چیزیں ایسی ہیں جن کی ادائیگی کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے اور انھیں ہر حال میں انجام دینا چاہیے۔ اوّل امانت کی ادائیگی خواہ امانت کا مالک نیکوکار ہو یا گنہگار۔ دوّم ایفائے عہد، خواہ جس سے عہد کیا جائے وہ اچھا ہو یا بُرا، سوّم ماں باپ سے نیکی کرنا خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے۔"

رسولِ اکرمؐ کے پہلے جانشین امام علی علیہ السّلام اپنی ایک وصیّت میں کمیل بن زیاد سے یوں ارشاد فرماتے ہیں:

يَا كُمَيْلُ اِعْلَمْ وَافْهَمْ اِنَّا لَا نُرَخِّصُ فِيْ تَرْكِ اَدَاءِ الْاَمَانَاتِ لِاَحَدٍ مِّنَ الْخَلْقِ فَمَنْ رَوٰى عَنِّيْ فِيْ ذٰلِكَ رُخْصَةً فَقَدْ اَبْطَلَ وَاَثِمَ وَجَزَاؤُهُ النَّارُ بِمَا كَذَبَ، اَقْسَمْتُ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) يَقُوْلُ لِيْ قَبْلَ وَفَاتِهٖ بِسَاعَةٍ مِرَارًا ثَلَاثًا يَا اَبَا الْحَسَنِ اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ فِيْمَا قَلَّ

---

[1] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۵۰۵

وَحَبْلَ حَتّٰى فِي الْخَيْطِ وَالْمِخْيَطِ [1]

"اے کمیل! جان لو اور آگاہ رہو کہ ہم کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ امانت کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور اگر کسی نے میری زبانی ایسی اجازت نقل کی ہے تو اس نے جھوٹ بولا ہے اور اپنے جھوٹ کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے قہر کی آگ میں گرفتار ہوگا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رسول اللہؐ نے اپنی وفات سے ایک ساعت پہلے تین بار مجھ سے فرمایا تھا: 'امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کرو خواہ وہ نیکوکار ہوں یا بدکار۔ خواہ امانت بڑی ہو یا چھوٹی حتّٰی کہ اگر وہ ایک سوئی اور دھاگا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کے اس قدر بے قیمت ہونے کے باوجود امانت کی ادائیگی کے فریضے کی رعایت کرو۔'"

ایک شخص نے امام جعفر الصّادقؑ سے عرض کیا کہ آپ کے ایک دوست کے پاس بنی امیّہ کی ایک امانت ہے اور وہ اُس مال میں خیانت کو حلال سمجھتا ہے حضرتؑ نے فرمایا:

اَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَلَوْ کَانُوْا مَجُوْسًا۔ [2]

"امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کرو خواہ وہ مجوسی ہی ہوں۔"

ایک شخص نے امام موسیٰ الکاظم علیہ السّلام سے عرض کیا:

"ایک شخص نے ایک گرانبہا امانت آپ کے ایک دوست کے پاس رکھی ہے۔ امانت کا مالک ایک خبیث، لامذہب، شیطان اور بے حد ناپاک شخص ہے اور امانت رکھنے والا اتنی قدرت رکھتا ہے کہ وہ امانت واپس نہ کرے اور ایسا کرنے میں اُسے کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔"

---

[1] مستدرک الوسائل - جلد دوّم - صفحہ ۵۰۵ [2] وافی - جلد سوّم - صفحہ ۱۱۲

امام علیہ السلام نے فرمایا: اُس سے کہہ دو کہ امانت اس کے مالک کو واپس کردے کیونکہ اس شخص نے اسے امین سمجھا ہے اور اس کی خداشناسی پر بھروسہ کرتے ہوئے امانت اس کے سپرد کی ہے۔" [1]

خیانت بے ایمانی کی علامت ہے

امام موسیٰ الکاظمؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ [2]

"جو شخص امانت ادا کرنے کا پابند نہ ہو وہ ایمان نہیں رکھتا۔"

امام جعفر الصادقؑ فرماتے ہیں:

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى، مَنْ اِذَا حَدَّثَ كَذِبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا ائْتُمِنَ خَانَ [3]

"تین چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں ہوں وہ منافق ہے خواہ وہ نمازی بھی ہو اور روزے بھی رکھتا ہو، جو شخص بات کرتے ہوئے جھوٹ بولے وعدہ خلافی کرے اور امانت میں خیانت روا رکھے۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْخِيَانَةُ رَأْسُ النِّفَاقِ. اَلْخِيَانَةُ دَلِيْلٌ عَلٰى قِلَّةِ الْوَرَعِ وَعَدَمِ الدِّيَانَةِ [4]

"خیانت، نفاق اور دورنگی کا سرچشمہ ہے۔ خیانت بے دینی اور ناپرہیزگاری

---

[1] وافی - جلد سوم - صفحہ ۱۱۲
[2] نوادر راوندی، مستدرک الوسائل
[3] تحف العقول - صفحہ ۳۱۶
[4] غرر الحکم

کی دلیل ہے۔"

امام علی علیہ السلام ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

اِیَّاکَ وَالْخِیَانَۃَ فَاِنَّھَا شَرُّ مَعْصِیَۃٍ وَاَنَّ الْخَائِنَ لَمُعَذَّبٌ بِالنَّارِ عَلٰی خِیَانَتِہٖ [1]

"خیانت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ بدترین گناہوں میں سے ہے اور خائن شخص اپنے خیانت کے جرم میں دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا۔"

اسلام نے مسلمانوں کو خیانت سے حتّٰی کہ خیانت کاروں سے تعلق رکھنے سے بھی منع فرمایا ہے اور ان سے معاملہ بمثل کی بھی اجازت نہیں دی ہے کیونکہ خیانت اور بددیانتی ناپسندیدہ کام ہے اور یہ مناسب نہیں کہ مسلمان سے ناپسندیدہ کام سرزد ہو۔

امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنِ ائْتَمَنَکَ بِاَمَانَۃٍ فَاَدِّھَا اِلَیْہِ وَمَنْ خَانَکَ فَلَا تَخُنْہُ [2]

"جو شخص تمھیں امین سمجھے اور امانت تمھارے سپرد کرے تم اُسے (وہ امانت) صحیح وسالم واپس کردو اور جو شخص تمھاری خیانت کرے اور بے ایمانی کی راہ پر چلے تم اس کے بارے میں خیانت روا نہ رکھو۔"

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے:

لَا تَخُنْ مَنْ خَانَکَ فَتَکُوْنَ مِثْلَہٗ [3]

"جو شخص تمھارے ساتھ خیانت کرے تم اُس سے بھی خیانت نہ کرو کیونکہ اس صورت میں تم بھی اسی کے مانند ہو جاؤ گے۔"

---

[1] غرر الحکم [2] وافی۔ جلد سوّم۔ صفحہ ۱۲۲

[3] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۵۰۵

امانت کی قسمیں

امانت مالی امانتوں پر ہی منحصر نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ جمع کا صیغہ یعنی "امانات"، استعمال کیا گیا ہے۔

علّامہ طبرسی مرحوم کہتے ہیں:

"امانتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی امانتیں جو دینی وظائف مثلاً نماز، روزے وغیرہ سے عبارت ہیں اور دوسری لوگوں کی امانتیں مثلاً ودایع (بیعانہ وغیرہ) قرض، معاملات اور شہادات وغیرہ"۔ [1]

اس بنیاد پر ہم کئی ایک امانتوں سے آگاہ ہوتے ہیں جن کی حفاظت اور ادائیگی کی ذمّے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔

قرآن مجید بھی ایک امانت ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کے سپرد کی ہے تاکہ اس کے احکام کے مطابق عمل کرکے دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کریں اور خود اس پر عمل کرنے کے علاوہ اللہ کے احکام دوسرے لوگوں تک پہنچائیں اور ان کے سامنے اس مقدّس آئین کی خوبیوں کی تشریح کریں۔

اپنی بیویوں اور بچّوں کی قدر کریں جو کہ اللہ کی امانتیں ہیں اور اُن کی رہنمائی سچّائی کے سیدھے راستے کی جانب کریں۔

اپنے دینی بھائیوں کو نصیحت کرنے اور ان کا بھلا چاہنے میں کوتاہی نہ کریں کیونکہ نصیحت کی امانت اللہ تعالیٰ کی عظیم امانتوں میں سے ہے۔

اللہ کے بندوں کے رازوں کی حفاظت کریں اور ان کی آبرو کو خطرے میں نہ ڈالیں کیونکہ لوگوں کے راز ایسی امانت ہیں جن کی خیانت گناہ تصوّر ہوتی ہے۔

---

[1] مجمع البیان۔ جلد ہفتم۔ صفحہ ۹۸

امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَا یَکُوْنُ الْاَمِیْنُ اَمِیْنًا حَتّٰی یُؤْتَمَنَ عَلٰی ثَلَاثَۃٍ فَیُؤَدِّیْھَا : عَلَی الْاَمْوَالِ وَالْاَسْرَارِ وَالْفُرُوْجِ وَاِنْ حَفِظَ اثْنَتَیْنِ وَضَیَّعَ وَاحِدَۃً فَلَیْسَ بِاَمِیْنٍ [1]

"کسی شخص کو اس وقت تک امین نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اُسے تین امانتوں کے بارے میں نہ آزما لیا جائے اور وہ آزمائش میں پورا نہ اُترے۔ اوّل دولت، دوّم بھید، اور سوّم آبرو۔ اگر کوئی شخص دو باتوں میں آزمائش پر پورا اُترے اور ایک میں خیانت کرے تو وہ امین نہیں ہے"

بعض روایات کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے دوستوں کی مجالس کو امانت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ [2]

اور امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ وَلَیْسَ لِاَحَدٍ اَنْ یُحَدِّثَ بِحَدِیْثٍ یَکْتُمُہٗ صَاحِبُہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ ثِقَۃً اَوْ ذِکْرًا لَّہٗ بِخَیْرٍ [3]

"مجالس امانت ہیں اور کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ ایسی بات کو ظاہر کرے جسے ظاہر کرنے پر اس راز کا مالک راضی نہ ہو سوائے ان صورتوں کے کہ وہ خود اجازت دے یا سننے والا اعتماد اور وثوق کے قابل ہو یا وہ بات اُس کی اچھائی کا ذکر ہو"

طلبہ، معلّمین کے ہاتھوں میں امانت ہیں۔ جو اساتذہ امانت داری کی ذمّے داری

---

[1] تحف العقول۔ صفحہ ۳۱۶ [2]، [3] الکافی۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۴۹

قبول کرتے ہیں وہ پوری لگن اور دلچسپی سے شاگردوں کو تعلیم و تربیت دیتے ہیں اور ان کے اخلاق اور اعتقادات سنوارتے ہیں اور انھیں صالح اور مفید افراد بنا کر معاشرے کے سپرد کر دیتے ہیں۔

کارخانے اور فیکٹریاں بھی امانتیں ہیں جو مینجروں، انجینئروں اور متصدیوں کے اختیار میں ہیں۔ انھیں چاہیے کہ امانت داری کا فریضہ ادا کرتے ہوئے ان کی نگہداشت کریں اور ان سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں۔

انتظامی اور دوسرے مشاغل اور عہدے بھی امانتیں ہیں اور جو لوگ یہ ذمّے داریاں سنبھالیں انھیں چاہیے کہ جو فرائض اللہ اور مخلوق کی جانب سے ان پر عائد ہوتے ہیں انھیں پوری صداقت اور امانت سے انجام دیں۔

ایک ڈرائیور جو ٹیکسی چلاتا ہے۔ ایک کاریگر جو ایک مشین پر یا کسی صنعت میں کام کرتا ہے۔ ایک موٹر کی مرمّت جس میکینک کے سپُرد ہے یہ سب کے سب امانتدار ہیں اور ان چیزوں کی حفاظت اور نگہداشت کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہیں۔

اسلامی ممالک کے سرمائے خواہ وہ عمومی دولت ہوں یا خصوصی، سب امانتیں ہیں۔ یہ امانتیں جن لوگوں کے اختیار میں ہوں ان پر ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ ان کی حفاظت اور ادائیگی کی کوشش کریں۔

بحث کے خاتمے پر اس مسئلے کے فقہی پہلو پر بھی فہرست وار توجّہ فرمائیے:

امانتوں کا قبول کرنا مستحب ہے لیکن اگر قبول کر لی جائیں تو ان کی حفاظت واجب ہے۔[۱]

صرف وہی شخص لوگوں کی امانت قبول کرنے کا حق رکھتا ہے جو اس کی حفاظت اور نگہداشت کی قدرت رکھتا ہو۔

---

[۱] جامع عباسی۔ صفحہ ۲۳۴

امانت قبول کرنے والے کو چاہیئے کہ امانت کی حفاظت کے لیے جن حالات اور وسائل کی عموماً ضرورت پڑتی ہے وہ فراہم کرے۔

اگر امانت کا مالک اس کے لیے کوئی جگہ متعین کرے تو امانت دار اس امانت کو دوسری جگہ منتقل نہیں کر سکتا۔

اگر امانت دار نے امانت کی نگہداشت میں کوئی تقصیر یا کوتاہی نہ کی ہو تو پھر اگر وہ امانت تلف ہو جائے تو امانت دار ذمّے دار نہیں ہے۔

اگر چور یا ظالم سے امانت کی حفاظت جھوٹ بولنے یا جھوٹی قسم کھانے پر منحصر ہو تو ایسا کرنا جائز بلکہ واجب ہے اور اگر امانت دار ایسا نہ کرے اور امانت تلف ہو جائے تو وہ ذمّہ دار ہے۔

جب امانت کا مالک اس کا مطالبہ کرے تو امانت اسے لوٹا دینا واجب ہے خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

اگر امانت دار کو یہ خوف ہو کہ امانت اس کے پاس رہی تو تلف ہو جائے گی تو اسے چاہیئے کہ اُسے اُس کے مالک یا اُس کے نمائندے کو لوٹا دے۔[1]

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ امانتوں کی حفاظت اور ادائیگی کی اہمیّت کے بارے میں اسلام کے تاکیدی احکامات کا ایک نمونہ تھا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس بحث کی تیاری کے دوران ہم نے مغربی دانشوروں کی تربیّت اور اخلاق پر تحریر کردہ بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے امانتوں کی ادائیگی کے مسئلے کی تمام تر اہمیّت کے باوجود اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا۔ لہٰذا کافی کاوش کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مسئلہ بھی بہت سے دوسرے اہم مسائلِ زندگی

---

[1] وسیلۃ النجاۃ۔ آیت اللہ اصفہانی۔ کتاب الودیعۃ

کی مانند اسلام کی خصوصیات میں سے ہے جس نے چودہ سو سال قبل بڑے دل نشین اور سبق آموز پیرائے میں اس کے تمام پہلوؤں پر توجّہ دیتے ہوئے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

امّید ہے کہ مسلمان بالعموم اس اہم فریضے اور اس کے دقیق اجزاء کی جانب توجّہ دیتے ہوئے اقوامِ عالم میں ایک قابلِ اعتماد، امین اور سربلند قوم کی حیثیّت سے اُبھریں گے اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی عنایات سے بہرہ مند ہوں گے۔

اِسلام میں اخلاق

جس طرح انسان ایک ظاہر رکھتا ہے جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور اسے صورت کہتے ہیں اسی طرح وہ ایک باطن رکھتا ہے جسے سیرت کہا جاتا ہے اور جس طرح اس کا ظاہر اور صورت اچھّی یا بُری ہو سکتی ہے اسی طرح ممکن ہے کہ اس کا باطن اور سیرت بھی بُری ہو یا اچھّی ہو۔

انسان کے ظاہر کی تشکیل اس کے اعضائے بدن مثلاً سر، چہرے، ہاتھوں، پاؤں، آنکھوں اور کانوں وغیرہ سے اور باطن کی، مزاج، عادات اور خصائل سے ہوتی ہے۔ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں متناسب، اعضاء ہم آہنگ اور چہرہ و بدن خوشنما ہوں تو وہ اچھّی صورت کا مالک ہوتا ہے اور اگر اس کے بدن میں تناسب اور ہم آہنگی نہ ہو اور اعضا غیر معمولی اور بدنما ہوں تو وہ بدشکل ہوتا ہے۔

انسان کی سیرت میں بھی اگر پسندیدہ عادات اور انسانی خصائل مثلاً پیار اور محبّت، خلوص اور وفا، پاکیزگی اور فضیلت، کریم النفسی، انکسار اور تواضع وغیرہ موجود ہوں تو وہ اچھّی سیرت رکھتا ہے اور اگر اس کی سیرت میں قساوت، کینہ پروری، خود غرضی،

جاہ پرستی، ظلم اور سرکشی وغیرہ شامل ہوں تو وہ بُری سیرت کا مالک ہوگا۔

پسندیدہ عادات وخصائل کو " اچھّے اخلاق " اور ناپسندیدہ خصائل کو " بُرے اخلاق " کہا جاتا ہے۔

حُسنِ خُلق کے ایک اور معنی یہ ہیں کہ انسان کا چہرہ کِھلا ہوا ہو، لوگوں سے اچھّا سلوک کرے، میل جول میں نرمی اور ملائمت برتے اور اس کے یہی معنی اِس بحث کی اساس ہیں۔

اکثر صورتوں میں اچھّے اور بُرے اخلاق اکتسابی پہلو رکھتے ہیں اور یہی اچھّی اور بُری عادتیں ہیں جو انسان میں ظاہر ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ خُلق اور خُو کی صورت اختیار کرلیتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انسان تھوڑی سی توجّہ اور احتیاط سے ان میں تبدیلی کرسکتا ہے اور اپنے اخلاق میں انقلاب لاسکتا ہے۔

عقل اور شرع اچھّے اخلاق کے حامل شخص کی تعریف کرتی ہیں اور بداخلاق شخص کی مذمّت کرتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں ان اخلاق وعادات کو بدلنے پر قادر ہیں۔ اگر انسان کا ارادہ بے اثر ہوتا اور وہ انھیں بدلنے پر قادر نہ ہوتا تو تعریف اور تنقید کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ انسان اپنے ارادے کے بل بُوتے پر اچھّے یا بُرے اخلاق کا مالک بن جاتا ہے ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ ہر چیز سے پہلے اپنی اخلاقی وضع کو درست کرنے کا اہتمام کرے اور مسلسل کوشش اور توجّہ سے ناپسندیدہ عادات کو ترک کرے اور اپنے اندر اچھّی اور پسندیدہ خصائل پیدا کرے۔

جو طریقے اخلاق کی اصلاح میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اچھے اخلاق کی غیر معمولی قدر وقیمت اور ان کے حامل کی قدر ومنزلت پر اور اسی طرح بُرے اخلاق اور ان کے حامل کی پستی اور خرابی کی جانب توجّہ دی جائے۔

اسلام کے عالی قدر پیشواؤں کے ارشادات بہترین رہنما ہیں جو ان مسائل میں ہماری ہدایت اور رہبری کر سکتے ہیں اور ہماری دنیا اور آخرت کی زندگی میں اخلاق کے اثرات کو بیان کر سکتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی ایک حدیث میں اچھے اخلاق کی اہمیت یوں بیان کی گئی ہے:

لَوْ یَعْلَمُ الْعَبْدُ مَا لَهُ فِی حُسْنِ الْخُلُقِ لَعَلِمَ اَنَّهُ یَحْتَاجُ اَنْ یَکُوْنَ لَهُ حُسْنُ الْخُلُقِ۔ [1]

"اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حُسنِ خُلق ان کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتا ہے اور ان کی خوش نصیبی پر کتنا عمدہ اثر ڈالتا ہے تو وہ اچھے اخلاق رکھنے کی احتیاج محسوس کرتے۔"

بعض لوگ اچھے اخلاق کے مفید نتائج سے غفلت برتتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ بالخصوص وہ لوگ جو دولت، علم یا رتبے وغیرہ کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں، اچھے اخلاق کو ایک فضول اور بے فائدہ چیز تصوّر کرتے ہیں حالانکہ مذکورہ اوصاف میں سے کوئی بھی اخلاق کی خالی جگہ پُر نہیں کر سکتا اور جو شخص اچھے اخلاق سے بے بہرہ ہو وہ حقیقی انسانیّت سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث کے مطابق اگر ایک شخص دولت، علم اور رُتبہ نہ رکھتا ہو لیکن اس کے اخلاق اچھے ہوں تو وہ اُن لوگوں سے بدرجہا بہتر ہے جو ہر چیز رکھتے ہوں لیکن اخلاق نہ رکھتے ہوں کیونکہ اچھا اخلاق تمام دوسری صفات کے حصول کی جانب اس کی رہنمائی اور مدد کرتا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اِنَّ حُسْنَ الْخُلُقِ ذَهَبَ بِخَیْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ [2]

---

[1] بحارالانوار۔ جلد ۷، صفحہ ۳۷۹

[2] جامع السعادات۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۷۳

"بلاشبہ اچھے اخلاق کا مالک دُنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے والا ہے"

زندگی میں آسائش، اللہ تعالیٰ کی اُن بہترین نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو حُسنِ خُلق کی بدولت ہاتھ آتی ہے اور بداخلاق لوگ خود اپنے اطوار سے اپنے آپ کو اس عظیم نعمت سے محروم کر لیتے ہیں۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

لَا عَيْشَ اَهْنَا مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ [1]

"کوئی زندگی حُسنِ خُلق سے زیادہ مرغوب اور لذّت بخش نہیں ہے"

اور آپ ہی کا ایک اور قول یہ ہے:

مَنْ سَآءَ خُلُقُهُ عَذَّبَ نَفْسَهُ [2]

"جس شخص کا اخلاق خراب ہو وہ اپنے آپ کو عذاب اور مصیبت میں مبتلا کر لیتا ہے"

امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

حُسْنُ الْخُلُقِ خَيْرُ رَفِيْقٍ [3]

"انسان کی زندگی میں اچھے اخلاق اس کے بہترین دوست اور رفیق ہیں"

لوگ خوش اخلاق افراد کی ہم نشینی اور ان سے میل جول رکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور حُسنِ خُلق میں ایک قوی کشش ہے جو دوسروں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

بہترین اخلاق رسولِ اکرمؐ کا تھا اور اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں آپ کے اخلاق کی بڑے واضح الفاظ میں تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ:

"(اے رسولِ گرامی!) بلاشبہ آپ عظیم خُلق کے مالک ہیں" [4]

---

[1] علل الشرایع ۔ جلد دوّم ۔ صفحہ ۲۴۶
[2] جامع السعادات ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ ۲۷۱
[3] بحارالانوار ۔ جلد ۷۷ ۔ صفحہ ۳۹۶
[4] سورۃ القلم ۔ آیت ۴

ایک اور آیت میں لوگوں کے آنحضرتؐ کی جانب مائل ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے اور اسے آپ کے اچھے اخلاق اور مہربانی اور حُسنِ سلوک کا نتیجہ بتایا گیا ہے :

"اللہ کی عنایات کی بدولت آپ، لوگوں کے ساتھ مہربان اور ملائم ہو گئے اور اگر آپ بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے اِرد گِرد سے پراگندہ ہو گئے ہوتے۔" [1]

عامّۃ النّاس حتیٰ کہ بت پرستوں اور مشرکین کے ساتھ بھی رسولِ اکرمؐ کا سلوک سراپا مہربانی، اخلاق اور انسانیّت پر مبنی تھا۔

محدّثین نے آنحضرتؐ کے اخلاق کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے:

"پیغمبرِ اسلامؐ لوگوں سے محبت کرتے تھے اور کسی کو اپنے پاس سے دُور نہیں ہٹاتے تھے۔ ہر قوم کے بزرگوں کو قابلِ احترام گردانتے تھے۔ اگر کوئی شخص آپ سے کسی چیز کے لیے درخواست کرتا تو آپ اس کی ضرورت پُوری کر دیتے اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہوتا تو پوری محبت سے اس کی تسلّی فرما دیتے تھے سب لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اگر کسی سے خفا ہوتے تو فقط اللہ کی خاطر خفا ہوتے تھے اور خود اپنی ذات کی خاطر کبھی خشمگیں نہیں ہوتے تھے۔ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ تُند خُو اور سخت گیر نہ تھے۔ گالی یا بدکلامی کبھی بھی آپ کی زبان پر نہیں آئی۔ آپ کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔"

انس بن مالک کہتے ہیں :

"میں دس سال رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں رہا اور آپ نے کبھی مجھ پر سختی نہیں کی۔ اگر میں کوئی کام کرتا تو آپ یہ نہ فرماتے کہ کیوں کیا اور اگر کوئی کام نہ کرتا تو یہ نہ کہتے کہ کیوں نہیں کیا۔ کئی دفعہ آپ تھوڑے سے دُودھ یا پانی میں تر کی ہوئی

---

[1] سورۃ آلِ عمران۔ آیت ۱۵۹

روٹی سے روزہ افطار کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک رات حضورؐ معمول سے زیادہ دیر سے گھر تشریف لائے۔ میں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپ کہیں دعوت میں تشریف لے گئے ہیں، دودھ پی لیا۔ کچھ دیر بعد آپ تشریف لے آئے۔ میں نے ان لوگوں سے جو آپ کے ہمراہ تھے دریافت کیا کہ آیا آپؐ نے روزہ افطار کرلیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ میں بہت غمگین ہوا اور اس بات سے بھی ڈرا کہ مُبادا آپ اپنی غذا طلب فرمائیں۔ تاہم صبح کی اذان تک آپ نے اس بارے میں کوئی بات نہ کی اور اس دن کا روزہ بھی رکھ لیا۔"

اپنے اصحاب سے رسولِ اکرمؐ کا طرزِ عمل دوستانہ تھا۔ بیٹھ کر ان سے گفتگو فرماتے تھے۔ ان کے بچّوں سے پیار کرتے تھے اور انھیں اپنے گھٹنوں پر بٹھاتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے۔ لباس اور خوراک کے معاملے میں خود اپنے اور اپنے غلاموں اور کنیزوں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے۔

اگر آپ سوار ہوتے تو یہ گوارا نہ فرماتے کہ کوئی دوسرا آپ کے ہمراہ پیدل چلے۔ یا تو اسے بھی اپنے ساتھ سوار کرلیتے اور یا کہتے کہ تم جاؤ اور اب ہماری ملاقات فلاں مقام پر ہوگی۔

اہلِ مدینہ میں سے ایک شخص نے حضورؐ کو اور آپ کے پانچ صحابہ کو کھانے پر مدعو کیا۔ جب آپ اور صحابۂ کرام اس شخص کے گھر تشریف لے جارہے تھے تو ایک اور شخص انھیں راستے میں ملا اور ان کے ساتھ ہولیا۔ جب میزبان کے گھر کے قریب پہنچے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا:

"صاحبِ خانہ نے تمھیں دعوت نہیں دی۔ تم یہیں ٹھہرو تاکہ میں صاحبِ خانہ سے تمھارے رُتبے اور حیثیّت کے بارے میں بات کرکے اُس سے

تمھارے لیے اجازت طلب کرلوں۔"

اگر آپ کسی سے مصافحہ کرتے تو اس وقت تک اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے جب تک وہ خود آپ کا ہاتھ نہ چھوڑ دیتا۔ اگر کوئی آپ کے قریب بیٹھا ہوتا تو اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ اُٹھتے جب تک وہ شخص خود کھڑا نہ ہو جاتا۔ کسی کے سامنے اپنے پاؤں ہرگز نہ پھیلاتے سب کو سلام کہتے۔ اگر کوئی شخص آپ سے ملنے آتا تو اس کا احترام کرتے اور بعض اوقات اپنی عبا اس کے پاؤں کے نیچے بچھا دیتے۔ صحابہ کو ان سے تعلق کی نسبت سے پکارتے۔[1]

آنحضرتؐ کے اِنہی اخلاقِ کریمہ کے زیرِ اثر بہت سے مشرکین حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اسلام سے بچنے کے لیے عدی بن حاتم طائی شام کی طرف بھاگ گیا اور اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اس کی بہن نے جو ایک سمجھ دار عورت تھی اُسے مدینے جانے اور رسولِ اکرمؐ سے ملاقات کرنے کی ترغیب دی۔

عدی کہتا ہے:

"جب میں مدینے پہنچا تو مسجد میں گیا اور آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دی۔ جب آپ نے مجھے پہچانا تو اُٹھے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے ہم جا رہے تھے تو ایک بوڑھی اور کمزور عورت سامنے آگئی اور اس نے اپنے مطالب آپ سے بیان کرنے شروع کیے۔ آنحضرتؐ کافی دیر تک کھڑے ہو کر اس عورت کی باتیں سنتے رہے اور بڑی مہربانی سے اسے جواب دیتے رہے۔ میں نے دل میں سوچا: اللہ کی قسم! اس شخص کے طور طریقے ایک دنیادار حاکم جیسے نہیں ہیں۔ جب ہم آپ کے گھر پہنچے تو وہاں کھجور کے ریشے کی ایک توشک تھی جو آپ نے بچھا دی اور فرمایا کہ اس پر بیٹھو۔

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۱۵

میں نے کہا کہ آپ بیٹھیں لیکن آپ نے یہ بات قبول نہ کی اور مجھے اس توشک پر بٹھا کر خود زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے دل میں سوچا: اللہ کی قسم! انھیں ایک سلطان تو نہیں کہا جا سکتا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو آپ نے گفتگو شروع کی اور میری زندگی کے ایسے اسرار مجھے بتائے جو کسی کے علم میں نہ تھے۔ ان تمام باتوں سے میں سمجھ گیا کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔" [1]

جس مسجد میں رسولِ اکرمؐ نماز پڑھتے تھے اس میں ایک بیکس بڑھیا جھاڑو دیتی تھی۔ یہ بڑھیا عموماً مسجد کے احاطے کے ایک کونے میں سو جایا کرتی تھی اور جو لوگ باجماعت نماز پڑھنے آتے تھے وہ اس کے کھانے پینے کا انتظام کر دیتے تھے۔

ایک دن رسولِ اکرمؐ مسجد میں تشریف لائے اور جب جھاڑو دینے والی عورت کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی؟

لوگوں نے جواب دیا کہ وہ عورت پچھلی رات فوت ہو گئی تھی اور اسے دفن کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس عورت کی اتنی اہمیّت ہے کہ اس کی موت کی خبر رسولِ اکرمؐ کو دی جائے۔

آنحضرتؐ کو یہ سُن کر دُکھ ہوا اور آپ نے لوگوں کو سرزنش کی۔ پھر آپ نے خواہش ظاہر کی کہ آپ کو اس عورت کی قبر تک لے جایا جائے چنانچہ آپ سب کے ساتھ وہاں پہنچے اور قبر کے سامنے کھڑے ہو کر اس عورت کی بخشش کے لیے نماز میّت پڑھی۔ [2]

رسولِ اکرمؐ کی تمام تر زندگی میں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ آپ کسی شخص سے ترش روئی سے پیش آئے ہوں یا کوئی نازیبا بات کہی ہو یا کسی کی تحقیر یا اہانت کی ہو۔

بلاشبہ ایسا سلوک لوگوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے کیونکہ ہر انسان فطرتاً خوش اخلاق

---

[1] سیرۃ ابن الہشام۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۵۸۰ [2] داستانہائے از زندگی پیغمبر ما۔ صفحہ ۱۲۱

اشخاص سے اُنس رکھتا ہے۔

لقمان حکیم نے کہا ہے:

"اچھی خو والا شخص غیروں کے لیے 'اپنا' ہوتا ہے اور بدخو شخص خود اپنے لیے 'غیر' ہوتا ہے۔"[1]

اسلام کی نظر میں اخلاق کے مسئلے کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنی بعثت کی وجہ اخلاقی اصولوں کو کمال تک پہنچانا قرار دی ہے اور فرمایا ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ[2]

"میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے مکارمِ اخلاق کے اتمام اور تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔"

اس آسمانی ماموریّت کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے آنحضرتؐ قولاً اور فعلاً معاشرے کے اخلاق سنوارنے میں مصروف ہو گئے اور اپنے فرائض انتھک کوششوں سے انجام دیے۔

رسولِ اکرمؐ کی بعثت سے پہلے معاشرے کے اخلاق اس قدر فاسد ہو چکے تھے کہ ان کا انسانی رنگ مکمّل طور پر زائل ہو گیا تھا اور لوگوں نے درندوں کے طور طریقے اور عادتیں اپنا لی تھیں۔

آنحضرتؐ کے اُسوۂ حسنہ ایک عملی مثال اور آپ کے ارشادات اخلاق کا اعلیٰ درس ہیں۔ مسلمانوں کو بھی قرآنِ مجید کے صریح حکم:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ....[3]

کے ذریعے پابند کیا گیا کہ آنحضرتؐ کی تقلید کریں اور زندگی کے تمام شعبوں میں آپ

---

[1] امثال و حکم دھخدا - جلد دوّم [2] سفینۃ البحار - خلق، صفحہ ۴۱۰

[3] سورۃ الاحزاب - آیت ۲۱

کے طور طریقوں کو اپنے لیے نمونہ قرار دیں۔ نتیجتاً اسلام کا اخلاقی مکتب ایسے ممتاز معلّم اور ایسے تربیت یافتہ شاگردوں کی بدولت اس قابل ہوا کہ لوگوں کے اخلاقی ڈھانچے میں ایک عظیم اور حیرت انگیز انقلاب برپا کر دے۔

اسلامی روایات میں مختلف عبارات اور بیانات کے ذریعے حُسنِ خُلق کو دنیا اور آخرت میں خوش بختی کے حصُول کا موجب اور بُرے اخلاق کو مختلف بدبختیوں میں مُبتلا ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

قِیلَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ (ص): اِنَّ فُلَانَۃَ تَصُوْمُ النَّہَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ وَھِیَ سَیِّئَۃُ الْخُلُقِ تُؤْذِیْ جِیْرَانَہَا بِلِسَانِہَا، فَقَالَ: لَاخَیْرَ فِیْہَا، ھِیَ مِنْ اَھْلِ النَّارِ[1]

"کسی نے رسولِ اکرمؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ! فلاں عورت دن میں روزہ رکھتی ہے اور راتیں عبادت اور تہجّد میں گزارتی ہے لیکن بداخلاق ہے اور اپنے ہمسایوں کو اپنی زبان سے دُکھ دیتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اُس میں کوئی خیر نہیں اور وہ دوزخیوں میں سے ہے۔"

اِس حدیث میں رسولِ اکرمؐ نے ایک ایسے شخص کے لیے جو بداخلاق اور بدزبان ہو اور لوگوں کو دُکھ پہنچاتا ہو تو اس کے روزے اور رات کو جاگ کر تہجّد پڑھنے جیسی عظیم عبادات کو بھی بے سود ہی قرار نہیں دیا ہے بلکہ اُسے عذابِ نار کا مستوجب گردانا ہے۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَمْلِکْ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ وَلَمْ یُحْسِنْ صُحْبَۃَ مَنْ صَاحَبَہٗ وَمُرَافَقَۃَ مَنْ رَافَقَہٗ[2]

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۷۷۔ صفحہ ۳۹۴

[2] امام الصّادق والمذاہب الاربعہ۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۳۵۰

"جو شخص غصّے کے عالم میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے اور اپنے ہم جلیسوں اور دوستوں سے خوش اخلاقی کا برتاؤ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"

نبئ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں:

عَلَيْكُمْ بِحُسْنِ الْخُلُقِ فَاِنَّ حُسْنَ الْخُلُقِ فِي الْجَنَّةِ لَامُحَالَةَ وَ اِيَّاكُمْ وَسُوْءَ الْخُلُقِ فَاِنَّ سُوْءَ الْخُلُقِ فِي النَّارِ لَامُحَالَةَ [1]

"خوش خُلق رہو کیونکہ اس کا انجام لامحالہ بہشت ہے اور بد خُلقی سے پرہیز کرو کیونکہ بد خُلقی کا مقام لامحالہ جہنّم ہے"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

صَنَائِعُ الْمَعْرُوْفِ وَحُسْنُ الْبِشْرِ يَكْسِبَانِ الْمَحَبَّةَ وَيُدْخِلَانِ الْجَنَّةَ وَالْبُخْلُ وَعَبُوْسُ الْوَجْهِ يُبْعِدَانِ مِنَ اللّٰهِ وَيُدْخِلَانِ النَّارَ [2]

"اچھے کام کرنا اور چہرہ کھِلا رکھنا (حُسنِ خُلق) محبّت کے حصول اور بہشت میں پہنچنے کا موجب ہے اور بُخل اور تُرش روئی انسان کو اللہ سے دُور کرتی ہے اور جہنّم میں ڈالتی ہے"

چند مُشرک جو رسولِ اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کو قتل کرنے کی نیّت سے مدینے کی جانب آئے تھے گرفتار ہو گئے۔ جب ان کا جُرم ثابت ہو گیا اور وہ توبہ کرنے پر تیّار نہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک شخص کو آزاد کر دیا جائے اور باقی کو قتل کر دیا جائے۔

آزاد کیے جانے والے شخص نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ یا محمد! کیا وجہ ہے کہ

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۲۲۱ [2] جامع السّعادات۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۷۳

آپ نے میرے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور مجھے آزاد کر دیا؟

حضورؐ نے فرمایا:

"ابھی ابھی جبرئیلؑ اللہ کی جانب سے ہم پر نازل ہوئے ہیں اور ہمیں خبر دی ہے کہ تمھاری پانچ خصلتیں ایسی ہیں جنھیں اللہ اور رسولؐ پسند کرتے ہیں اوّل یہ کہ تم اپنے ناموس اور گھر کے بارے میں بے حد غیور رہو۔ دوّم یہ کہ تم سخی ہو، سوّم یہ کہ تم راستگو ہو، چہارم یہ کہ تم شجاع ہو اور پنجم یہ کہ تم حسنِ خُلق کے مالک ہو۔"

وہ شخص جو اپنے بارے میں سب سے زیادہ جانتا تھا آنحضرتؐ کے ارشاد کی صداقت کا قائل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے آنحضرتؐ کی رسالت کی تصدیق کی اور اسلام قبول کر لیا اور اسلام کی ترقی کی راہ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ [1]

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں:

إِنَّ أَحَبَّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبَكُمْ مِنِّي يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَجْلِسًا أَحْسَنُكُمْ خُلُقًا وَأَشَدُّكُمْ تَوَاضُعًا۔ [2]

"وہ شخص جس کا اخلاق زیادہ اچھا اور تواضع زیادہ ہو وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے اور قیامت کے دن بھی مجھ سے نزدیک تر ہوگا۔"

اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

أَكْثَرُ مَا تَلِجُ بِهِ أُمَّتِي الْجَنَّةَ، تَقْوَى اللهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ [3]

"سب سے بڑی دستاویز جو میرے پیروؤں کو بہشت اور ابدی سعادت

---

[1] امالی الصدوق۔ صفحہ ۱۶۳ [2] قرب الاسناد۔ صفحہ ۲۲

[3] کافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۰۰

کی جانب کھینچتی ہے وہ تقویٰ اور حُسنِ خلق ہے۔"

حُسنِ خُلق ایک گرانبہا سرمایہ ہے جو دوسرے ہر سرمائے سے برتر ہے۔ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو انسان کی مادّی زندگی میں بھی بڑے مفید نتائج برآمد کرسکتا ہے۔

امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

فِیْ سَعَةِ الْاَخْلَاقِ کُنُوْزُ الْاَرْزَاقِ [1]

"خوش خوئی اور کشادہ روئی میں رزق اور روزی کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

کَفٰی بِالْقَنَاعَةِ مُلْکًا وَ بِحُسْنِ الْخُلُقِ نَعِیْمًا [2]

"ملکِ قناعت کی فرمانروائی اور حُسنِ اخلاق کا لازوال سرمایہ انسان کے لیے کافی ہے۔"

لقمان حکیم اپنے بیٹے کو اس سرمائے کی حفاظت کی وصیّت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یَا بُنَیَّ اِنْ عَدِمْتَ مَا تَصِلُ بِهٖ قَرَابَتَكَ وَتَتَفَضَّلُ بِهٖ عَلٰی اِخْوَانِكَ فَلَا یَعْدِمْ مِنْكَ حُسْنُ الْخُلُقِ وَبَسْطُ الْبِشْرِ فَاِنَّ مَنْ اَحْسَنَ خُلُقَهٗ اَحَبَّهُ الْاَخْیَارُ وَجَانَبَهُ الْکُفَّارُ [3]

"اے فرزندِ عزیز! اگر تو وہ مادّی سرمائے گنوا بیٹھے جن کے ذریعے تو اپنے اقربا اور دوستوں پر احسان کرسکتا ہے تب بھی حُسنِ خُلق اور خوش روئی کا سرمایہ ہاتھ سے نہ دے کیونکہ جو شخص حُسنِ خُلق کا سرمایہ رکھتا ہو تو اچھے

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۱۱ [2] نہج البلاغہ۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۹۵

[3] سفینۃ البحار۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۱۰

لوگ اُسے عزیز رکھتے ہیں اور بُرے اس کی طرفداری کرتے ہیں۔"

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں:

اِنَّكُمْ لَنْ تَسَعُوا النَّاسَ بِاَمْوَالِكُمْ فَسَعُوْهُمْ بِاَخْلَاقِكُمْ [1]

"تم ہرگز اتنا سرمایہ اور دولت نہیں رکھتے کہ لوگوں کو ناداری اور زندگی کی سختیوں سے نجات دلاسکو لہٰذا اپنے آپ کو اخلاق کے سرمائے سے آراستہ کرو اور اچھے اخلاق اور کشادہ چہرے کے ذریعے دوسروں کے دلوں سے غم کا بوجھ ہٹادو۔"

اسلام حُسنِ خُلق کو ایمان کی شرائط اور عظیم عبادات میں شمار کرتا ہے جن کا حامل اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر کا سزاوار ہوگا۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

اَفْضَلُ النَّاسِ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا [2]

"جس شخص کا اخلاق بہتر ہو اس کا ایمان زیادہ قیمتی ہے۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا:

اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَمُلَ اِيْمَانُهُ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَرْنِهِ اِلٰى قَدَمِهِ ذُنُوْبٌ لَمْ يَنْقُصْهُ ذٰلِكَ، قَالَ وَهُوَ الصِّدْقُ وَاَدَاءُ الْاَمَانَةِ وَالْحَيَاءُ وَحُسْنُ الْخُلُقِ [3]

"چار خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی شخص میں موجود ہوں تو اس کا ایمان کامل ہے خواہ وہ سرتاپا گنہگار ہو اور وہ یہ ہیں: سچ بولنا، امانت ادا کرنا، حیا اور حُسنِ خُلق۔"

---

[1] امالی الصّدوق۔ صفحہ ۹ [2] امالی الصّدوق۔ صفحہ ۱۲۶

[3] الکافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۹۹

علّامہ مجلسی (قدس سرہٗ) مندرجہ بالا روایت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"امام علیہ السلام کا یہ قول کہ "خواہ وہ سرتاپا گنہگار ہو" متعلقہ شخص کے گناہوں کی کثرت میں مبالغہ ہے اور ممکن ہے کہ انہیں صغیرہ گناہوں پر محمول سمجھا جائے کیونکہ جو شخص مذکورہ چار عالی صفات رکھتا ہو وہ قطعاً کبیرہ گناہوں پر اصرار نہیں کر سکتا اور یہ چار صفات ہی بہت سے گناہوں کی پیش بندی کرتی ہیں۔ مثلاً سچ بولنا جھوٹ بولنے سے مانع ہے۔ امانتوں کی ادائیگی لوگوں کے مال اور اللہ کے حقوق میں خیانت سے مانع ہے۔ لوگوں سے حیا گناہوں کے مظاہرے اور اللہ تعالیٰ سے حیا کبیرہ گناہوں کا ارادہ کرنے سے مانع ہے اور حسنِ خُلق لوگوں کو دُکھ دینے اور والدین سے بدسلوکی کرنے اور قطع رحمی اور ایسی ہی دوسری چیزوں سے مانع ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذکورہ چار صفات کا حامل ہو تو وہ خود بخود بہت سے گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور انہی صفات کی خاطر اللہ تعالیٰ اسے توبہ اور گناہوں کی تلافی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور ایسے شخص کی عاقبت بخیر ہوگی اور وہ خوش بختی سے بہرہ ور ہوگا۔" [1]

امام جعفر الصّادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ حُسْنَ الْخُلُقِ يَبْلُغُ بِصَاحِبِهٖ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ [2]

"جو شخص حُسنِ خُلق کا مالک ہو یہ صفت اُسے اُن لوگوں کے رُتبے پر پہنچا دیتی ہے جو دن کو روزہ رکھتے ہیں اور تمام رات بیدار رہ کر عبادت کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور اُسے انہی لوگوں جیسا اجر فراہم کرتی ہے۔"

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۷۷۔ صفحہ ۳۷۴

[2] الکافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۰۳

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا :

مَا یُوضَعُ فِیْ مِیْزَانِ امْرِءٍ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَفْضَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ [1]

"قیامت کے دن اعمال کی تشخیص کے وقت لوگوں کے لیے حُسنِ خُلق سے زیادہ پُرفضیلت اور کوئی چیز نہ ہوگی۔"

اسلام کے جلیل القدر رہنماؤں نے حُسنِ خُلق اور دُنیا اور آخرت کی سعادت کے لیے اس کے نیک اثرات کے بارے میں جو وصیّتیں لوگوں کو فرمائی ہیں ان کے پہلو بہ پہلو انھوں نے ترش رُوئی اور بداخلاقی کی مذمّت بھی کی ہے۔

امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَا مِنْ ذَنْبٍ اِلَّا وَلَهُ تَوْبَةٌ وَمَا مِنْ تَائِبٍ اِلَّا وَقَدْ تَسْلِمُ لَهُ تَوْبَتُهُ مَا خَلَا سَيِّئَ الْخُلُقِ لَا يَكَادُ يَتُوْبُ مِنْ ذَنْبٍ اِلَّا وَقَعَ فِيْ غَيْرِهٖ اَشَرَّ مِنْهُ [2]

"ہر گناہ کی توبہ ہے اور ہر توبہ کرنے والے کے لیے اس کی توبہ قبول ہونے کی اُمّید کا وجود ہے سوائے بداخلاق شخص کے جس نے ابھی ایک گناہ کی توبہ نہیں کی ہوتی کہ اس سے بدتر گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے :

سُوْءُ الْخُلُقِ يُفْسِدُ الْعَمَلَ كَمَا يُفْسِدُ الْخَلُّ الْعَسَلَ [3]

"بدخُلقی انسان کے نیک اعمال کو اسی طرح ضائع کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو فاسد کر دیتا ہے۔"

---

[1] الکافی - جلد دوّم - صفحہ ۹۹ [2] سفینۃ البحار - جلد اوّل - صفحہ ۴۲۴

[3] مجموعۂ ورام - جلد اوّل - صفحہ ۹۰

امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے دریافت کیا گیا:

مَنْ اَدْوَمُ النَّاسِ غَمًّا ؟

"کون سا شخص سب سے زیادہ غم و اندوہ میں مبتلا ہوتا ہے؟"

آپ نے فرمایا:

اَسْوَئُهُمْ خُلُقًا [1]

"جس کا اخلاق دوسروں سے بدتر ہو۔"

شیخ سعدی کہتے ہیں:

"بدخو شخص ایک ایسے دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی جائے اس کے عذاب کے چنگل سے خلاصی نہیں پاتا ہے

اگر زِ دستِ بلا، بر فلک رود بدخوئے

زِ دست خوئے بد خویش در بلا باشد

"اگر بدخو شخص مصیبت کے ہاتھوں سے نکل کر آسمان پر بھی چلا جائے تو وہاں بھی اپنی بُری خُو کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔"

اَتٰی رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص)، فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْصِنِیْ فَکَانَ فِیْمَا اَوْصَاهُ اَنْ قَالَ: اَلْقِ اَخَاكَ بِوَجْهٍ مُنْبَسِطٍ۔ [2]

"ایک مرد رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور حضورؐ سے درخواست کی کہ اُسے کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپ نے اسے جو نصیحتیں فرمائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ لوگوں سے کشادہ روئی اور خوش خوئی سے ملا کرو۔"

---

[1] جامع الاخبار۔ صفحہ ۱۰۷   [2] الکافی۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۸۴

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے:

"میری تمام امّت میں سے وہ شخص مجھ سے زیادہ مشابہ ہے جس کا اخلاق زیادہ اچھّا ہو۔"

امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"لوگوں سے ایسا برتاؤ کرو کہ جب تک تم زندہ رہو وہ تمھاری ہم نشینی کی خواہش رکھّیں اور جب دنیا سے چلے جاؤ تو تمھارے غم میں روئیں۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"تین چیزیں انسان کی بزرگواری کی دلیل ہیں: حُسنِ خُلق، غصّہ ضبط کرنا اور دوسروں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا۔"

امام علی الرضا علیہ السّلام سے دریافت کیا گیا کہ حُسنِ خلق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

"یہ کہ تم لوگوں سے ایسا برتاؤ کرو جیسا تم خود اُن سے اپنے لیے چاہتے ہو۔"

ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے درخواست کی کہ:

"مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا:

"تم جہاں کہیں بھی ہو پرہیزگار رہو۔"

اُس نے عرض کیا: "کچھ اور بھی فرمائیں؟"

آپ نے فرمایا:

"اگر تم کسی گناہ کے مرتکب ہو جاؤ تو کوئی اچھّا کام کرو جو اُس کی تلافی کر دے۔"

اُس نے پھر کہا کہ: "کچھ اور فرمائیں۔"

آپ نے فرمایا:

"لوگوں کے ساتھ حُسنِ خُلق برتا کرو۔"

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

اَلْبِرُّ وَحُسْنُ الْخُلُقِ يَعْمُرَانِ الدِّيَارَ وَيَزِيْدَانِ فِي الْأَعْمَارِ فَقِيْلَ لَهُ مَا حَدُّ حُسْنِ الْخُلُقِ ؟ قَالَ تُلَيِّنُ جَانِبَكَ وَتُطَيِّبُ كَلَامَكَ وَتَلْقَى أَخَاكَ بِبِشْرٍ حَسَنٍ۔

"نیکوکاری اور حسنِ خُلق مملکتوں کو آباد کرتا ہے اور عمروں میں اضافہ کرتا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا: حسنِ خُلق کی حدود کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ حدود یہ ہیں کہ تمہارا رویّہ نرم اور ملائم ہو، اچھی باتیں کرو اور لوگوں سے کشادہ چہرے کے ساتھ ملو۔"

چند نکتے

(۱) اسلام کے جن اخلاقی احکام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں ان کی تبلیغ لوگوں کے مابین چودہ سو سال قبل رسولِ اکرمؐ اور آپ کے برحق جانشینوں یعنی امیرالمومنین امام علی علیہ السّلام اور آپ کے گیارہ معصوم فرزندوں کے ذریعے کی گئی اور اس کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ اگر ہمارے زمانے میں یورپی علماء نے اخلاقی مسائل کی جانب توجہ دی ہے اور ان کے بارے کتابیں اور مقالے شائع کیے ہیں تو بہت سے دوسرے علوم وفنون کی طرح ان کا سرچشمہ بھی سرزمینِ مشرق میں اور مسلمانوں کی گرانبہا تحریروں پر ہی انتہاپذیر ہوتا ہے۔

(۲) اسلام نے اخلاق کی عمارت ایمان کی بنیاد پر استوار کی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان کے حالات میں تبدیلی اس کے اخلاق میں تبدیلی کا موجب

نہیں بنتی۔

جن معاشروں میں اخلاق کی بنیاد نفع اندوزی اور مالی فوائد پر رکھی جاتی ہے انھیں ہر وقت شکست و ریخت اور تبدیلی کا خطرہ رہتا ہے اور ایسا اخلاق پائدار نہیں ہوتا۔

(۳) مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک سبب ان کی اخلاقی گراوٹ اور مذموم صفات اور ناپسندیدہ خصائل میں آلودہ ہونا ہے لہٰذا ہر ذی ہوش مسلمان کا فرض ہے کہ اسلامی اخلاق کی جانب توجّہ دے اور جیسے بھی ممکن ہو اپنے ہم جنسوں اور بالخصوص جوانوں اور نونہالوں کا اخلاق سنوارنے کی انتھک کوشش کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہم مستقبل میں دنیا کی قوموں میں ہر لحاظ سے بہتر اور برتر بن کر ابھریں۔

اسلام میں حقائقِ علمی

جوں جوں انسانی عقل ترقّی کرتی ہے اور دانشمند آفرینش کے اسرار کا کھوج لگانے کے لیے نئے قدم اٹھاتے ہیں اسلام کی تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کے پیشواؤں کی عظمت زیادہ اُجاگر ہوتی ہے۔

کائنات کے خالق اور اس کے اسرار و رموز کے عالم پروردگار نے جو قوانین وضع فرما کر نافذ کیے ہیں وہ فطرت کے عین مطابق ہیں اور کبھی بھی پُرانے یا ناقابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ جن دانا اور بے غرض محققّین نے اسلام کے لائحۂ کار کا مطالعہ اور تحقیق کی ہے انھوں نے بڑے انکسار سے اس کے سامنے اظہارِ ادب کیا ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے اس مقدّس آیئن کا انتخاب کر کے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس کی پیروی کو اپنے آپ پر فرض اور لازم کر لیا ہے۔

ایک اور گروہ نے اپنی وسیع النّظری کی بدولت اسلام کو دنیا کے مستقبل کا آیئن قرار دیا ہے۔

معروف انگریز مصنّف اور محقّق برنارڈ شا (Bernard Shaw) کہتا ہے:

(ذیل میں خود برنارڈ شا کی انگریزی تحریر کا اقتباس درج ہے)

"I have always held the religion of Muhammad in the highest esteem because of its wonderful vitality. It is the only religion which appears to me possess assimilating."

"میں نے (حضرت) محمدؐ کے دین میں حیرت انگیز قوّتِ حیات کی بنا پر ہمیشہ اس کا بے حد احترام کیا ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جو گوناگوں حالات اور زندگی کی تغیّر پذیر صورتوں کو ہم آہنگ کرنے اور ان پر تسلّط حاصل کرنے اور مختلف ادوار کا سامنا کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ میں اس بات کی پیش گوئی کرتا ہوں اور اس کے آثار ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں کہ کل کا یورپ (حضرت) محمدؐ کے دین کو قبول کرے گا۔ قرونِ وسطیٰ کے پادری جہالت یا تعصّب کی بنا پر (حضرت) محمدؐ کے آئین کی بڑی تاریک تصویر پیش کرتے تھے۔ وہ کینہ اور تعصّب کی وجہ سے آپ کو حضرت عیسیٰؑ کی ضد تصوّر کرتے تھے۔ میں نے اس مردِ کامل اور اس مافوق العادت انسان کے متعلق مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ صرف یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ضد نہیں ہیں بلکہ انھیں بنی نوعِ انسان کا نجات دہندہ کہنا چاہیئے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر آپ جیسا ایک شخص موجودہ دنیا کا فرمانروا بن جائے تو اسے دنیا کے مسائل اور مشکلات کو حل کرنے میں اتنی کامیابی حاصل ہو گی کہ حسب صلح اور نیک بختی کی آرزو تمام انسان کرتے ہیں اس کے حصول کی ضمانت حاصل ہو جائے گی۔"

ائمۂ طاہرین علیہم السّلام اور اسلام کے عالی قدر پیشواؤں کی جو یادگاریں اب تک موجود ہیں وہ ہر محقّق کو حیرت زدہ اور مبہوت کر دیتی ہیں۔

ہم لوگ جو پیشوایانِ اسلام کو اللہ کے برگزیدہ بندے اور علمِ الٰہی کو ان کے علوم کا سرچشمہ مانتے ہیں ان کی پیشین گوئیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا لیکن جب غیر مسلم محقق جو ہر چیز کا مطالعہ مادّی اور انسانی علوم کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں، ان پیشین گوئیوں پر غور کرتے ہیں تو اس قدر متعجب ہوتے ہیں کہ ان کی حیرت چھپائے نہیں چھپتی۔

کچھ عرصہ قبل ایرانی مجلّے 'خواندنیہا' نے ایک کتاب 'مغزِ متفکّرِ جہانِ شیعہ' کے ترجمے اور اشاعت کا اہتمام کیا۔ مذکورہ کتاب کی طباعت اور اشاعت دانشمندوں اور محقّقین کی ایک ایسی جماعت (مرکزِ مطالعاتِ اسلامی اسٹراسبورگ[1]) کے ذریعے ہوئی جو عموماً عیسائی ہیں۔ اس کتاب میں چھٹے پیشوا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کی زندگی اور ان کے علوم کا مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مؤلّفین نے جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی علم میں مہارت رکھتا ہے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے ارشادات کا دورِ حاضر کے علوم اور انکشافات سے مقابلہ کیا اور سبھی حیران ہیں کہ امام علیہ السّلام نے یہ علوم کہاں سے حاصل کیے۔

ذیل میں ہم نمونے کے طور پر مذکورہ کتاب کے چند حصّے نقل کرتے ہیں:

علمِ طِب کی تدریس

"امام محمد الباقر علیہ السّلام کے حلقۂ تدریس میں علمِ طِب کی تدریس کے بارے میں دو متضاد روایتیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ علمِ طِب پڑھاتے

---

[1] (Strasbourg) فرانس کے صوبہ آلزاس کا ایک شہر ہے جو دریائے رون کے کنارے آباد ہے۔ اس کی آبادی ۰۰۰ ۵ ۵ ۹ ۱ نفوس پر مشتمل ہے اور اس میں بڑے خوبصورت اور باشکوہ گرجے موجود ہیں۔ (فرہنگ عمید۔ اطلاعاتِ عمومی)

تھے اور بعض نے آپ کے علمِ طِب کا درس دینے کی نفی کی ہے تاہم اِس میں کوئی شک نہیں کہ جب خود امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے درس دینا شروع کیا تو آپ طِب بھی پڑھاتے تھے اور آپ کے نظریات نے اس علم پر بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ چنانچہ دوسری اور تیسری صدی کے اطبّاء آپ کے طبّی نظریات سے استفادہ کیا کرتے تھے۔"

"ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمیں اس بات کا عِلم نہیں کہ آیا امام محمد الباقر علیہ السّلام علمِ طِب کا درس دیتے تھے یا نہیں اور آیا آپ کے فرزند نے یہ علم آپ سے سیکھا یا حقیقت اس کے برعکس ہے تاہم ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام علمِ طِب پڑھایا کرتے تھے اور آپ نے اس علم میں چند ایسی چیزیں شامل کیں جو مشرق کے اطبّاء نے پہلے شامل نہیں کی تھیں اور مشرق سے ہماری مرادِ عربستان نہیں ہے کیونکہ عربستان میں علمِ طِب کا وجود نہیں تھا بلکہ ظہورِ اسلام کے بعد یہ علم وہاں دوسرے علاقوں سے پہنچا۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے یہ علم اپنے والدِ بزرگوار سے سیکھا تو پھر لازمًا یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کے والد نے بھی یہ علم کہیں نہ کہیں سے حاصل کیا ہوگا اور ہمیں یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا۔"

"جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کا پیشہ طبابت نہیں تھا تاکہ آپ لوگوں کے علاج معالجے کے دوران علمِ طِب کے قواعد پر عبور حاصل کر لیتے لہٰذا یہی بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے یہ علم کہیں نہ کہیں سے سیکھا تھا اور اگر انھوں نے یہ علم اپنے پدرِ بزرگوار سے سیکھا تھا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے پدر بزرگوار

نے کہاں سے سیکھا؟"

مٹّی اور ہوا ایک عُنصر نہیں ہیں

"ایک دن امام جعفر الصّادق علیہ السّلام اپنے والدِ بزرگوار اور اُستاد یعنی امام محمد الباقر علیہ السّلام کے حلقۂ درس میں ارسطو[1] (Aristotle) کی طبیعیات کے اس حصّے پر پہنچے کہ دُنیا میں چار سے زیادہ عناصر کا وجود نہیں ہے اور یہ چار عناصر مٹّی، پانی، ہوا اور آگ سے عبارت ہیں تو آپ نے اعتراض کیا اور کہا :

"مجھے حیرت ہے کہ ارسطو جیسے شخص کو اس بات کا خیال کیوں نہ آیا کہ مٹّی ایک عُنصر نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے عناصر موجود ہیں اور اس میں جتنی دھاتیں موجود ہیں ان میں سے ہر ایک، ایک علیٰحدہ عُنصر کی حیثیّت رکھتی ہے۔"

ارسطو کے زمانے اور امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے زمانے میں ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے اور اس طویل مدّت میں عناصرِ اربعہ ارسطو کے قول کے مطابق علم الاشیاء کے ارکان میں شمار ہوتے تھے اور کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس بات پر یقین نہ رکھتا ہو اور اس سے اختلاف کا تو کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن ہزار سال بعد ایک لڑکے نے جس کی عمر بمشکل بارہ سال تھی یہ انکشاف کیا کہ مٹّی ایک عُنصر نہیں ہے بلکہ متعدّد عناصر سے مل کر تشکیل ہوئی ہے۔"

"جب اس لڑکے نے خود درس دینا شروع کیا تو ایک دوسرے عُنصر کی

---

[1] ارسطو یونان کا عظیم دانشور تھا جس کا لقب معلّمِ اوّل ہے۔ (۳۸۴ یا ۳۲۲ قبل مسیح)

وسعت کے لحاظ سے ایک اور نیا انکشاف کیا کہ 'ہوا' ایک عُنصر نہیں ہے بلکہ چند عناصر سے مل کر بنی ہے۔"

"یورپ کے اٹھارویں صدی میلادی کے جن علماء نے ہوا کے اجزا کا انکشاف کیا اور انھیں ایک دوسرے سے الگ کیا ان سے گیارہ سو سال قبل امام جعفر الصادق علیہ السّلام نے بتا دیا تھا کہ ہوا ایک عُنصر نہیں ہے بلکہ کئی ایک عناصر کے ملنے سے وجود میں آئی ہے۔"

"اگرچہ کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے اس بات کو قبول کر لیا کہ مٹّی ایک عُنصر نہیں ہے بلکہ چند عناصر کا مجموعہ ہے تاہم ہوا کے ایک عُنصر ہونے کے بارے میں انھیں کوئی شک نہ تھا۔"

"ارسطو کے بعد آنے والے ممتاز ترین ماہرینِ طبیعیات تک کو یہ علم نہیں تھا کہ ہوا ایک بسیط عُنصر نہیں ہے حتیٰ کہ اٹھارویں صدی میلادی میں جس کا شمار سائنس کے لحاظ سے بڑے آب و تاب والے ادوار میں ہوتا ہے لیووئے زیر (Lavoisier) [1] کے زمانے تک بہت سے علماء ہوا کو ایک بسیط عنصر خیال کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ چند عناصر سے مخلوط نہیں ہے اور جب لیووئے زیر نے آکسیجن کو ہوا میں موجود دوسری گیسوں سے جُدا کیا اور ثابت کیا کہ آکسیجن سانس لینے اور جلانے میں کتنا عظیم کردار ادا کرتی ہے تو سب علماء نے تسلیم کر لیا کہ ہوا بسیط نہیں ہے بلکہ چند گیسوں سے تشکیل ہوئی ہے لیکن ۱۷۹۴ء میلادی میں لیووئے زیر کا سر گلوٹین [2]

---

[1] معروف فرانسیسی کیمیا داں جو جدید علمِ کیمیا کا بانی ہے (۱۷۴۳ تا ۱۷۹۴ میلادی)

[2] (Guillotine) ایک آلے کا نام ہے جو ۱۷۹۲ میلادی میں فرانس میں سزا یافتہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

کے ذریعے تن سے جُدا کر دیا گیا اور کیمیائے جدید کے بانی کو جو اگر زندہ رہتا تو ممکن تھا کہ بہت سے اور انکشافات کرتا دوسری دنیا میں بھیج دیا گیا"

"لہٰذا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام جنھوں نے یہ اعلان کیا کہ ہوا ایک بسیط عُنصر نہیں ہے اپنے زمانے سے گیارہ سو سال آگے تھے"

"شیعہ کہتے ہیں کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے اس علمی حقیقت اور اسی طرح دوسرے علمی حقائق کا ادراک علمِ لدُنّی یعنی علمِ امامت کے ذریعے کیا"

"آجکل ہمیں یہ موضوع معمولی نظر آتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دُنیا میں ۱۰۲ عناصر موجود ہیں لیکن ساتویں صدی میلادی اور پہلی صدی ہجری میں یہ ایک بہت بڑا انقلابی نظریہ تھا اور اس زمانے میں انسانی عقل یہ باور نہیں کر سکتی تھی کہ ہوا ایک بسیط عُنصر نہیں ہے۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ اس دور میں اور اس کے بعد کے ادوار میں اٹھارویں صدی میلادی تک یورپ اس علمی اور انقلابی عقیدے اور دوسری چیزوں کے قبول کرنے کا ظرف نہیں رکھتا تھا جو امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے بیان فرمائیں اور جن کا ذکر آئندہ ابواب میں آئے گا....."

(ماخوذ از "مغز متفکرِ جہانِ شیعہ")

آکسیجن

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے اپنے حلقۂ درس میں فرمایا:

"ہوا کئی ایک اجزا رکھتی ہے اور اس کا ایک جز و ایسا ہے جو دوسرے اجسام سے مخلوط ہو جاتا ہے اور ان میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے اور ہوا کے

منتعد د اجزا میں سے وہی جز و ہے جو جلانے میں مدد دیتا ہے اور اگر اس کی مدد میتسر نہ ہو تو جو چیزیں جلنے کے قابل ہیں وہ جل نہ سکیں"۔

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے اس نظریے کی خود تشریح فرمائی اور بعد میں جو درس دیے ان میں فرمایا : جو چیز ہوا کو مختلف اشیاء کے جلانے میں مدد دیتی ہے اگر وہ ہوا سے جُدا ہو جائے اور اپنی خالص شکل میں دستیاب ہو تو وہ چیزوں کو جلانے میں اس قدر مؤثر ہے کہ اس سے لوہے کو بھی جلایا جا سکتا ہے"۔

لہٰذا پریسٹلے[1] (Priestley) سے ہزار سال قبل اور لیوائے زیر سے بھی پہلے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے اس کی بخوبی تعریف کر دی اور فقط اسے آکسیجن کا نام نہیں دیا۔ گو پریسٹلے نے آکسیجن دریافت کی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ لوہے کو بھی جلا سکتی ہے"۔

"لیوائے زیر نے اگرچہ تجربوں کے ذریعے آکسیجن کے کچھ خواص کا علم حاصل کر لیا لیکن وہ یہ نہ جان سکا کہ یہ گیس لوہے کو بھی جلا دیتی ہے۔ اس کے برعکس امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے ہزار سال پیشتر اس حقیقت کا ادراک کر لیا"۔

"آجکل ہم جانتے ہیں کہ اگر ایک لوہے کا ٹکڑا اتنا گرم کیا جائے کہ وہ بالکل سُرخ ہو جائے اور اسے خالص آکسیجن میں ڈال دیں تو اس میں سے شعلہ بھڑک اُٹھے گا اور وہ جلنے لگے گا۔ جس طرح پُرانے زمانے میں روغن یا مٹّی کے تیل میں فتیلہ ڈال کر اسے آگ لگا دی جاتی تھی اور لوگ اس کی روشنی میں رات بسر کرتے تھے۔ اسی طرح ایک ایسا چراغ بنایا جا سکتا ہے جس کا

---

[1] مشہور انگریز سائنسدان جس نے نائٹروجن دریافت کی۔ (۱۷۳۳ تا ۱۸۰۴ میلادی)

فتیلہ لوہے کا ہو اور اسے مائع آکسیجن میں ڈال دیا جائے اور فتیلے کو اتنا گرم کیا جائے کہ سُرخ ہو جائے تو وہ بڑا درخشاں نور پیدا کر کے رات کو روشن کر دے گا۔ روایت ہے کہ ایک دن امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے والدِ بزرگوار امام محمّد الباقر علیہ السّلام نے درس دیتے ہوئے فرمایا: علم کی مدد سے پانی کے ذریعے جو آگ کو بجھانے والی چیز ہے، آگ جلائی بھی جا سکتی ہے۔"

"اس قول کو اگر شاعرانہ اسلوبِ بیان نہ سمجھا جاتا تو یہ ایک بے معنی بات معلوم ہوتی تھی اور ایک مدّت تک جو لوگ اس روایت کو سُنتے وہ یہی خیال کرتے رہے کہ امام محمّد الباقر علیہ السّلام نے شاعرانہ خیال کا اظہار کیا ہے لیکن اٹھّارویں صدی میں اور اس کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ علم کی مدد سے پانی کے ذریعے آگ جلائی جا سکتی ہے اور یہ آگ لکڑی یا کوئلے سے جلائی جانے والی آگ سے زیادہ گرم ہو گی کیونکہ ہائیڈروجن (جو پانی کے دو اجزا میں سے ایک جزو ہے) کی آکسیجن کے ساتھ جلنے کی حرارت ۲۶۶۴ درجے تک پہنچ جاتی ہے اور آکسیجن کے وسیلے سے ہائیڈروجن کے جلنے کے عمل کو 'اوکسیدروژن' کہتے ہیں جو صنعت میں دھاتوں کے گرم کرنے یا دھاتوں کے ٹکڑے توڑنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

زمین کی اپنے محور پر گردش

"ہنری پوانکارہ[ا] (Henry Poimcare) جو ۱۹۱۲ء میں ۵۸ سال کی عمر

[ا] مشہور فرانسیسی فلسفی اور ریاضی دان (۱۸۵۴ تا ۱۹۱۲ میلادی)

میں فوت ہوا اپنے زمانے کا عظیم ترین ریاضی داں تھا اور اس کی تاریخ وفات سے بھی واضح ہے کہ وہ بیسویں صدی کی ابتدا تک زندہ رہا لیکن اس کے باوجود یہ عظیم دانشور کہا کرتا تھا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے۔"

"جب ہنری پوانکارہ کے رتبے کا دانشور بیسویں صدی کے شروع میں اس بارے میں متردد ہو کہ آیا زمین اپنے محور پر گھومتی ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ آج سے بارہ تیرہ سو سال پہلے کے لوگ اپنے زمانے میں اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔"

"زمین کی اپنے محور پر گردش بطور محسوس اس وقت تک ثابت نہ ہو سکی جب تک انسان چاند پر نہ پہنچ گیا اور وہاں سے زمین کو دیکھ نہ لیا۔ حتیٰ کہ فضانوردی کے ابتدائی سالوں میں فضانورد بھی زمین کی گردش اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت فضانوردوں کے پاس ٹھہرنے کے لیے کوئی ایسی جگہ نہ تھی جو ساکن ہوتی۔ وہ ایسے خلائی جہازوں میں سوار ہوتے تھے جن میں سے ہر ایک ۹۰ منٹ یا قدرے زیادہ وقت میں زمین کے گرد چکّر لگاتا تھا اور فضانورد چونکہ خود اتنی تیز رفتاری سے زمین کے گرد گھوم رہے ہوتے تھے اس لیے زمین کی حرکت کا ادراک نہ کر پاتے تھے۔"

"لیکن جس دن وہ چاند پر اُترے اور فلم تیار کرنے والی دوربینوں کا رُخ زمین کی جانب کیا تو انھوں نے تصویروں میں دیکھا کہ زمین آہستہ آہستہ اپنے محور پر گردش کر رہی ہے اور اس دن زمین کی یہ گردش مرئی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ چونکہ گلیلیو[1] (Galileo) بخوبی جانتا تھا کہ زمین

---

[1] اٹلی کا مشہور دانشمند، ریاضی داں اور ماہرِ فلکیات جس نے فلکی دوربین ایجاد کی۔ (۱۵۶۵ تا ۱۶۴۲ میلادی)

نظامِ شمسی کے دوسرے سیّاروں کی طرح سورج کے گرد چکّر لگاتی ہے اسے یہ اندازہ بھی لگا لینا چاہیئے تھا کہ یہ دوسرے سیّاروں کی طرح اپنے محور پر بھی گھومتی ہے۔ تاہم اس کے کسی ایسے اندازے کی کوئی نشانی ہم اس کی تصانیف میں نہیں دیکھتے۔ نہ صرف یہ کہ گلیلیو نے اپنی حینِ حیات میں زمین کے اپنے محور پر گردش کرنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا بلکہ اس کی وفات کے بعد بھی اس کی تحریروں میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس بات کی نشاندہی کرے کہ اسے زمین کے اپنے محور پر گردش کرنے کا ادراک حاصل ہو گیا تھا۔"

"سولہویں صدی میلادی میں فلکیات کا ایک اور عالم ڈنمارک میں رہتا تھا جو سورج کے گرد زمین کی گردش کا معتقد تھا اور تیخو براہہ یا تیکو براہہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ تیخو براہہ کا تعلّق ڈنمارک کے طبقۂ اشراف سے تھا اور پولینڈ کے کوپرنیکس[1] (Copernicus) کے برعکس جو کبھی کبھی نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہوتا تھا وہ (تیخو براہہ) بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور اپنے محلّات میں بڑی پُر تکلّف دعوتیں دیتا تھا۔"

"تیخو براہہ جس نے ۱۶۰۱ میلادی میں یعنی سترھویں صدی کے پہلے سال میں وفات پائی وہ شخص تھا جس کے فلکیات سے متعلّق مطالعات نے جرمنی کے کیپلر[2] (Kepler) کی بڑی مدد کی۔ تیخو براہہ کے بغیر کیپلر کے لیے سورج کے گرد زمین سمیت مختلف سیّاروں کی حرکت کے متعلّق اپنے تین مشہور فلکیاتی قوانین کا انکشاف کرنا ممکن نہ تھا۔"

---

[1] مشہور پولستانی دانشمند اور اختر شناس (۱۴۷۳ تا ۱۵۴۳)

[2] مشہور جرمن ریاضی دان (۱۵۷۱ تا ۱۶۳۰ میلادی)

"اس کے باوجود تیخو براہہ زمین کی اپنے محور پر گردش کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا اور اگر وہ اس حقیقت تک پہنچ گیا ہوتا تو جس طرح اس نے زمین کے سورج کے گرد گھومنے کی علانیہ تائید کی تھی اسی طرح اس کے بارے میں بھی کچھ کہتا۔ جرمنی کے کیپلر نے جو ۱۶۳۰ میں فوت ہوا سیاروں کی حرکت کے متعلق اپنے تین قوانین کا انکشاف کر کے نہ صرف اس زمانے کی دنیائے علم سے خراجِ تحسین وصول کیا بلکہ اِس زمانے میں بھی جو کوئی ان قوانین کو پڑھتا ہے کیپلر کی تعریف کرتا ہے۔ وہ عظیم دانشمند بھی جس نے تین فلکیاتی قوانین کا انکشاف کر کے اپنی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت فراہم کر دیا، حرکتِ زمین کے اس نکتے کو نہ سمجھ سکا۔"

"لیکن امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے اس سے بارہ صدیاں پہلے یہ بتا دیا تھا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے اور یہ کہ روز و شب کے الٹ پھیر کا سبب سورج کا زمین کے گرد چکّر لگانا نہیں (کیونکہ آپ عقلی لحاظ سے اس بات کو ناقابلِ قبول خیال کرتے تھے۔) بلکہ زمین کی اپنے محور پر گردش اس امر کا باعث بنتی ہے کہ دن اور رات وجود میں آئیں اور ہمیشہ آدھی زمین تاریک ہو یعنی رات کا وقت ہو اور آدھی روشن ہو یعنی دن کا وقت ہو۔"

"قدما جو زمین کو ایک کُرّہ سمجھتے تھے اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہمیشہ آدھی زمین پر رات ہوتی ہے اور آدھی پر دن ہوتا ہے لیکن وہ دن اور رات کا باعث سورج کی زمین کے گرد گردش کو خیال کرتے تھے۔"

"اس کی کیا وجہ ہے کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کو بارہ صدیاں پہلے علم ہو گیا کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے اور اس کے نتیجے میں دن اور رات

وجود میں آتے ہیں ؟

"اگرچہ پندرھویں اور سترھویں صدی میلادی کے دانشوروں نے جن میں سے چند ایک کا ذکر اوپر کیا گیا ہے فلکیات کے کچھ میکانکی قوانین کا پتا چلا لیا تھا لیکن وہ اس مسئلے کی تہہ تک نہ پہنچ سکے کہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے۔ پھر یہ کیونکر ہوا کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے جن کا قیام مدینے جیسی دُور افتادہ بستی میں تھا جو اس زمانے کے علمی مراکز سے کافی فاصلے پر واقع تھی زمین کی محوری گردش کا علم حاصل کر لیا ؟"

دُنیا کی پیدائش

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے دنیا کی پیدائش کے متعلق یوں ارشاد فرمایا ہے : دنیا ایک جرثومے سے وجود میں آئی اور اس جرثومے کے دو متضاد قطب تھے اور ان دو متضاد قطبوں کی وجہ سے ذرّہ پیدا ہوا اور تب مادّہ وجود میں آیا اور مادّے میں تنوّع پیدا ہوا اور مادّی چیزوں کا تنوّع ان کے ذرّات کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اس تھیوری میں اور دورِ حاضر کی ایٹمی تھیوری میں کوئی فرق نہیں ہے اور دو متضاد قطب ایٹم کے اندر موجود دو مثبت اور منفی چارجز (Charges) ہیں اور وہ دو چارج ایٹم کی پیدائش کا موجب بنے اور ایٹم ہی مادّے کو وجود میں لایا اور جو تفاوت مواد یعنی عناصر میں دکھائی دیتا ہے وہ ان چیزوں کی کمی یا زیادتی کا نتیجہ ہے جو عناصر کے ایٹم میں موجود ہوتی ہیں۔ شیعہ کہتے ہیں کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے جو باتیں دنیا کی پیدائش، فلکیات، طبیعیات، عناصر، کیمیا، ریاضیات اور

دوسری چیزوں کے بارے میں کہی ہیں ان کا ماخذ علمِ امامت یعنی علم لدنی ہے۔
ہم نے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے جغرافیہ، فلکیات اور طبیعیات کے بارے میں علم کی بحث دنیا کی پیدائش سے شروع کی ہے لہٰذا ہم امام علیہ السّلام کے علمِ طبیعیات کی بحث جاری رکھیں گے اور اس کے بعد دوسرے مباحث کی باری آئے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ طبیعیات کے بارے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے وہ باتیں کہی ہیں جو اُن سے پہلے کسی نے نہیں کہی تھیں اور ان کے بعد بھی اٹھارویں صدی کے نصف تک اور اُنیسویں اور بیسویں صدیوں تک کسی کی عقل کی رسائی یہاں تک نہیں ہوئی کہ وہ یہ باتیں کہہ سکے"۔

انسانی بدن کے اجزاء

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام دوسرے مسلمانوں کی طرح یہی کہتے تھے کہ انسان مٹّی سے پیدا کیا گیا ہے۔ آپ میں اور دوسرے مسلمانوں میں فرق یہ تھا کہ آپ انسان کے مٹی سے پیدا ہونے کے بارے میں ایسی باتیں کہتے تھے جو اس زمانے کے مسلمانوں کی عقل سے بالاتر تھیں"۔
"بعد کے ادوار میں بھی کوئی مسلمان انسانی بدن کی بناوٹ کے بارے میں امام جعفر الصّادق علیہ السّلام جتنی معلومات نہیں رکھتا تھا اور اگر کسی نے اس موضوع پر کچھ کہا بھی ہے تو بلاواسطہ یا بالواسطہ امام علیہ السّلام کے شاگردوں سے سُن کر کہا ہے"۔
"آپ فرماتے تھے: جتنی چیزیں مٹّی میں ہیں وہ سب انسان کے بدن میں موجود ہیں لیکن یکساں مقدار میں نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض انسانی بدن

میں بہت زیادہ ہیں اور بعض بہت کم۔"

"جو چیزیں انسانی بدن میں زیادہ ہیں ان کی مقدار بھی ایک جیسی نہیں اور ان میں سے کچھ دوسری چیزوں سے کم ہیں۔"

"آپ نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے بدن میں زیادہ ہوتی ہیں اور آٹھ چیزیں ایسی ہیں جن کی مقدار کم ہوتی ہے اور آٹھ اور چیزیں ایسی ہیں جن کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔"

"انسانی بدن کی ساخت کے بارے میں آپ کا پیش کردہ نظریہ اتنا عجیب و غریب ہے کہ بعض اوقات انسان سوچنے لگتا ہے کہ آیا جیسا کہ اہلِ تشیّع کا عقیدہ ہے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام علمِ امامت کے حامل تھے اور آپ نے یہ نظریہ بشری علوم سے نہیں بلکہ علمِ امامت سے اخذ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ ایک عام عالم جسے انسانی معلومات حاصل ہوں آج سے ساڑھے بارہ سو سال پہلے ایک ایسی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام اہلِ تشیّع کے عقیدے کے مطابق علمِ امامت رکھتے تھے یا شعورِ باطنی کا عقیدہ رکھنے والوں کے مطابق شعورِ باطنی سے مربُوط تھے یا برگساں[1] (Bergson) کے نظریے کی بنا پر انھوں نے اپنی قوی حیاتی جُست سے استفادہ کیا۔ انھوں نے انسانی بدن کی بناوٹ کے بارے میں وہ باتیں کہی ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ آپ اپنے زمانے میں بھی اور بعد کے ادوار میں بھی علم الابدان کے منفرد دانشور کی حیثیّت کے حامل تھے کیونکہ ساڑھے بارہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آپ کا نظریہ سائنسی لحاظ سے ثابت ہو گیا

---

[1] ایک مشہور فرانسیسی فلسفی جس نے ۱۹۲۷ میں نوبل انعام حاصل کیا۔ (۱۸۵۹ - ۱۹۴۱ میلادی)

ہے اور اس کی صحت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور امام جعفر الصّادقؑ نے اس مواد کا نام نہیں بتایا جو انسان کے بدن میں موجود ہے۔"

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے "جو کچھ زمین میں ہے وہ انسان کے بدن میں موجود ہے۔"

"جو کچھ کرّہ زمین میں ہے وہ ایک سو دو[۱۰۲] عناصر کی بدولت وجود میں آیا ہے اور یہ ایک سو دو عناصر انسان کے بدن میں موجود ہیں لیکن ان میں سے بعض عناصر کی مقدار اتنی کم ہے کہ اس کا ابھی تک صحیح صحیح تعیّن نہیں ہو سکا۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ نظریہ اب پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔"

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے ارشاد کے مطابق جو آٹھ چیزیں انسان کے بدن میں بہت کم ہیں وہ مندرجہ ذیل عناصر ہیں:

مولبیدن، سیلیوم، فلوئور، کوبالٹ، مینگنیز، یود، تانبا، رُوی۔

جو آٹھ عناصر انسانی بدن میں مندرجہ بالا آٹھ عناصر کے مقابلے میں زیادہ ہیں وہ یہ ہیں:

مانیزیوم، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، فاسفورس، کلور، گندھک، لوہا۔

جو چار عناصر انسان کے بدن میں بہت زیادہ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن۔"

"انسانی بدن میں موجود عناصر کا پتا چلانا کوئی ایک دو دن کا کام نہ تھا۔ یہ کام اٹھارویں صدی میلادی کے آغاز میں تشریح بدن یعنی بدن کی چیر پھاڑ کے ساتھ شروع ہوا اور علمِ تشریح میں دو قوموں نے ترقّی کی جن میں سے ایک فرانسیسی اور دوسرے آسٹروی تھے۔"

"دوسرے ممالک میں تشریحِ بدن بہت شاذونادر تھی اور مشرقی ممالک میں تو اس کا وجود ہی نہ تھا۔ آرتھوڈاکس (Orthodox)، کیتھولک (Catholic)، اور پروٹسٹنٹ (Protestant) چرچ تشریحِ بدن کی مخالفت کرتے تھے مگر آسٹریا اور فرانس میں کلیسا کے احکام کی کھُلم کھُلا مخالفت کیے بغیر بدن کی چیر پھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود 'مارا' کے زمانے تک فرانس میں تشریحِ بدن کا زیادہ رواج نہیں تھا اور یہ تقریباً خفیہ طور پر کی جاتی تھی۔ 'مارا' نے تشریحِ بدن کے سلسلے میں چند دوسرے فرانسیسی دانشمندوں کی مدد سے (جن میں معروف لیوئے زیر بھی شامل تھا جس کا سر ۱۷۹۴ میلادی میں گلوٹین کے ذریعے تن سے جُدا کر دیا گیا) بدن کی بافتوں کا تجزیہ کیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انسان کے بدن کی تشکیل کن عناصر سے ہوئی ہے۔"

"مارا کے بعد اس کے شاگردوں نے اس کا کام جاری رکھا اور تشریحِ بدن کے سلسلے میں بدن کی بافتوں کا تجزیہ کرتے رہے۔ پوری انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے شروع تک یہ کام جاری رہا اور وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔"

"تشریحِ بدن جو اٹھارویں صدی کے آغاز تک تقریباً فرانس اور آسٹریا تک محدود تھی۔ یورپ کے دوسرے ملکوں اور پھر دوسرے برّاعظموں کے ممالک میں بھی رواج پا گئی اور موجودہ دَور میں سوائے ان ممالک کے جن میں طب اور جرّاحی کی تعلیم کے لیے کوئی یونیورسٹی نہیں یہ کام ہر جگہ ہو رہا ہے۔ جہاں جہاں انسانی بدن کی چیر پھاڑ کی جاتی ہے وہاں اس بارے میں تحقیق ہوتی ہے کہ وہ کون سے عناصر ہیں جن سے انسانی

بدن کی تشکیل ہوئی ہے۔ بعض اوقات دو مراکز کی تحقیق کے نتائج میں معمولی جزئیات پر تو اختلاف ہو جاتا ہے لیکن بڑی بڑی باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور جتنا سب امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے بتایا ہے وہ تمام ممالک میں تمام صحت مند افراد کے بارے میں قائم ہے۔"

پانی میں آکسیجن اور ہائیڈروجن

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کا اعجاز اس میں نہیں کہ آپ پہاڑ کو حرکت میں لے آئے بلکہ آپ کا اعجاز اس میں ہے کہ ساڑھے بارہ صدیاں پیشتر آپ نے یہ پتا چلا لیا کہ ہوا میں آکسیجن موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دریافت کر لیا کہ پانی میں ایک جلنے والی چیز بھی ہے اور اسی لیے آپ نے فرمایا کہ پانی کو بجلی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔"

"کہا جاتا ہے کہ ایک پیغمبر کا سب سے بڑا اعجاز اس کا کلام ہوتا ہے کیونکہ وہ کوئی بے بنیاد بات نہیں کہتا۔ موجودہ دور میں جب ہم سنتے ہیں کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے دوسری صدی ہجری کے پہلے نصف میں پانی میں آکسیجن کے وجود کا پتا چلا لیا تھا تو اپنے دل میں اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ اعجاز ہے۔ انسان یہ دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے کہ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام یا آپ کے والدِ بزرگوار امام محمد الباقر علیہ السّلام نے کیونکر ہائیڈروجن گیس کا پتا چلا لیا جبکہ وہ خالص شکل میں فطرت میں موجود نہیں اور اس کا کوئی رنگ، بُو یا مزا بھی نہیں ہے۔"

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام یا ان کے والدِ بزرگوار فقط پانی میں ہائیڈروجن کا پتا چلا سکتے تھے اور پانی کا تجزیہ کیے بغیر ان کے لیے

اسے پہچاننا ممکن نہ تھا"۔

"پانی کا تجزیہ کرنے کے لیے بھی برقی رَو سے استفادہ کرنا ضروری ہے کیونکہ پانی کا تجزیہ کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں اور یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں کہ پانی کا تجزیہ کرنے کے لیے ان دونوں میں سے کوئی ایک برقی رو سے استفادہ کر سکتا تھا۔

موجودہ دور میں پہلا شخص جو ہائیڈروجن کو پانی سے جُدا کرنے میں کامیاب ہوا وہ برطانوی سائنسدان ہنری کیونڈش تھا جو ۱۸۱۰ میلادی میں ۸۱ سال کی عمر میں فوت ہوا"۔

"اس نے کئی سال پانی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور جب ہائیڈروجن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے اشتعال پذیر ہوا کا نام دیا اور جب اس نے ہائیڈروجن کو مشتعل کیا تو قریب تھا کہ وہ خود اور اس کا گھر جل کر راکھ ہو جائے...... ہائیڈروجن گیس اس زمانے میں دریافت ہوئی جب بجلی کی قوّت سے مستفید ہونے میں اتنی پیشرفت ہو چکی تھی کہ اس کے ذریعے پانی کا تجزیہ کرنا ممکن تھا"۔

"لیکن امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے زمانے میں بجلی کی قوّت سے استفادہ فقط کاہ اور کہربا تک محدود تھا جس کی حیثیّت محض دل لگی اور کھیل کی تھی۔ ان دنوں کہربا کے ایک ٹکڑے کو ایک ریشمی کپڑے سے رگڑا جاتا تھا اور پھر اسے گھاس کے قریب کیا جاتا تھا اور کہربا گھاس کے تنکوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھی"۔

"کیا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام یا ان کے والدِ بزرگوار امام محمّد الباقر علیہ السّلام کو ہائیڈروجن کو پانی سے جُدا کرنے کے ایسے وسائل کا عِلم تھا جن سے

سائنس داں ابھی تک نابلد ہیں؟ اور کیا وہ برقی رو کے علاوہ بھی کسی چیز کے ذریعے ہائیڈروجن کو پانی سے علیحدہ کر سکتے تھے؟"

"جس دن کیونڈش پہلی مرتبہ ہائیڈروجن حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اس دن سے لے کر آج تک برقی رو کے علاوہ ہائیڈروجن کو پانی سے جُدا کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں اور ابھی تک سائنس داں، ہائیڈروجن کو پانی سے جُدا کرنے کا اور کوئی وسیلہ دریافت نہیں کر پائے۔"

ماحول کی آلودگی

"امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے زمانے میں صنعتیں، دستکاریوں تک محدود تھیں حتّٰی کہ ان دنوں موجودہ زمانے کے کارخانوں جیسے کسی ایک کارخانے کا بھی وجود نہ تھا۔ دھاتوں کو چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں پگھلایا جاتا تھا اور جب لوہے سمیت تمام دھاتیں لکڑی سے پگھل جاتیں تو بھی ماحول میں آلودگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔"

"حتّٰی کہ اگر لوہے کو پہاڑی کوئلے سے پگھلایا جاتا تب بھی تولیدات کی مقدار اتنی نہیں ہوتی تھی کہ ماحول کو آلودہ کر دے جیسا کہ اٹھارویں صدی میلادی کے آغاز سے مغربی جرمنی، فرانس، انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک میں لوہا اور فولاد زیادہ مقدار میں پیدا ہونا شروع ہوا لیکن اس سے بھی ماحول میں کوئی آلودگی رونما نہیں ہوئی حالانکہ جرمنی، فرانس اور انگلستان میں لوہے کو پگھلانے کے تمام کارخانوں میں پہاڑی کوئلہ جلایا جاتا تھا اور سال کے شروع سے آخر تک ایک لحظہ کے لیے بھی کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند نہیں ہوتا تھا۔"

"اس کے باوجود ماحول پہاڑی کوئلے کے دھوئیں سے آلودہ نہیں ہوتا تھا تو پھر امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے زمانے کا تو معاملہ ہی اور تھا جب کہ آجکل جیسے کسی کارخانے کا وجود بھی نہ تھا اور کوئی بھی پہاڑی کوئلہ نہیں جلاتا تھا۔ پھر بھی امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے ایک ایسے انسان کی طرح جو آجکل کے حالات دیکھ رہا ہو یہ فرمایا کہ آدمی کو یوں زندگی گزارنی چاہیئے کہ اپنے ماحول کو آلودہ نہ کرے کیونکہ اگر وہ ماحول کو آلودہ کرے گا تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ آلودگی کی وجہ سے اس کی زندگی دُشوار یا شاید ناممکن ہو جائے۔"

"ماحول کی آلودگی کے موضوع کا چالیس سال پہلے تک بھی کوئی وجود نہ تھا۔ یہ موضوع اس وقت سے شروع ہوا جب پہلا ایٹم بم پھٹا اور جس علاقے میں پھٹا اس کی فضا کو آلودہ کر دیا۔"

"اگر پہلے دھماکوں پر اکتفا کیا جاتا تب بھی ماحول آلودہ نہ ہوتا لیکن جن طاقتوں کے پاس ایٹمی اسلحہ موجود تھا انھوں نے اسلحہ کے تجربات جاری رکھے اور اس کے ساتھ ساتھ ایٹمی طاقت سے بجلی پیدا کرنے والے کارخانے قائم ہو گئے اور تابکار Radio-active مواد کی وجہ سے فضا میں آلودگی زیادہ ہو گئی۔"

"اسی دوران میں صنعتوں نے بھی بالخصوص امریکہ اور یورپ میں ماحول کو آلودہ کر دیا اور بعض دریاؤں مثلاً مغربی یورپ کے دریائے رون کا پانی اس قدر آلودہ ہو گیا کہ مچھلیوں کی نسل ختم ہو گئی اور اسی طرح شمالی امریکہ کی بڑی بڑی جھیلوں میں جن کا پانی میٹھا ہے مچھلیوں کی نسل تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ خشکی کی فضا کی آلودگی سے زیادہ خطرناک سمندروں کے

پانی کی آلودگی ہے۔ چونکہ کئی ایک خلیوں والے جانور جنھیں پلانکٹون
کہا جاتا ہے اور جو سمندر کی سطح پر ہوا کے متّصل زندگی بسر کرتے ہیں اور
کُرّۂ خاک کی ۹۰ فی صد آکسیجن وہ مہیّا کرتے ہیں سمندر کی آلودگی
کے نتیجے میں مر رہے ہیں لہٰذا ان کے مرنے اور نابود ہو جانے کی بناپر زمین
کی ہوا میں ان دنوں آکسیجن میں دس فی صد کمی واقع ہو رہی ہے اور یہ مقدار
نہ تو انسانوں سمیت جانوروں کے سانس لینے کے لیے کافی ہے اور نہ
ہی سبزیوں کے سانس لینے کے لیے کافی ہے۔ پس اس کے نتیجے میں سبزیوں
اور جانوروں کی نسلیں ناپید ہو رہی ہیں اور یہ ایک تھیوری نہیں ہے تاکہ
کہا جائے کہ اس کے صحیح اور غلط ہونے کا احتمال برابر برابر ہے بلکہ ایک
علمی تخمینہ ہے۔ اِن دنوں سمندر جس طرح آلودہ ہو رہے ہیں اس کے
نتیجے میں آئندہ پچاس سال میں پلانکٹون کی تعداد سطح سمندر پر آدھی رہ
جائے گی اور اسی نسبت سے آکسیجن کی پیداوار کی مقدار کم ہو جائے گی۔"

"جو بچّہ آج پیدا ہوا ہے آئندہ پچاس سال میں (اگر وہ اس وقت تک
زندہ رہا تو) اس کے سانس لینے کا انداز ایسا ہوگا جیسے کہ ایک کوہ پیما
سانس لینے کے آلے کے بغیر کوہ ہمالیہ کی چوٹی پر (جو کہ دنیا کا بلند ترین
پہاڑ ہے) سانس لے رہا ہو اور اگر سمندروں کا پانی آلودہ ہونے کا
عمل جاری رہا تو اس کے بعد آنے والے پچاس سالوں میں تمام بنی نوعِ
انسان اور دوسرے جانداروں کے سانس لینے کی وضع ایسی ہوگی جیسے
کہ انھیں اختلاجِ قلب کا عارضہ ہو۔"

"اس کے بعد آنے والے پچاس سالوں میں اگر کوئی شخص سگار سلگانے
کے لیے یا اپنے گھر کا چولھا روشن کرنے کے لیے دیا سلائی جلائے گا

تو وہ نہیں جلے گی کیونکہ ہوا میں آکسیجن کی مقدار دیا سلائی جلانے کے لیے ناکافی ہوگی اور یہ کوئی علمی افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ امام جعفر الصادق علیہ السّلام کے اس ارشاد پر توجّہ نہ دینے سے کہ : ”انسان کو اپنے ماحول کو آلودہ نہیں کرنا چاہیئے“۔ ایک دولتمند قوم کن مشکلات سے دوچار ہوتی ہے ہم جاپان کی مثال لیتے ہیں موجودہ دور میں جاپان موٹر کاروں، کمپیوٹروں اور ریان کے کپڑوں (یعنی وہ کپڑے جو مصنوعی ریشے (سلولوز) سے بُنے جاتے ہیں) کی تیّاری کے معاملے میں امریکہ کے بعد اوّل نمبر پر ہے اور جہازوں، ریڈیو، ٹرانزسٹر ریڈیو، ٹیلیویژن فوٹو گرافی کے آلات اور موٹر سائیکلوں کی تیاری کے سلسلے میں دنیا کا اوّلین ملک شمار ہوتا ہے۔

یہاں اگر ہم یہ بتائیں کہ جاپان کس طرح ایک قلیل مدّت میں صفر کے درجے سے صنعت اور تجارت کے اس مقام تک پہنچ گیا تو ہم ماحول کی آلودگی سے متعلّق موضوعِ بحث سے ہٹ جائیں گے لہٰذا ہم بہت مختصر طور پر کہتے ہیں کہ دو بنیادی عوامل ایسے تھے جو اتنے کم عرصے میں جاپان کے اس رُتبے پر پہنچنے کا موجب بنے۔ اوّل حُسنِ انتظام اور دوّم جاپانی کاریگروں کا اپنے کام کے سلسلے میں پُرخلوص رویّہ لیکن چونکہ اس دولتمند اور محنتی قوم نے ماحول کی آلودگی سے بچنے کی جانب توجّہ نہیں دی اس لیے وہ اب نہ صرف بہت بڑی مشکلات سے دوچار ہے بلکہ ماحول کی آلودگی کی وجہ سے اس کے معاشرے کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی ہے اور جاپان میں ایسی بیماریاں پیدا ہوگئی ہیں جن کی علمِ طِب کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ انسان کچھ عرصے سے ماحول اور بالخصوص زمین، دریاؤں

اور سمندر کو آلودہ کرنے کے خطرات کو سمجھنے لگے ہیں لیکن امام جعفر الصّادق علیہ السّلام جیسے زمانۂ گزشتہ کے دانشمند بارہ سو سال پہلے اس بات کو جان گئے تھے کہ بنی نوعِ انسان کو اس طرح زندگی گزارنی چاہیئے کہ اپنے ماحول کو آلودہ نہ کریں۔"

یہ تھا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے علمی آثار کے چند حصّوں کے بارے میں اسٹراسبورگ کے محقّقین کے ادارے کے نظریات کا ایک نمونہ جو ہم نے مجلّہ خواندنیہا سے نقل کیا ہے۔

مذکورہ بالا محقّقین نے فقط ہمارے چھٹے امام کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور اس قدر حیرت زدہ ہوئے ہیں جبکہ اگر وہ دوسرے ائمّہ علیہم السّلام کے آثار پر نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ وہ سب امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کی طرح علومِ الٰہی کا مخزن ہیں۔

اسلامی علوم و آثار میں قرآنِ مجید کے متن کا رُتبہ سب سے بلند ہے۔ یہ کتابِ مقدّس علمی مسائل سے پُر ہے اور دَورِ حاضر کے دانشمند اس کے فقط کچھ حصّے سمجھ سکے ہیں۔

عام کشش

کہا جاتا ہے کہ کششِ ثقل نیوٹن[1] (Issac Newton) نے دریافت کی اور اس دریافت کا موقع اس کے سیب کے درخت کے نیچے بیٹھنے اور ایک سیب کے درخت سے گرنے نے فراہم کیا جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ اجسامِ عالم میں ایک دائمی کشش موجود ہے اور بعد کے تجربات نے اس نظریے کی صحت کی تائید کر دی۔

تاہم اگر ہم قرآنِ مجید کی طرف رجوع کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس نے آج سے

---

[1] مشہور انگریز ریاضی داں اور ماہرِ فلکیات جو 'نور' کی تھیوری کا بانی ہے (۱۶۴۲-۱۷۲۷ میلادی)

چودہ سو سال پہلے دنیا میں اس قوت کی موجودگی کا اعلان اِن الفاظ میں کر دیا تھا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا... [1]

"اللہ وہ برحق معبود ہے جس نے آسمانی موجودات کو ان ستونوں پر کھڑا کیا جنھیں تم نہیں دیکھ سکتے۔"

اس آیت میں وضاحت کی گئی ہے کہ آسمانی کرّے غیر مرئی ستونوں پہ قائم ہیں اور ان ستونوں سے مراد یہی عام قوتِ کشش ہے۔

اس سلسلے میں بحث اور دوسرے شواہد کا تذکرہ زیادہ فرصت کا متقاضی ہے لہٰذا جو صاحبان اس میں مزید دلچسپی رکھتے ہوں انھیں چاہیئے کہ دانشوروں کی تحریر کردہ مفصّل کتابوں کا مطالعہ کریں۔ بعد میں ہم بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان مسائل پر دوبارہ بحث کریں گے۔

---

[1] سورۃ الرعد۔ آیت ۲

اسلام میں علمی مباحث

جو مباحث قرآنِ مجید اور دوسری اسلامی کتب میں وارد ہوئے ہیں اور دانشمندوں کی دسترس میں ہیں ان میں سے ہر ایک عمیق علمی مسائل پر حاوی ہے اور روشن خیال محققین نے ان میں سے چند ایک کے سمجھنے میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

ان کتابوں میں آج کل کی مروجہ اصطلاحات استعمال نہیں کی گئیں لیکن محققین جانتے ہیں کہ ان اصطلاحات کے عدمِ استعمال کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے کے لوگ انھیں سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور اسلام کے عالی قدر رہنماؤں نے عمیق علمی مطالب اُن الفاظ میں پیش کیے ہیں جنھیں اُس دور کے لوگ کسی حد تک سمجھنے پر قادر تھے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب دُوربین ایجاد نہیں ہوئی تھی، رصد گاہیں وجود میں نہیں آئی تھیں، کسی کو وسیع و عریض کائنات کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، جراثیم کا انکشاف نہیں ہوا تھا اور خوردبین بھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی۔ دانشمندوں نے بجلی کی قوّت کو مسخر نہیں کیا تھا اور اس سے وابستہ انکشافات میں سے کسی کا ظہور

نہ ہوا تھا۔

ایسے زمانے میں علمی حقائق کے اظہار کے لیے فضا سازگار نہیں تھی اور اشاروں کنایوں یا اس زمانے میں رائج عبارات اور اصطلاحات کا سہارا لیے بغیر ان کا بیان کرنا اور سمجھانا ممکن نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ خاندانِ رسالت اور ائمۂ معصومین علیہم السّلام کی علمی یادگاروں میں تمام علمی مسائل اُس زمانے کے لوگوں کے فہم کا اندازہ لگاتے ہوئے اور ایسے الفاظ اور عبارات کی مدد لیتے ہوئے بیان کیے گئے ہیں جو اُن کی سمجھ میں آسکیں۔

گزشتہ بحث میں ہم نے '**مغزِ متفکّرِ جہانِ شیعہ**' میں سے چند ایسے اقتباسات پیش کیے تھے جن سے مذہبِ شیعہ کے چھٹے پیشوا امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے علوم کے ایک حصّے کے بارے میں پتا چلتا ہے اور چونکہ اس قسم کی بحثیں جو غیر جانبدار محقّقین اور دانشمندوں کے ایک گروہ نے سپردِ قلم کی ہیں پڑھنے والوں پر خاطر خواہ اثر ڈالتی ہیں اِس لیے اُس کتاب کے چند اور حصّے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

جیسا کہ پیشتر ذکر کیا گیا ہے مذکورہ کتاب کا ترجمہ آقائے منصوری نے مجلّہ '**خواندنیہا**' کی طرف سے کیا اور وہ اُسی مجلّہ میں مسلسل مقالات کی شکل میں چھاپی گئی۔

مذکورہ کتاب دانشمندوں اور محقّقین کے ایک ایسے گروہ (مرکزِ مطالعاتِ اسلامی اسٹراسبورگ) کے وسیلے سے تالیف کی گئی ہے جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی شعبۂ علم کا ماہر ہے اور جو سب کے سب عیسائی ہیں۔

یہ مرکز فرانس کے صوبہ آلزاس کے دارالحکومت اور دریائے روئن کے کنارے واقع شہر اسٹراسبورگ میں قائم کیا گیا ہے اور اسلامی مسائل، آثار اور علوم کے بارے مطالعہ اور تحقیق کا کام کرتا ہے۔ مذکورہ کتاب کو انھوں نے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام

کے آثار کے مطالعے کے لیے مخصوص کیا ہے۔

ذیل میں مذکورہ کتاب کے چند حصّے نقل کیے جاتے ہیں:

نوزائیدہ بچّے کو ماں کی بائیں طرف رکھنا چاہیے

امام جعفر الصّادقؑ کے علمی تبحّر کا ایک ثبوت اُن کی جانب سے ماؤں کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے شیر خوار بچّوں کو اپنی بائیں جانب لٹائیں۔

آپ کی یہ ہدایت صدیوں تک ایک بے موقع سفارش سمجھی جاتی رہی اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اس کی افادیّت کو سمجھنے سے قاصر تھے اور بعض تو اس پر عمل کرنا خطرناک سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ اگر شیر خوار بچے کو ماں کی بائیں جانب لٹایا جائے تو ممکن ہے کہ ماں سوتے میں پہلو بدلے اور بچّے کو اپنے بدن کے نیچے دبا کر اس کا دم گھونٹ دے۔

محمّد بن ادریس شافعی نے، جو ۱۵۰ھ ہجری میں یعنی امام جعفر الصّادقؑ کی وفات کے دو سال بعد غزہ میں پیدا ہوا اور ۱۹۹ھ ہجری میں قاہرہ میں فوت ہوا، دریافت کیا گیا کہ کیا ماں کو اپنے شیر خوار بچّے کو دائیں جانب لٹانا چاہیے یا بائیں جانب؟ اس نے جواب دیا کہ دائیں اور بائیں سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ماں اُسے دونوں میں سے جو آرام دہ ہو اس جانب لٹا سکتی ہے۔

بعض لوگ امام جعفر الصّادقؑ کے ارشاد کو عقلِ سلیم کے منافی سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق دائیں جانب، بائیں جانب سے زیادہ قابلِ احترام تھی۔ اس بنا پر وہ کہتے تھے کہ ماں کو چاہیے کہ بچّے کو اپنی دائیں جانب لٹائے تا کہ بچّہ دائیں جانب کی برکتوں سے

بہرہ مند ہو۔

مشرق یا مغرب میں کہیں بھی امام جعفر الصّادق ؑ کے ارشاد کو کوئی اہمیّت نہیں دی گئی حتیٰ نشاۃِ ثانیہ کے دور میں بھی جب دانشمندوں نے ہر علمی موضوع کو تنقیدی نگاہ سے موردِ توجّہ قرار دیا امام جعفر الصّادق ؑ کے قول کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور کسی نے بھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ آیا علمی نقطۂ نگاہ سے اس قول کی کوئی قدر و قیمت اور فائدہ ہے یا نہیں۔

سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں (میلادی) صدیاں جو نشاۃِ ثانیہ کا دور تھا گزر گیئں اور انیسویں صدی میلادی آپہنچی۔ اِس صدی کے دوسرے نصف میں امریکہ میں کورنیل یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس نے کام شروع کر دیا۔

کورنیل یونیورسٹی کے بانی عزرا کورنیل نے جس کا شیر خوارگی اور بچپن کا زمانہ بڑی تکلیف میں گزرا تھا اس یونیورسٹی میں نوزائیدہ اور شیر خوار بچوں کے بارے خصوصی تحقیق کے لیے ایک انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

پڑھائی شروع ہونے کے پہلے سال میں ہی کورنیل یونیورسٹی کی جانب سے یہ انسٹیٹیوٹ وجود میں آگئی اور اسے میڈیکل کالج میں ضم کر دیا گیا۔ اب ایک صدی سے زیادہ عرصے سے یہ انسٹیٹیوٹ نوزائیدہ اور شیر خوار بچّوں کے بارے میں تحقیق میں مصروف ہے۔

نوزائیدہ اور شیر خوار بچّوں کے مسائل کے متعلّق کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں یہ انسٹیٹوٹ تحقیق نہ کرتی ہو اور دنیا کا کوئی علمی مرکز ایسے بچّوں کے بارے میں اس انسٹیٹیوٹ جتنی معلومات نہیں رکھتا۔

یہ محال ہے کہ نوزائیدہ اور شیر خوار بچّوں کے متعلق کوئی موضوع وجود رکھتا ہو اور یہ انسٹیٹیوٹ اس کے بارے میں تحقیق نہ کرے حتّٰی کہ اس نے ان تختیوں کے بارے میں بھی تحقیق کی ہے جن پر ایسے بچّوں کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔

موجودہ صدی کے پہلے نصف میں اس انسٹیٹیوٹ کے محقّقین نے دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں موجود نوزائیدہ بچّوں کی تصویریں دیکھیں اور دنیا کے مشہور عجائب گھروں کی ان ۴۶۶ تصاویر میں سے جو اُن کی نظر سے گزریں انھوں نے ملاحظہ کیا کہ اُن میں اکثریت اُن تصاویر کی ہے جن میں ماؤں نے بچّوں کو اپنی بائیں بغل میں لے رکھا ہے۔

۳۷۳ تصویروں میں ماؤں نے بچّوں کو بائیں بغل میں لے رکھا تھا اور ۹۳ نے دائیں بغل میں لے رکھا تھا۔ اس بنا پر ہر اُن سو تصویروں میں سے جو مشہور عجائب گھروں میں دیکھنے میں آئیں ۸۰ تصویروں میں ماؤں نے بچّوں کو بائیں بغل میں لے رکھا تھا۔

نیویارک کی ریاست میں چند زچّہ خانے کورنیل یونیورسٹی کے نوزائیدہ اور شیر خوار بچّوں کے تحقیقی مرکز سے وابستہ ہیں اور جو ڈاکٹر ان زچّہ خانوں میں کام کرتے ہیں وہ اپنے مطالعات اور معائنات کے نتائج اُس مرکز کو بھیج دیتے ہیں۔

ایک طویل مدّت کے دوران اُن ڈاکٹروں کی جانب سے جو رپورٹیں تحقیقاتی مرکز کو موصول ہوئی ہیں ان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ پیدائش کے بعد ابتدائی ایّام میں جب نوزائیدہ بچّے کو ماں کے بائیں جانب لٹایا جاتا ہے تو وہ دائیں جانب لٹائے جانے والے بچّے کے

مقابلے میں زیادہ آسودہ رہتا ہے اور اگر اسے ماں کی دائیں جانب لٹایا جائے تو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد نیند سے جاگ اُٹھتا ہے اور رونے لگتا ہے۔

تحقیقاتی مرکز کے محققین نے اپنے مطالعات کو سفید رنگت والے امریکیوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ یہ پتا چلانے کا فیصلہ کیا کہ آیا یہ بات سیاہ اور زرد نسل کے لوگوں پر بھی صادق آتی ہے یا نہیں۔

ایک طویل تحقیق کے بعد انھیں پتا چلا کہ یہ بات تمام قوموں پر صادق آتی ہے اور ہر جگہ نوزائیدہ بچے بالخصوص اپنی پیدائش کے ابتدائی ایام میں اگر ماں کی بائیں جانب لیٹیں تو دائیں طرف لیٹنے کے مقابلے میں زیادہ آرام میں رہتے ہیں اور یہ حقیقت گوری نسل کے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اس کا اطلاق ساری دنیا پر ہوتا ہے۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز نے اس موضوع کا مطالعہ مسلسل جاری رکھا۔ تحقیقاتی مرکز کے ڈاکٹر گھنٹوں اشعۂ مجہول (ایکس ریز X -rays) کے ذریعے حاملہ عورت کے پیٹ کا معائنہ کرتے رہتے تاکہ جنین کو ماں کے پیٹ میں دیکھ سکیں۔ تاہم جب تک ہولوگرافی[1] ایجاد نہیں ہوئی،

---

[1] عام فہم لفظوں میں ہولوگرافی کے معنی بہت ہی چھوٹی چیزوں کی فوٹوگرافی اور سہ بُعدی فوٹوگرافی کے ہیں۔ ہولوگرافی کے ذریعے نہ صرف بہت ہی چھوٹی چیزوں کی فوٹو لی جاسکتی ہے بلکہ آواز کی فلم بھی تیار کی جاسکتی ہے اور آواز کی موجیں فوٹوگرافک فلم پر دائروں میں اور منظّم بیضوی شکل میں نظر آتی ہیں اور ہولوگرافی چھوٹی چیزوں کی تصویر اتارنے پر اس حد تک قادر ہے کہ خون میں موجود ایک سفید یا سُرخ جسیمہ (Globule) ایک ہاتھی جتنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔

جنین کے دیکھنے سے ان کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔

ہولوگرافی کی ایجاد کے بعد تحقیقاتی مرکز کے ڈاکٹروں نے منصوبہ بنایا کہ اس حالت میں کہ اشعۂ مجہول نے جَنین کو ماں کے پیٹ میں روشن کر رکھا ہو اس کی فوٹو لے لی جائے۔ اُس وقت انھوں نے دیکھا کہ ماں کے دل کی دھڑکن کی موجیں جو تمام بدن میں بٹ جاتی ہیں جَنین کے کانوں تک پہنچ رہی ہیں۔

اس مرحلے کے بعد اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ یہ پتا چلائیں کہ ماں کے دل کی دھڑکنوں کے رُکنے پر جَنین پر کوئی رد عمل ہوتا ہے یا نہیں۔

چونکہ وہ ماں کے دل کی حرکت نہیں روک سکتے تھے (کیونکہ ایسا کرنے سے ماں اور جنین دونوں کی موت واقع ہو جاتی) اس لیے انھوں نے یہ تحقیق پستان دار جانوروں پر جاری رکھّی اور جب بھی وہ ایسے جانور کا دل ساکن کرتے جس کے رِحم میں جنین ہوتا تو انھیں پتا چلتا کہ جَنین پر اس کا ردِّ عمل ہوا ہے۔

پستان دار جانوروں کی چند اقسام پر مکرّر تجربات نے ثابت کر دیا کہ جب ماں کے دل کی دھڑکن رُک جاتی ہے تو جنین پر اس کا ردِّ عمل ہوتا ہے اور ماں کے مر جانے پر جَنین بھی مر جاتا ہے کیونکہ جنین ماں کے دل کے خون سے غذا حاصل کرتا ہے جو اسے بڑی شریان کے ذریعے پہنچتا ہے جسے آئورٹ کہا جاتا ہے اور جب ماں کے دل کی حرکت بند ہو جائے تو غذا جنین کو نہیں ملتی اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز کے ماہرین نے متعدّد تجربات

کے بعد یہ پتا چلایا کہ ماں کے پیٹ میں نہ صرف یہ کہ بچّہ اس کے دل کی دھڑکنیں سُننے کا عادی ہو جاتا ہے بلکہ ان دھڑکنوں کا تعلّق اس کی زندگی سے بھی ہے اور جب یہ دھڑکنیں جاری نہیں رہتیں تو بچّہ ماں کے پیٹ میں بھوک سے مر جاتا ہے۔

بچّہ ماں کے دل کی دھڑکن سُننے کی جو عادت پیدائش سے قبل پیدا کر لیتا ہے وہ اس میں اس قدر راسخ ہو جاتی ہے کہ اگر وہ پیدائش کے بعد بھی ماں کے دل کی دھڑکن کی آواز نہ سُنے تو مضطرب ہو جاتا ہے نوزائیدہ بچّے کا ہوش ماں کے دل کی دھڑکن کو بخوبی پہچان سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب نوزائیدہ بچّہ ماں کی بائیں جانب لیٹتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن سُنتا ہے تو راحت محسوس کرتا ہے لیکن دائیں جانب چونکہ وہ آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچتی اس لیے مضطرب ہو جاتا ہے۔

اگر کورنیل یونیورسٹی کا بانی نوزائیدہ اور شیر خوار بچّوں کے لیے اس یونیورسٹی میں ایک تحقیقاتی مرکز قائم نہ کرتا اور وہ مرکز ایسے بچّوں کے بارے میں مسلسل تحقیق نہ کرتا تو یہ پتا نہ چلتا کہ امام جعفر الصّادقؑ نے شیر خوار بچّوں کو بائیں جانب لٹانے کے بارے میں ماؤں کو جو ہدایت فرمائی ہے اس میں کیا مصلحت اور فائدہ پوشیدہ ہے۔

آجکل شیر خوار بچّوں کی ان تمام پرورش گاہوں میں جو کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز سے وابستہ ہیں جس کمرے میں نوزائیدہ بچّے لیٹے ہوئے ہوں اس میں ایک آلہ ہوتا ہے جو ماں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز پیدا کرتا ہے اور ہر نوزائیدہ بچّے کے پلنگ کے نیچے ایک آواز گیر (ریسیور)

لگا ہوتا ہے جو ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کو بچّوں کے کانوں تک پہنچاتا ہے۔

ایک بالغ انسان (عورت یا مرد) کا دل عموماً ایک منٹ میں بہتر بار دھڑکتا ہے۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز سے وابستہ شیر خوار بچّوں کی پرورش گاہوں میں بارہا آزمایا گیا ہے کہ اگر ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی تعداد ۱۱۰ یا ۱۲۰ فی منٹ ہو جائے تو کمرے میں موجود تمام بچّوں کے رونے کی آواز سُنائی دینے لگتی ہے اور اس مقصد کے حُصول کے لیے کہ بچّے مضطرب نہ ہوں اور چیخنے چلّانے نہ لگیں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی تعداد ۷۲ فی منٹ ہونی چاہیئے۔

تحقیقاتی مرکز سے وابستہ شیر خوار بچّوں کی پرورش گاہوں میں کئی دفعہ یہ تجربہ کیا گیا کہ بعض نوزائیدہ بچّوں کو ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا جس میں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی آواز ان کے کانوں تک پہنچتی تھی اور بعض کو ایسے کمروں میں رکّھا گیا جہاں وہ یہ آواز نہیں سُن سکتے تھے۔ جب بھی یہ تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جس کمرے میں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی آواز سُنائی دیتی ہے اس کمرے میں موجود بچّوں کا وزن دوسرے کمرے والے بچّوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھتا ہے۔ دونوں کمروں میں بچّوں کو جو غذا دی جاتی ہے وہ ایک جیسی ہوتی ہے لیکن جس کمرے میں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں سُنی جا سکتی ہیں اس کمرے کے بچّے زیادہ بھوک کے ساتھ غذا کھاتے ہیں اور جس کمرے میں یہ دھڑکنیں نہیں سُنی جا سکتیں اس کے بچّوں کو کم بھوک لگتی ہے۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز سے وابستہ شیر خوار بچّوں کی پرورش گاہ میں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی شدّت کے بارے میں بھی تحقیق کی گئی ہے اور پتا چلا ہے کہ اگر وہ آواز ماں کے دل کی دھڑکن کی فطری آواز سے شدید تر ہو تو بچّے بے چین ہو جاتے ہیں اور رونا شروع کر دیتے ہیں۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز کا ایک ڈاکٹر جو مختلف برّاعظموں میں سفر کر رہا تھا یہ جاننے کی جستجو میں تھا کہ مختلف ممالک میں مائیں راستہ چلتے ہوئے بچّوں کو آغوش میں کس طرح لیتی ہیں۔ یہ ڈاکٹر جس کا نام 'لی سالک' ہے اور جو اِن دنوں کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقاتی مرکز میں اپنے کام میں مشغول ہے کہتا ہے کہ دنیا کے تمام برّاعظموں میں اکثر عورتیں راستہ چلتے ہوئے اپنے بچّوں کو بائیں جانب بغل میں لیتی ہیں۔

جو عورتیں اپنے بچّوں کو دائیں جانب بغل میں لیتی ہیں وہ اکثر بائیں ہاتھ سے کام کرتی ہیں۔ بالخصوص اگر وہ کھانے پینے کے سامان کا تھیلا اٹھائیں تو بچّوں کو دائیں جانب آغوش میں لیتی ہیں تاکہ بائیں ہاتھ سے وہ تھیلا آسانی سے اُٹھا سکیں۔

تحقیقاتی مرکز سے وابستہ زچّہ خانے میں آنے والی جو عورتیں وضعِ حمل کے بعد وہاں سے جانے لگتی ہیں اور اپنے بچّوں کو بائیں جانب بغل میں لیتی ہیں ڈاکٹر لی سالک ان سے سوال کرتا رہتا ہے کہ کیا تم جانتی ہو کہ تم اپنے نوزائیدہ بچّوں کو بائیں جانب بغل میں کیوں لیتی ہو؟ تاہم ابھی تک کسی عورت نے اُسے یہ جواب نہیں دیا کہ میں ایسا اس لیے کرتی ہوں کہ دل سینے کے بائیں طرف ہے اور اس کی دھڑکنوں کی

آواز سُننا نوزائیدہ بچّوں کے لیے مفید ہے۔ مائیں یہ جانے بغیر کہ وہ بدن کے بائیں طرف کو کیوں ترجیح دیتی ہیں بچّوں کو بائیں جانب بغل میں لیتی ہیں۔

حتّٰی کہ افریقہ کے سیاہ رنگت والے قبیلوں کی عورتیں جب بچّوں کو پیٹھ پر نہیں اُٹھاتیں تو اُنھیں بدن کی بائیں جانب سینے سے چمٹا لیتی ہیں اور افریقہ کے تمام سیاہ فام قبائل کی عورتیں جانتی ہیں کہ جب بھی وہ نوزائیدہ بچے کو بائیں جانب سینے سے لگاتی ہیں تو وہ بہتر طور پر دودھ پیتے ہیں اور بچّے کی دودھ پینے کی خواہش دائیں پستان کی نسبت بائیں پستان سے زیادہ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر لی سالک نے ماؤں سے سُنا ہے کہ رات کے وقت جب بچے کو بھوک لگتی ہے تو وہ اندھیرے میں حیرت انگیز تیزی سے ماں کا بایاں پستان ڈھونڈ نکالتا ہے اور منہ پستان سے لگا کر دودھ پیتا ہے۔

وہ حیران ہوتی ہیں کہ اندھیرے میں اور ماں کا پستان دیکھے بغیر بچّہ کس طرح اتنی تیزی سے اپنا مُنہ پستان سے لگا دیتا ہے۔

ڈاکٹر لی سالک نے ماؤں کے لیے وضاحت کی ہے کہ رات کی تاریکی میں ماں کے پستان سے دودھ پینے کے لیے رہنما اس کے دل کی دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بچّہ جب ماں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سنتا ہے تو براہِ راست اور بغیر کسی شک وشبہ کے اس کے پستان کا پتا چلا لیتا ہے اور اپنا مُنہ اُس پر رکھ دیتا ہے۔

روشنی اور بیماریوں کا پھیلاؤ

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے ان نظریات میں سے جو آپ

کا علمی تجزیہ ثابت کرتے ہیں ایک نظریہ یہ ہے کہ بعض روشنیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے ذریعے بیماری ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقل ہو جاتی ہے۔

امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ بعض ایسی روشنیاں ہیں جو اگر ایک بیمار شخص سے ایک صحت مند شخص پر پڑیں تو ممکن ہے کہ صحت مند شخص کو بیمار کر دیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ذکر ہوا یا جراثیم کی منتقلی کا نہیں (جن کے متعلق دوسری صدی ہجری کے پہلے نصف میں لوگوں کو کوئی علم نہ تھا) بلکہ روشنی کا ہے اور وہ بھی سب روشنیوں کا نہیں بلکہ بعض ایسی روشنیوں کا جو اگر بیمار شخص سے تندرست شخص پر پڑ جائیں تو ممکن ہے کہ اُسے بیمار کر دیں۔

حیاتیات اور طب کے علماء اس نظریے کو خرافات میں شمار کرتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ بیماری ایک بیمار شخص سے تندرست شخص کو جراثیم یا وائرس کے ذریعے منتقل ہوتی ہے خواہ اس منتقلی کا باعث حشرات ہوں یا پانی یا ہوا یا بیمار اور تندرست اشخاص کا براہِ راست اتصال ہو۔

جراثیم اور وائرس کے بارے میں علم حاصل ہونے سے پہلے بُو کو بیماری کی منتقلی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور زمانۂ قدیم میں بیماریوں کو سرایت کرنے سے روکنے کی بُنیاد بُو کو روکنے پر تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ ایک وبائی بیماری کی بُو ایک بیمار شخص سے کسی تندرست شخص تک نہ پہنچے اور اسے بیمار نہ کر دے۔

کسی دَور میں بھی کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ بعض روشنیاں اگر کسی بیمار شخص سے تندرست شخص پر پڑیں تو اسے بیمار کر دیتی ہیں اور یہ قول امام جعفر الصادق علیہ السّلام کا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے سبھی دانشور اس نظریے کو خُرافات میں شمار کرتے تھے حتّٰی کہ جدید علمی تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ یہ نظریہ حقیقت پر مبنی ہے اور اگر بعض روشنیاں بیمار شخص سے صحت مند شخص کو منتقل ہو جائیں تو اسے بیمار کر دیتی ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک پہلی مرتبہ سوویٹ یونین میں ہوا۔

سوویٹ یونین کے شہر نوو۔ وو۔سیبیرسک میں جو سوویٹ سائبیریا کے بڑے طبّی، کیمیائی اور حیاتیاتی مراکز میں سے ایک مرکز ہے، سائنسی اور ناقابلِ تردید طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ پہلے تو بیمار شخص کے خلیوں سے شعاعیں خارج ہوتی ہیں اور پھر بیمار شخص کے خلیوں سے خارج ہونے والی کچھ شعاعیں جب تندرست خلیوں پر پڑتی ہیں تو انھیں بیمار کر دیتی ہیں۔ اس صورت میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بیمار اور تندرست خلیوں میں معمولی سا بھی اتّصال ہوا ہو یا جراثیم یا وائرس بیمار خلیوں سے تندرست خلیوں میں سرایت کر جائیں۔

جو ماہرین نوو۔ وو۔سیبیرسک میں تحقیق میں مشغول تھے ان کے طرزِ عمل کی شکل یہ تھی۔

انھوں نے ایک زندہ موجود کے ہم شکل خلیوں کے دو دستوں کا انتخاب کیا اور انھیں ایک دوسرے سے جُدا کر دیا اور دیکھا کہ ان خلیوں میں سے کتنی اقسام کے فوتون (روشنی کا ایک ذرّہ) خارج

ہوتے ہیں۔

سوویت ماہرین نے ایک موجود جاندار سے ملتے جلتے خلیوں کے دو دستوں کا انتخاب کرکے اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک دستے کو بیمار کر دیا تاکہ اس امر کا مشاہدہ کریں کہ آیا بیماری کی حالت میں بھی خلیوں سے شعاعیں خارج ہوتی ہیں یا نہیں اور انہیں پتا چلا کہ بیماری کی حالت میں بھی خلیوں سے فوتون خارج ہوتے ہیں۔

ماہرین نے خلیوں کے دوسرے یعنی صحّت مند دستے کو دو ڈبوں میں ڈال دیا جن میں سے ایک کوارٹز کا بنا ہوا تھا (جس کا دوسرا نام سلیکا ہے) اور دوسرا شیشے کا بنا ہوا تھا۔

کوارٹز کی یہ خاصیّت ہوتی ہے کہ ماورائے بنفش (Ultra Violet) شعاعوں کے علاوہ کسی کی فوتون یعنی کسی قسم کی شعاع اس میں سے نہیں گزر سکتی۔

معمولی شیشے کی یہ خاصیّت ہوتی ہے کہ ماورائے بنفش شعاعوں کے علاوہ ہر قسم کی فوتون یعنی ہر قسم کی شعاع اس میں سے گزر سکتی ہے۔

جب کوارٹز اور شیشے کے دو ڈبّوں میں موجود تندرست خلیوں پر چند گھنٹوں کے لیے بیمار خلیوں کی شعاعیں ڈالی گئیں تو پتا چلا کہ صحّت مند خلیوں کا جو حصّہ کوارٹز کے ڈبّے میں تھا وہ بیمار ہو گیا لیکن جو حصّہ شیشے کے ڈبّے میں تھا وہ بیمار نہ ہوا۔

مختلف بیماریوں اور ملتے جلتے مختلف خلیوں کے ذریعے یہ تجربہ بیس سال کی مدّت میں پانچ ہزار بار دہرایا گیا کیونکہ نوو۔وو سیبیرسک کے تحقیقاتی مرکز کے ماہرین یہ نہیں چاہتے تھے کہ تجربے کے نتیجے میں رتّی بھر

شک کی گنجائش بھی باقی رہ جائے۔ ان سب تجربات کا نتیجہ ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ بیمار خلیے ماورائے بنفش شعاعوں سمیت کئی قسم کی شعاعیں خارج کرتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ جب کبھی صحت مند خلیے بیمار خلیوں سے خارج ہونے والی ماورائے بنفش شعاعوں (دوسری ماورائے بنفش شعاعیں نہیں) کے سامنے آتے ہیں بیمار ہو جاتے ہیں اور مزید یہ کہ انھیں وہی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جو مریض خلیوں کو ہوتی ہے۔

بیس سال کی مدت پر پھیلے ہوئے ان تمام تجربات کے دوران تندرست خلیوں اور بیمار خلیوں کے مابین کسی قسم کا قرب یا رابطہ قائم نہیں تھا کہ یہ تصور کیا جائے کہ وائرس یا جراثیم ایک دستے سے دوسرے دستے میں سرایت کر گئے ہوں گے۔ چنانچہ پانچ ہزار تجربوں کے بعد محققین پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ تندرست خلیوں میں بیماری کی وجہ وہ ماورائے بنفش شعاعیں ہیں جو بیمار خلیوں سے خارج ہو کر ان پر پڑتی ہیں۔

سوویت دانشمندوں نے جو تجربات کیے ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے بدن کا ہر خلیہ ایک برآمد کرنے والے اور درآمد کرنے والے کی مانند ہے کیونکہ وہ شعاعیں خارج بھی کرتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے اور انھیں جذب بھی کرتا ہے۔

یہ بات تفصیل کی محتاج نہیں کہ اس سائنسی حقیقت نے جو بیس سال کی مدت میں پانچ ہزار تجربات کرنے کے بعد پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے ماہرینِ حیات اور اطبا کے لیے بیماریوں کے معالجے کی ایک نئی راہ کھول دی ہے۔

امریکہ میں بھی اس میدان میں تحقیقات ہوئی ہیں اور سوویٹ ماہرین

کے حاصل کردہ نتائج سے ملتے جلتے نتائج برآمد ہوئے ہیں جو امریکہ کے علمی مجلّات میں شائع کیے گئے ہیں اور ایک محقق نے جس کا نام ڈاکٹر 'جوہن اوت' ہے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے پہلے نصف میں امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کا نظریہ کہ بعض روشنیاں بیماریوں کی پیدائش کا سبب بنتی ہیں جسے اب تک خُرافات کا جُزو سمجھا جاتا تھا حقیقت پر مبنی ہے اور موجودہ زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ جب ماورائے بنفش شعاعیں بیمار جانداروں سے خارج ہو کر تندرست جانداروں پر پڑتی ہیں تو انھیں بیمار کر دیتی ہیں جب کہ دوسری ماورائے بنفش شعاعیں اور بالخصوص سورج کی ماورائے بنفش شعاعیں جب جانداروں پر پڑتی ہیں تو ان کی بیماری کا موجب نہیں ہوتیں۔

سورج کی ماورائے بنفش شعاعیں اگر ہوا کے طبقے کی عدم موجودگی میں جانداروں پر پڑیں اور ان کے بدن اور شعاعوں کے درمیان کوئی مزاحمت نہ ہو تو یہ شعاعیں جانداروں کی ہلاکت کا سبب بن جائیں لیکن یہی شعاعیں جب ہوا کے طبقے سے گزر کر زمین تک پہنچتی ہیں تو کسی جاندار کو بیمار نہیں کرتیں۔

بہرصورت جدید حیاتیات اور طب کے اکتشافات نے ساڑھے بارہ سو سال بعد امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے نظریے کی صحّت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

دُوسری دُنیاؤں کے عُلوم

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام سے جو سوالات کیے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کس شخص کو دانائے مطلق کہا جاسکتا ہے اور کس موقع پر انسان محسوس کرتا ہے کہ اس نے ہر چیز سیکھ لی ہے۔

امام علیہ السّلام نے فرمایا کہ اس سوال کے دو حصّے کرنے چاہئیں اور ہر ایک کے بارے میں ہم سے علیٰحدہ دریافت کرنا چاہیئے۔

پہلا حصّہ جس کے بارے میں ہم سے سوال کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ دانائے مطلق کسے کہا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی دانائے مطلق کا وجود نہیں اور بنی نوعِ انسان میں سے کسی کا دانائے مطلق ہونا محال ہے کیونکہ علم اس قدر وسیع ہے کہ خواہ کسی کی عمر ہزارہا سال ہی کیوں نہ ہو اور وہ تحصیل علم میں مشغول رہے پھر بھی اس کے لیے ان تمام چیزوں کا سیکھنا ممکن نہیں جو سیکھی جاسکتی ہیں اور اگر ہزارہا سال زندہ رہنے کے بعد وہ اس دُنیا کے علوم سے واقف بھی ہو جائے تب بھی اِس دُنیا کے علاوہ اور دنیائیں بھی ہیں اور ان میں علوم وجود رکھتے ہیں اور جس شخص نے اِس دُنیا کے تمام علوم حاصل کرلیے ہوں اگر وہ دوسری دنیاؤں میں جائے تو وہ جاہل ہوگا اور اسے چاہیئے کہ وہاں پہنچ کر علم سیکھنا شروع کردے تاکہ اُس دُنیا کے عُلوم سے واقف ہوجائے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی دانائے مطلق کا وجود نہیں ہے کیونکہ انسان ہرگز تمام علوم سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔

امام جعفر الصادق علیہ السّلام کے شاگردوں نے سوال کا دوسرا حصّہ پیش کیا اور پوچھا کہ کون سے مرحلے پر انسان علم سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؟

آپ نے فرمایا کہ تمھارے اس سوال کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ اگر انسان ہزار ہا سال زندہ رہے اور ہمیشہ علم حاصل کرنے میں لگا رہے تب بھی وہ ان تمام چیزوں پر عبور حاصل نہیں کر سکتا جو جاننی چاہئیں لہٰذا کبھی بھی ایسا وقت نہیں آتا جب انسان یہ محسوس کرے کہ وہ علم سے بے نیاز ہو گیا ہے اور اس قسم کا احساس صرف انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو جاہل ہوں یعنی جو جاہل ہو وہ اپنے آپ کو علم سے بے نیاز سمجھتا ہے ۔

لوگوں نے امام علیہ السّلام سے پوچھا کہ دوسری دنیاؤں کے علم سے کیا مراد ہے ؟

آپ نے فرمایا کہ جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے علاوہ بھی دنیائیں ہیں جو اس سے بہت بڑی ہیں اور ان دُنیاؤں میں ایسے علوم ہیں جو اس دنیا کے علوم سے مختلف ہیں ۔

لوگوں نے پوچھا کہ ان دوسری دنیاؤں کی تعداد کیا ہے ؟

آپ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری دنیاؤں کی تعداد کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا ۔

لوگوں نے پوچھا : دوسری دنیاؤں کا علم اِس دنیا کے علوم سے کیوں کر مختلف ہے ؟ کیا علم سیکھنے کی چیز نہیں ہے ؟ اور جو چیز سیکھی جا سکتی ہے وہ اس دنیا کے علوم سے علاوہ کیونکر ہو سکتی ہے ؟

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا: دوسری دنیاؤں میں دو قسم کے علوم وجود رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک قسم تو اس دُنیا کے علوم سے ملتی جُلتی ہے اور اگر کوئی شخص اس دُنیا سے اُن دُنیاؤں میں جائے تو ان علوم کو حاصل کر سکتا ہے لیکن بعض دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم وجود رکھتے ہیں جو اس دنیا کے لوگوں کے فہم وادراک سے بالاتر ہیں کیونکہ ان علوم کو اِس دُنیا کے لوگوں کی عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔

امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کا یہ ارشاد بعد میں آنے والی نسلوں کے دانشمندوں کے لیے ایک معمّہ بنا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض اسے قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ امام علیہ السّلام نے جو کچھ اس موضوع پر کہا ہے اسے ماننا ممکن نہیں۔

جن لوگوں نے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے قول کی تردید کی ان میں سے ایک ابنِ راوندی اصفہانی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو چیز بھی علم ہو خواہ وہ اس دنیا کا علم ہو یا دوسری دنیاؤں کا علم ہو عقلِ انسانی اس کے ادراک پر قادر ہے۔

تاہم امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کے شاگردوں نے اپنے اُستاد کا قول قبول کیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ بعض دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم موجود ہیں جنھیں انسان نہیں سیکھ سکتا کیونکہ انسانی عقل ان کے ادراک پر قدرت نہیں رکھتی۔

لیکن موجودہ صدی میں جب آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے طبیعیات میں ایک نئے اور اچھوتے باب کا اضافہ کر دیا اور بعد میں نظریۂ وجود (ضدِ مادّہ) نظریے کی حدود سے گزر کر سائنس کے مرحلے میں

داخل ہوگیا اور دانشوروں پر یہ ثابت ہوگیا کہ مادّہ کی ضد بھی ہے تو امام جعفر الصّادقؑ کا یہ ارشاد کہ ''دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم بھی ہیں جنھیں حاصل کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں''، قابلِ فہم ہوگیا کیونکہ ضدِ مادّہ دنیا کے طبیعیاتی قوانین ہماری دنیا کے طبیعیاتی قوانین سے مختلف ہیں اور اس سے بڑھ کر وہاں کے منطق اور استدلال کے قوانین بھی ان قوانین سے مختلف ہوسکتے ہیں جنھیں ہماری عقل وضع کرسکے یا سمجھ سکے۔

دُنیائے ضدِ مادّہ ایک ایسی دُنیا ہے جس کے ایٹموں میں الیکٹرون چارج مثبت ہے اور پروٹون چارج (ایٹم کے مرکزے میں) منفی ہے جب کہ ہماری دنیا کے ایٹموں میں الیکٹرون چارج منفی ہے اور پروٹون چارج (ایٹم کے مرکزے میں) مثبت ہے۔

معلوم نہیں کہ جس دنیا میں ایٹم کے الیکٹرونوں کے چارج مثبت ہیں اور پروٹونوں کے چارج منفی ہیں وہاں کون سے طبیعیاتی قوانین کارفرما ہیں۔

ہماری منطق اور استدلال کے مطابق کُل، جُزو سے برتر ہے لیکن ممکن ہے کہ اُس دنیا میں جُزو، کُل سے برتر ہو اور ہماری عقل اس بات پر قادر نہیں کہ اس موضوع کو سمجھے اور قبول کرے۔

ہماری دنیا میں اگر ایک بھاری چیز کو پانی میں ڈبویا جائے تو ارشمیدس کے دریافت کردہ قانون کے مطابق وہ چیز پانی میں ہلکی ہو جاتی ہے لیکن ممکن ہے اس دُنیا میں اگر کسی چیز کو پانی یا کسی دوسری مائع چیز میں ڈالا جائے تو وہ بھاری ہو جائے۔

اس دُنیا میں پاسکال کے دریافت کردہ قانون کے مطابق

جب ایک برتن میں موجود کسی مائع چیز کے ایک نقطے پر دباؤ ڈالا جائے تو وہ دباؤ اس مائع کے تمام نقطوں پر پڑتا ہے اور اسی قانون سے استفادہ کرتے ہوئے وسائلِ نقلیہ اور بالخصوص بھاری وسائلِ نقلیہ کے لیے ہائیڈرالک بریک تیار کیے جاتے ہیں۔ بریک کے پیڈل پر ڈرائیور کے پاؤں کا دباؤ پڑنے سے کسی حد تک تیل پر بھی دباؤ پڑتا ہے اور چونکہ یہ دباؤ تیل کے تمام نقاط پر پڑتا ہے اس لیے ٹرک کے پہیّوں پر ہزار گنا دباؤ پڑ جاتا ہے اور انھیں ایک لحظے میں ساکن کر دیتا ہے۔

تاہم ممکن ہے کہ یہ طبیعیاتی قانون ضدِ مادّہ دنیا میں مؤثر نہ ہو اور جو دباؤ کسی مائع چیز کے ایک نقطے پر پڑے وہ دوسرے نقطوں پر نہ پڑے۔

اگر کوئی شخص اس دُنیا سے ضدِ مادّہ دنیا میں وارد ہو تو ممکن ہے کہ بتدریج وہ اُس دُنیا کے طبیعیاتی قوانین سے جو اس کے لیے غیر معمولی اور عجیب ہوں گے سمجھوتہ کرلے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فضانورد راکٹوں میں زمین کے گرد چکّر لگاتے وقت یا چاند پر قدم رکھتے وقت بے وزنی کی کیفیت سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں کیونکہ انھیں فضا میں بھیجنے سے پہلے بے وزنی کی زندگی کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔

لیکن جن چیزوں کو انسان ضدِ مادّہ دُنیا میں قبول نہیں کرسکتا وہ چیزیں وہ ہیں جو اس کے منطق اور استدلال کے قوانین کے خلاف ہوں اگر وہ اُس دنیا میں جزو کو کل سے برتر دیکھے اور اگر وہ مشاہدہ کرے کہ اس دُنیا کے لوگ اعداد کی جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے بارے میں ان چار عملوں کے بنیادی قواعد کی رعایت نہیں کرتے یا اگر اسے احساس ہو کہ خلا کا وجود نہ ہوتے ہوئے بھی حرارت پانی کو منجمد کر دیتی ہے اور

ٹھنڈک سے پانی بھاپ بن جاتا ہے تو وہ ان خلافِ عقل مظاہر کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہی وہ موقع ہے جب امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کا یہ نظریہ قابلِ قبول نظر آتا ہے کہ بعض دنیاؤں میں ایسے علوم ہیں جنھیں سیکھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً تو امام جعفر الصّادق علیہ السّلام علم کو لامحدود سمجھتے تھے اور ثانیاً وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم بھی ہیں جنھیں انسان اِس عقل وخرد کے ذریعے نہیں سمجھ سکتا جس کے ذریعے وہ اِس دنیا کے علوم حاصل کرتا ہے اور اب آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت اور نظریۂ ضدِ مادّہ کے بعد (جس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ نظریے کی حدود سے نکل کر سائنس کی حدود میں داخل ہو چکا ہے) یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج سے ساڑھے بارہ سو سال پہلے امام جعفر الصّادق علیہ السّلام نے صحیح نظریہ پیش کیا تھا۔

مندرجہ بالا نمونہ جو خاندانِ رسولؐ اور پیشوایانِ اسلام علیہم السّلام کے علوم کے بحرِ بیکراں میں سے ایک قطرے کی حیثیّت رکھتا ہے اس نکتے کو واضح کرتا ہے کہ ان کے علوم ایک ایسے منبع سے نکلتے ہیں جس تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہیں اور اہلبیتؑ کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کے وسیلے کے بغیر ان علوم سے کوئی فائدہ بھی نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

اسی طرح ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے اجراء اور اسلام کے نجات بخش احکامات پر عمل درآمد کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے کیونکہ اس کا ہر حکم کسی حکمت اور ہر دستور کسی فلسفے پر مبنی ہے اور ان احکام

سے سرتابی کی صورت میں ہم ایسے حوادث سے دوچار ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں ناقابلِ تلافی ثابت ہوں اور ہماری خوش بختی کی بنیاد ہی ڈھا دیں۔

بحث کے خاتمے پر ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ عامۃُ المسلمین کو رسولِ اکرم اور ان کے اہلِ بیتِ پاک علیہم السّلام کی رہنمائی کے ساتھ قرآنِ کریم کے احکام کی کامل پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ "آمین"

اسلام میں ایفائے عہد

وعدہ وفائی اور عہد و پیمان کا انجام دینا اُن صفات میں سے ہے جن کی ضرورت کو ہر انسان کی فطرت بخوبی سمجھتی ہے۔

ایفائے عہد کی قدر وقیمت اور ضرورت اور اسی طرح پیمان شکنی اور وعدوں سے بے اعتنائی برتنے کی قباحت اور خرابی ایسی چیزیں ہیں جن میں ہر نسل اور ہر قوم کا ہر فرد اور ہر دین اور مسلک کا پَیرو تمیز کر سکتا ہے حتیٰ کہ اگر ماں باپ اپنے بچوں سے کوئی وعدہ کرکے اسے پُورا نہ کریں تو بچّے فطرت کے تقاضے کے عین مطابق والدین کے اس فعل کو خراب اور نازیبا سمجھتے ہیں اور وہ اپنے انداز میں اُن کے اس فعل پر اعتراضات بھی وارد کرتے ہیں۔

ایفائے عہد کی اہمیّت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اس کے معاشرتی اثرات پر نظر ڈالی جائے اور پیمان شکنی اور وعدوں سے بے اعتنائی برتنے سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں ان کی جانب بھی توجّہ دی جائے۔

عہد و پیمان کا احترام ہر فرد، قوم اور ملک کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر براہ راست

اور ناقابلِ انکار اثر ڈالتا ہے جو معاشرہ اپنے عہد و پیمان اور قرار دادوں کا پابند ہو وہ زیادہ خوشحال ہوتا ہے اور انسانی معاشروں میں بیشتر عزّت اور اعتماد پیدا کر لیتا ہے۔

مالی اور اقتصادی امور ہر معاشرے کی زندگی کے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ارکان ہوتے ہیں۔ اگر لوگ مالی امور کے بارے میں کیے گئے وعدوں کا احترام کریں تو اس معاشرے کا معاشی پہیّہ بڑی آسانی سے گھومتا ہے اور اقتصادی سرگرمیاں بہترین شکل میں جاری رہتی ہیں۔ مقروض اپنا قرضہ مقرّرہ تاریخ کو ادا کر دیتا ہے اور قرضخواہ بھی پورے اعتماد اور اطمینان سے اپنا مال اس کے سپرد کر دیتا ہے یوں ہر شخص اپنے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر سکتا ہے اور دوسروں سے عہد و پیمان طے کر سکتا ہے۔

ایسے معاشرے میں لفظی قول و قرار معتبر ترین اسناد کا ہم پلّہ ہوتا ہے اور باہمی اعتماد اس معاشرے کی معاشیات میں ایک صحیح نظام پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن اگر کوئی قوم اس عظیم اخلاقی اور انسانی سرمائے سے محروم ہو جائے تو وہ ناقابلِ تلافی مصائب اور ناقابلِ برداشت مشکلات میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

ہزاروں لوگ بے گھر ہیں اور کرائے کے مکانوں کی تلاش میں ہیں اور ہزاروں گھر خالی ہیں اور ان کے مالک انھیں کرائے پر دینا چاہتے ہیں لیکن چونکہ باہمی اعتماد کا فقدان ہے اس لیے مکانوں کے مالکان بے اعتمادی کی بنا پر کرایہ داروں کو دینے کی بجائے اپنے گھروں کے خالی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بہت سا سرمایہ جامد ہے اور اس کے مالک ایسے لوگوں کی تلاش میں ہیں جن کے ساتھ مل کر وہ مشترکہ طور پر کوئی کام شروع کر سکیں اور بہت سے اشخاص کام کرنے کو تیّار ہیں لیکن ان کے ہاتھ خالی ہیں۔ وہ بھی ایک سرمایہ دار شریکِ کار کی تلاش میں ہیں لیکن چونکہ اعتماد نہیں ہے اس لیے سرمایہ دار غیر ذمّے دار اور ناقابلِ اعتماد شریکِ کار کی بجائے سرمائے کو جامد رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔

ان مسائل پر توجّہ دینے سے ایفائے عہد اور قرار دادوں کے احترام کی قدر و قیمت اور اہمیّت بخوبی واضح ہوجاتی ہے لیکن یہ گرانبہا سرمایہ اسی شخص کو میسّر آسکتا ہے جو مذہبی تربیّت سے بہرہ مند ہو کیونکہ وہ واحد عامل جو لوگوں کو اپنے وعدے پورے کرنے کا پابند کرتا ہے ایمان کی قوّت اور دینی تربیّت ہی ہے۔

قرآنِ مجید اور اسلامی روایات میں ایفائے عہد کو بے حد اہمیّت دی گئی ہے جس کا اندازہ تفاسیر اور اسلام کے عالی قدر پیشواؤں کے بیانات کے مطالعے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

اسلام نے ایفائے عہد کو ہر مسلمان کا حتمی وظیفہ اور با ایمان لوگوں کی علامت اور صفت قرار دیا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"یقیناً وہ اہلِ ایمان فلاح پانے والے ہیں جو نماز کی حالت میں خشوع و خضوع اختیار کرتے ہیں، امانتوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور اپنا عہد پورا کرتے ہیں"۔ [1]

ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے:

"عہد و پیمان کی وفاداری کرو اور جان لو کہ اس بارے میں تمھیں اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہونا ہوگا"۔ [2]

ساتویں امام موسیٰ الکاظم علیہ السلام رسول اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَہْدَ لَہٗ۔ [3]

"جو شخص اپنے عہد و پیمان کا پابند نہ ہو وہ دین نہیں رکھتا"۔

---

[1] سورۃ المومنون۔ آیات ۱، ۲ اور ۸ [2] سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۴

[3] نوادر راوندی۔ صفحہ ۵ ۔ بحار الانوار۔ جلد ۷۵۔ صفحہ ۹۶

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے:

مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَفِ اِذَا وَعَدَ [1]

"جو شخص اللہ اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ اگر کسی سے وعدہ کرے تو اُسے پورا کرے۔"

رسولِ اکرمؐ اپنی جوانی کے زمانے میں اور بعثت سے پہلے بھی عہد و پیمان کی پوری پوری پابندی فرمایا کرتے تھے۔

"عمّار نامی ایک جوان جو مکّے میں ریوڑ چرانے کا کام کرتا تھا نقل کرتا ہے کہ میں ہر روز اپنی بھیڑیں مکّے کے بیابانوں میں چرانے لے جایا کرتا تھا۔ حضرت محمدؐ بھی اپنی بھیڑیں لایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے آپ سے کہا کہ اُن دو پہاڑوں کے درمیان بڑی سر سبز و شاداب وادی ہے جو بھیڑیں چرانے کے لیے بے حد مناسب ہے۔ اگر آپ اتّفاق کریں تو کل ہم دونوں اپنی بھیڑیں وہاں لے جا کر چرائیں۔ حضرت محمدؐ مان گئے اور شام کو ہم اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ دوسرے دن سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد میں اپنی بھیڑیں لے کر مقرّرہ مقام پر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت محمدؐ پہلے سے بھیڑیں لے کر وہاں پہنچے ہوئے ہیں لیکن انھوں نے بھیڑوں کو روک رکھا ہے اور چرنے کے لیے نہیں چھوڑا۔ میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے تم سے اقرار کیا تھا کہ ہم دونوں مل کر اپنی بھیڑیں یہاں چرائیں گے اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمھارے آنے سے پہلے اپنی بھیڑیں یہاں چراؤں۔" [2]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں:

---

[1] وافی۔ جلد اوّل صفحہ ۱۵۷ [2] بحارالانوار۔ جلد ۷۵۔ صفحہ ۹۲

أَقْرَبُكُمْ مِنِّيْ غَدًا فِي الْمَوْقِفِ أَصْدَقُكُمْ فِي الْحَدِيْثِ وَأَدَّاكُمْ لِلْأَمَانَةِ وَأَوْفَاكُمْ بِالْعَهْدِ وَأَحْسَنُكُمْ خُلُقًا وَأَقْرَبُكُمْ مِنَ النَّاسِ [1]

"کل قیامت کے دن میرے نزدیک ترین افراد وہ لوگ ہوں گے جو زیادہ سچ بولتے ہوں، امانتوں کی ادائیگی کے لیے زیادہ کوشش کرتے ہوں عہد و پیمان پورے کرنے میں زیادہ باوفا ہوں، بہتر اخلاق رکھتے ہوں اور لوگوں سے گھل مل کر رہتے ہوں۔"

پیشوایانِ اسلام نے ایفائے عہد کو شرافت اور عدالت کی ایک شرط قرار دیا ہے اور جو شخص اپنے عہد و پیمان کو پورا کرے اسے لائقِ احترام، دوستی اور بھائی چارے کے قابل سمجھا ہے۔

امام علی الرّضا علیہ السّلام اپنے جدّ بزرگوار حضرت رسولِ اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

مَنْ عَامَلَ النَّاسَ فَلَمْ يَظْلِمْهُمْ وَحَدَّثَهُمْ فَلَمْ يَكْذِبْهُمْ وَوَعَدَهُمْ فَلَمْ يُخْلِفْهُمْ فَهُوَ مِمَّنْ كَمُلَتْ مُرُوَّتُهُ وَظَهَرَتْ عَدَالَتُهُ وَوَجَبَتْ أُخُوَّتُهُ وَحَرُمَتْ غِيْبَتُهُ۔ [2]

"جو شخص معاملات اور لین دین میں دوسروں پر ظلم نہ کرے اور گفتگو کے دوران جھوٹ نہ بولے اور اپنے عہد و پیمان اور وعدوں کی پابندی کرے ایسا شخص شریف، عادل اور دوستی اور برادری کے قابل ہوتا ہے اور اس کی غیبت کرنا حرام ہے۔"

---

[1] امالی طوسی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۳۳ [2] العیون الاخبار الرضا۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۳۰

امام علی السجّاد علیہ السّلام کے ایک آزاد کردہ غلام نے کاروبار اور محنت کی بدولت کچھ سرمایہ جمع کرلیا۔

ایک دفعہ امام علیہ السّلام کو کچھ مالی پریشانی لاحق ہوئی اور آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام سے دس ہزار درہم بطور قرض اس شرط پر طلب کیے کہ جب آپ ادا کرسکیں گے ادا کردیں گے۔ اس نے کوئی چیز گروی رکھنے کی درخواست کی۔ امام ؑ نے اپنی عبا سے ایک تاگا کھینچ کر اُسے دے دیا اور فرمایا کہ یہ ہمارا وثیقہ ہے اور اسے قرضے کی ادائیگی تک تمھارے پاس رہنا چاہیئے۔

قرض دینے والے کے لیے یہ وثیقہ گراں تھا لیکن آپ کی شخصیت اور ارشادات کو مدّنظر رکھتے ہوئے رقم آپ کے سپرد کردی اور عبا کا تاگا ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں رکھ دیا۔ اتفاقاً جلد ہی آپ کو مالی کشائش حاصل ہوگئی۔ چنانچہ آپ دس ہزار درہم لے کر قرضخواہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تمھاری رقم حاضر ہے اور ہمارا وثیقہ واپس کردو۔ اُس نے عرض کیا کہ قبا کا تاگا مجھ سے گم ہوگیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا:

إِذًا لَا تَأْخُذُ مَالَكَ مِنِّي لَيْسَ مِثْلِي يُسْتَخَفُّ بِذِمَّتِهِ۔ [1]

"اس صورت میں اپنا قرضہ مجھ سے مت لو۔ میرے ذاتی وعدے کو ناچیز نہیں سمجھنا چاہیئے۔"

ناچار وہ شخص ڈبیہ لے آیا اور دیکھا کہ عبا کا تاگا اس میں موجود ہے چنانچہ اُس نے وہ تاگا آپ کو پیش کردیا۔

امام علیہ السّلام نے رقم اسے دے دی اور تاگا لے کر پھینک دیا۔ عبا کے

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۱۱ ۔ صفحہ ۴۲

ایک تاگے کی بذاتِ خود کوئی قیمت نہیں لیکن جب وہ تاگا ایک شریف اور با فضیلت شخص کے وعدے کی نشانی ہو تو وہ اتنا گرانبہا ہو جاتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں درہم اور دینار کے وثیقے کا کام دے سکتا ہے۔ قرض خواہ اسے اطمینانِ خاطر کے ساتھ قبول کرتا ہے اور مقررہ وقت پر اپنا قرضہ وصول کر لیتا ہے۔

وعدہ وفائی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ خدائے بزرگ و برتر قرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

"اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔" [1]

جو شخص اپنے وعدے پر ثابت قدم رہے وہ ایک صفتِ خداوندی سے متّصف ہو جاتا ہے اور یہ بجائے خود اس کی کمال اور فضیلت کی منزلت کی نشانی ہے۔

واقعۂ صفّین کے بعد خوارج کے نام سے ایک گروہ وجود میں آیا۔ تُند خُو اور علم و دین کے اصولوں سے بے بہرہ لوگ اس گروہ میں شامل ہو گئے اور ایک طویل مدّت تک گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتے رہے۔ وقت کی حکومتوں نے بھی مختلف طریقوں سے ان کا مقابلہ کیا۔ حجّاج بن یوسف کے زمانے میں کچھ لوگوں کو اس گروہ سے وابستگی کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور سزا کے لیے حجّاج کے سامنے لایا گیا۔ حجّاج نے خود ان کے معاملات کی چھان بین کی اور ہر ایک کی سزا معیّن کر دی۔ جب اس جماعت کے آخری فرد کی باری آئی تو مؤذّن نے اذان کہی اور نماز کا وقت ہو جانے کا اعلان کیا۔

حجّاج اپنی جگہ سے اُٹھا اور ملزم کو حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص عنبسہ نامی کے سپُرد کرتے ہوئے کہا کہ رات بھر تم اِسے اپنے پاس رکھّو اور صبح میرے پاس لاؤ تاکہ اسے سزا دوں۔

عنبسہ نے حکم کی تعمیل کی اور اس شخص کو ساتھ لے کر دارالامارۃ سے باہر نکل آیا۔

---

[1] سورۃ الرّعد۔ آیت ۔۳۱

راستے میں ملزم نے عنبسہ سے پوچھا کہ کیا میں تم سے بھلائی کی اُمّید کر سکتا ہوں؟ عنبسہ نے جواب دیا کہ جو کہنا چاہو کہو۔ ممکن ہے کہ مجھے بھلائی اور نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق حاصل ہو جائے۔

ملزم نے کہا: اللہ کی قسم میرا خوارج سے کوئی تعلّق نہیں۔ میں نے کسی مسلمان پر خروج نہیں کیا اور نہ ہی کسی جنگ میں حصّہ لیا ہے۔ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے میں اس سے قطعًا بَری ہوں۔ اگرچہ میں بے گناہ گرفتار ہو گیا ہوں لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اللہ کا فضل میرے شاملِ حال ہوگا اور میں بغیر گناہ کیے عذاب میں مبتلا نہ ہوں گا۔ میری خواہش یہ ہے کہ تو مجھ پر احسان کرے اور اجازت دے کہ میں اپنے بیوی بچّوں کے پاس جا کر انھیں الوداع کہوں اور جو وصیّت کرنی ہو کروں اور لوگوں کے حقوق ادا کروں۔ ان کاموں سے فراغت کے بعد میں کل اوّل وقت میں تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

عنبسہ کہتا ہے کہ مجھے یہ دیکھ کر ہنسی آئی کہ ایک ملزم قیدی ایسی درخواست کر رہا ہے لہٰذا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر اپنی درخواست دُہرائی۔ اس کی باتوں کا مجھ پر اثر ہوا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ مناسب یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کی درخواست قبول کر لوں چنانچہ میں نے یہی فیصلہ کیا اور اس سے کہا کہ تم جاؤ لیکن وعدہ کرو کہ کل صبح واپس آ جاؤ گے۔

اس شخص نے وعدہ کیا کہ کل اوّل وقت میں واپس آ جاؤں گا اور اس وعدے پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ پھر وہ چل دیا اور نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کیے پر سخت پچھتایا اور پریشان ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ میں نے کیا کر دیا اور کیوں بلا وجہ اپنے آپ کو حجّاج کے غیظ و غضب کا سزاوار بنا لیا؟ میں انتہائی فکرمندی کے عالم میں گھر میں داخل ہوا اور گھر والوں کو سارا

ماجرا کہہ سُنایا۔ اُنھوں نے بھی مجھے ملامت کی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اُس رات میں صُبح تک نہیں سویا اور ایک ایسے شخص کی طرح جسے سانپ نے ڈس لیا ہو یا ایک ایسی عورت کی طرح جس کا فرزند مر گیا ہو پیچ و تاب کھاتا رہا۔

صُبح ہو گئی۔ اُس شخص نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اوّل وقت میں واپس آ گیا۔ مجھے اس کے آنے پر تعجّب ہوا اور میں نے پُوچھا کہ تم کیوں واپس آ گئے ؟ اس نے جواب دیا کہ جس شخص کو اللہ کی معرفت کی سعادت نصیب ہو اور وہ پروردگار کو اس کی قدرت اور کمال کے ساتھ پہچانتا ہو اگر وہ کوئی وعدہ کرے اور اللہ کو اس پر گواہ ٹھہرائے تو اُسے چاہیے کہ وعدہ پُورا کرے اور ہرگز پیمان شکنی نہ کرے۔

عنبسہ مقرّرہ وقت پر اُسے اپنے ساتھ حجّاج کے پاس لے گیا اور گزشتہ رات کا سارا ماجرا حجّاج کو کہہ سُنایا۔ حجّاج کو ملزم کے ایمان اور ایفائے عہد پر تعجّب ہوا۔ اُس نے عنبسہ سے کہا : کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ میں اس شخص کو تمھیں بخش دوں ؟

عنبسہ نے جواب دیا : اگر آپ براہِ کرم ایسا کریں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

حجّاج نے ملزم کو عنبسہ کو بخش دیا۔ عنبسہ اُسے دارالامارۃ سے باہر لایا اور کمالِ مہربانی سے کہا :

"اب تم آزاد ہو اور جا سکتے ہو۔"

اُس شخص نے عنبسہ کا شکریہ ادا کیے بغیر اپنی راہ لی اور چلا گیا۔ عنبسہ کو اس کی بے رُخی اور حق ناشناسی پر بہت رنج ہوا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ ممکن ہے یہ شخص دیوانہ ہو لیکن دُوسرے دن وہ عنبسہ کے پاس آیا اور اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے نجات دینے والا تو اللہ تھا اور تم محض ایک وسیلہ تھے۔ اگر کل میں تمھارا شکریہ ادا کرتا تو تمھیں اللہ تعالیٰ کی نعمت میں شریک کرتا اور یہ ایک ناروا فعل ہوتا لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤں اور آج میں تمھارا شکریہ

ادا کرنے آیا ہوں۔ پھر اُس نے عنبسہ کی بھلائی کا شکریہ ادا کیا اور جو زحمت اُسے اٹھانی پڑی تھی اس کے لیے معذرت چاہی اور چلا گیا۔ [1]

اسلامی روایات میں ایفائے عہد کے بارے میں کسی استثنا کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ جب کسی سے حتیٰ کہ کفار سے بھی کوئی وعدہ کریں تو اس کی پابندی کریں۔

امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثَلَاثٌ لَمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لِاَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ فِیْهِنَّ رُخْصَةً، بِرُّ الْوَالِدَیْنِ بَرَّیْنِ كَانَا اَوْ فَاجِرَیْنِ وَوَفَاءُ بِالْعَهْدِ بِالْبَرِّ وَالْفَاجِرِ وَاَدَاءُ الْاَمَانَةِ اِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ [2]

"تین چیزیں ایسی ہیں جن کے ترک کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دی۔ اوّل ماں باپ سے نیکی، خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے ہوں۔ دوّم وعدہ وفائی، خواہ دوسرا فریق نیکوکار ہو یا فاجر ہو۔ سوّم امانت کی ادائیگی خواہ اس کا مالک نیکوں میں سے ہو یا بدوں میں سے ہو۔"

یہاں یہ وضاحت کر دینی ضروری ہے کہ وعدے کا پورا کرنا ان صورتوں میں لازم ہے جب وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرنے کا موجب نہ ہو اور ایسی صورتوں میں ایفائے عہد کالعدم ہو جاتا ہے اور کوئی شخص ایسا کام انجام دینے کا حق نہیں رکھتا۔

رسولِ اکرمؐ نے عملاً مسلمانوں کو ایفائے عہد کا سبق دیا اور لوگوں سے حتیٰ کہ کفّار اور اپنے دشمنوں سے بھی جو عہد و پیمان کیے انھیں پُورا کیا۔

---

[1] کودک از نظر وراثت و تربیت۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۱۸ [2] خصال الصدوق۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۶۳

حذیفہ ان اشخاص میں سے تھے جنھوں نے جنگِ بدر میں شرکت نہ کی اور اس عظیم فیض سے محروم رہے۔ وہ خود اپنی اس محرومیّت کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

"میں اور میرا ساتھی ابوالحسیل مدینے سے اس نیّت سے نکلے کہ محاذِ جنگ پر رسولِ اکرمؐ اور مسلمانوں کی سپاہ سے جا ملیں۔ اتّفاقاً ہماری مڈبھیڑ کفّارِ قریش کی ایک جماعت سے ہوگئی۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا تم محمدؐ کی جانب جا رہے ہو۔ ہم نے ان سے خوفزدہ ہو کر اور ان کے شر سے نجات حاصل کرنے کے لیے جواب دیا کہ نہیں ہم تو مدینہ جا رہے ہیں۔ انھوں نے ہم سے وعدہ لیا کہ اگر وہ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم (حضرت) محمدؐ کی مدد کے لیے نہیں جائیں گے اور ان کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ ہم نے بھی یہ اقرار کر لیا اور آزاد ہو گئے۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہم رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے۔ ہم نے حضورؐ سے سارا ماجرا بیان کیا اور جنگ میں شرکت کی اجازت چاہی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں۔ تم نے ان لوگوں کے ساتھ عہد و پیمان کیا ہے اور تمھیں اُسے بھول نہیں جانا چاہیے۔ تم جاؤ اور اپنے وعدے پر قائم رہو۔ ہم بھی اللہ تعالیٰ سے مدد کے طالب ہیں۔" [1]

رسولِ اکرمؐ نے بہت سی قوموں اور قبیلوں سے معاہدے کیے مثلاً حدیبیہ کا معاہدہ کفّارِ قریش کے ساتھ ہوا اور عدم تعرّض کا پیمان مدینے کے نواحی علاقے کے یہودیوں سے باندھا گیا اور کبھی بھی یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ آپ نے کسی معاہدے کے بارے میں لاپرواہی برتی ہو یا اپنا وعدہ توڑا ہو۔ آپ مختلف اشخاص سے جو وعدے کرتے تھے انھیں پورا کرنا اپنے آپ پر واجب سمجھتے تھے اور انھیں باقاعدہ فرض کی

---

[1] اسلام و صلح جہانی۔ صفحہ ۲۶۴

مانند تصور فرماتے تھے۔

امام علی الرضا علیہ السّلام فرماتے ہیں:

إِنَّا أَهْلَ بَيْتٍ نَرَىٰ مَا وَعَدْنَا عَلَيْنَا دَيْنًا كَمَا صَنَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ [1]

"ہم وہ خاندان ہیں جو اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو وعدے ہم کریں وہ ایک قرض کی مانند ہیں جس کی ادائیگی لازمی ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا طریقہ تھا۔"

امیر المومنین امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرمؐ سے سُنا ہے:

عِدَةُ الْمُؤْمِنِ نَذْرٌ لَا كَفَّارَةَ لَهُ [2]

"جو وعدہ ایک مومن کسی شخص سے کرتا ہے وہ بمنزلہ نذر کے ہے فرق یہ ہے کہ نذر کے خلاف عمل کرنے کا کفّارہ ہے لیکن وعدہ خلافی کا کوئی کفّارہ نہیں ہے۔"

مالکِ اشتر کو کی گئی نصیحتوں کے ضمن میں امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"زیر دستوں پر احسان کر کے جتانے اور اپنی بھلائیوں کو زیادہ شمار کرنے اور ان سے وعدہ خلافی کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ احسان کر کے جتانا نیکی کو برباد کر دیتا ہے اور نیک کام کو بڑا خیال کرنا حقیقت کی روشنی کو زائل کر دیتا ہے اور وعدہ خلافی کرنا اللہ کے غیظ و غضب اور لوگوں کے غصّے کا موجب بنتا ہے۔" [3]

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۷۵۔ صفحہ ۹۷ [2] کشف الغمہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۹۲

[3] نہج البلاغہ۔ عہدنامہ مالک اشتر

اسی عہدنامے میں ایک اور مقام پر آپ مالک اشتر کو نصیحت فرماتے ہیں:

وَاِنْ عَقَدْتَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ عَدُوِّكَ عُقْدَةً اَوْ اَلْبَسْتَهُ مِنْكَ ذِمَّةً فَحُطْ عَهْدَكَ بِالْوَفَاءِ وَارْعَ ذِمَّتَكَ بِالْاَمَانَةِ۔

"اگر تمھارے اور تمھارے دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ طے ہو یا تم اُسے امان دو تو اپنے وعدے کے پابند رہو اور جو امان دی ہو اس کا احترام کرو۔"

فَاِنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ شَيْءٌ، اَلنَّاسُ اَشَدُّ عَلَيْهِ اجْتِمَاعًا مَعَ تَفَرُّقِ اَهْوَائِهِمْ وَتَشَتُّتِ آرَائِهِمْ مِنْ تَعْظِيْمِ الْوَفَاءِ بِالْعُهُوْدِ۔

"کیونکہ اُن لوگوں کے نزدیک بھی جو اپنے عقائد اور آرا میں اختلافات رکھتے ہیں واجباتِ الٰہی میں سے کوئی امر ایفائے عہد کی مانند متفقہ اور محترم نہیں ہے۔"

مامون کے دَورِ خلافت میں دمشق کے ایک باشندے کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور زنجیروں میں جکڑ کر بغداد بھیج دیا گیا۔ خلیفہ نے بغداد کی پولیس کے سربراہ عبّاس کو بُلوا بھیجا اور ملزم کو اس کے سپرد کرتے ہوئے بے حد تاکید کی کہ اس کا خاص خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ بھاگ جائے کیونکہ یہ ایک خطرناک آدمی ہے۔

عباس کہتا ہے:

"میں نے اسے اپنے اہلکاروں کے سپرد کیا اور اپنے صدر دفتر بھیج دیا لیکن رات کے وقت مجھے پریشانی لاحق ہوئی کہ مبادا اہلکار غفلت برتیں اور ملزم بھاگ جائے اس بنا پر میں نے حکم دیا کہ اسے زنجیروں

سمیت میرے خصوصی کمرے میں لے آئیں تاکہ میں ذاتی طور پر اس کی نگرانی کروں۔ اہلکار اُسے میرے کمرے میں لے آئے اور ایک کونے میں بٹھا دیا۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں اور ملزم اکیلے رہ گئے میں نے چاہا کہ اس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کروں اور اس کے جرم کا پتا چلاؤں۔

میں نے اس سے پوچھا: ”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

اُس نے جواب دیا: ”میں دمشق کا رہنے والا ہوں۔“

چونکہ میں دمشق میں ایک مدت تک سرکاری خدمات انجام دیتا رہا تھا اور اس زمانے کی کئی یادیں میرے دماغ میں محفوظ تھیں لہٰذا میں نے اس سے کہا:

”کیا تم فلاں شخص کو جانتے ہو؟“

اس نے جواب دیا: ”میں تو اُسے جانتا ہوں لیکن آپ اُسے کیسے جانتے ہیں؟“

میں نے کہا: ”میرا اس سے کچھ معاملہ ہے۔“

وہ کہنے لگا: ”آپ پہلے اپنا معاملہ بیان کریں اور پھر میں اپنی داستان سناؤں گا۔“

میں نے کہا: ”چند سال پہلے میں دمشق کے گورنر کے ساتھ کام کرتا تھا۔ دمشق کے لوگ گورنر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ گورنر ایک رسّی کی مدد سے محل سے گلی میں کود گیا اور بھاگ نکلا۔ میں بھی ایک دوسری طرف سے فرار ہو گیا۔ لوگوں نے میرا پیچھا کیا۔ قریب تھا کہ میں ان کے ہاتھوں گرفتار ہو جاؤں لیکن اتنے میں، میں نے ایک

گلی میں ایک شخص کو دیکھا جو اپنے گھر کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پناہ طلب کی اور اس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے گھر میں چھُپا لے۔

وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گیا اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو بھی ہدایت کی کہ وہ اُسی کمرے میں ہی آجائے اور میری حفاظت کرے۔

وہ لوگ گھر میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے مکان کا چپّہ چپّہ چھان مارا اور اس کمرے کے نزدیک پہنچ گئے جس میں مَیں چھُپا ہوا تھا۔ خوف کے مارے میرا سارا بدن کانپ رہا تھا اور مجھ میں بیٹھنے کی قوّت بھی باقی نہ رہی تھی۔

جب وہ کمرے کے سامنے پہنچے تو عورت دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ اُس نے انھیں ڈانٹ کر کہا کہ تمھیں شرم نہیں آتی کہ میرے کمرے میں داخل ہونا چاہتے ہو۔

وہ لوگ عورت کے یہ کہنے پر شرمندہ ہوئے اور واپس لوٹ گئے۔ جب خطرہ ٹل گیا تو ان میاں بیوی نے مجھے تسلّی دی اور کہا کہ اطمینان رکھّو اب تم سے کوئی بازپرُس نہیں کرے گا۔ انھوں نے کمرہ بھی میرے سپرد کر دیا اور بے حد پیار اور محبّت سے پیش آئے۔

ایک دن میں نے اس شخص سے کہا کہ میں گھر سے باہر جا کر اپنے غلاموں کا پتا چلانا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی لیکن وعدہ لیا کہ اپنا کام مکمل ہونے کے بعد اس کے پاس واپس آجاؤں گا۔ میں مکان سے باہر آیا اور غلاموں کا پتا چلانے کی کوشش کی لیکن

کوئی کامیابی نہ ہوئی لہٰذا میں پھر اُس شخص کے گھر لوٹ آیا۔

چند دن اور گزر گئے اور اس دوران میں، مَیں نے بغداد جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شخص کہنے لگا کہ بغداد جانے والا قافلہ دو تین دن میں دمشق سے روانہ ہونے والا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم تنہا سفر کرو لہٰذا تم فی الحال رُک جاؤ اور قافلے کے ساتھ چلے جانا۔

میں نے اس کی بات مان لی اور تین دن اور توقّف کیا۔ اس شخص نے میرے قیام کے دوران مجھ سے بے پناہ محبّت کا اظہار کیا۔ میری روانگی کے وقت بھی اُس نے کپڑوں کا ایک جوڑا، جوتا، تلوار، کمر بند، ایک گھوڑا، ایک خچّر اور ایک غلام مجھے بطور ہدیہ دیے اور پانچ ہزار درہم بھی میرے حوالے کیے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اس کا احسان کبھی فراموش نہ کروں گا اور جس طرح بھی ہو سکا اس کی تلافی کروں گا تاہم اب تک میں اس کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکا۔"

اس وقت تک ملزم زنجیروں میں جکڑا ہوا خاموشی سے میری باتیں سُنتا رہا۔ جب میں نے اپنا بیان ختم کیا تو وہ کہنے لگا:

"اگر آپ اس شخص کو دیکھیں تو پہچان لیں گے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

تب اس نے کہا: "آپ جس شخص کی تلاش میں ہیں وہ اِس وقت آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور آپ کی قید میں ہے۔"

میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس نے کچھ اور نشانیاں بھی بتائیں اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ قیدی ہی میرا مہربان میزبان تھا۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ پھر میں نے اہلکاروں کو بُلا کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اُتروائیں اور اس پر جو کچھ بیتی تھی اس کے بارے میں دریافت کیا۔

اس نے مجھے اپنی سرگزشت تفصیل سے سُنائی حتیٰ کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے گناہ ہے اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہوا ہے۔

پھر اس نے کہا: "اگر تم اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتے ہو اور مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہو تو کسی کو بھیجو تاکہ فلاں مقام سے میرے غلام کو لے آئے اور میں اسے وصیّت کروں کیونکہ جب مجھے گرفتار کیا گیا تھا تو اپنے بیوی بچّوں کو خدا حافظ کہنے اور وصیّت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

میں نے فوراً آدمی بھیجے جو غلام کو لے آئے۔ غلام کو دیکھ کر وہ شخص رونے لگا اور پھر اپنی وصیّتیں بیان کرنا شروع کر دیں۔

میں نے اپنے معاون کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ چند گھوڑے اور غلام اور سفر کا دوسرا ضروری سامان اس کے لیے تیّار کیا جائے اور راتوں رات اسے بغداد سے باہر نکال دیا جائے۔

اس شخص نے کہا: "یہ سب کچھ مت کرو کیونکہ میرا گناہ خلیفہ کے نزدیک بہت بڑا ہے اور وہ مجھ سے بہت خفا ہے اور تمھیں قتل کرا دے گا۔"

میں نے اس سے کہا: "تم خلیفہ کے بارے میں مت سوچو۔ سفر کا سامان تیار ہے لہٰذا تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔"

وہ کہنے لگا: "یہ ناممکن ہے کیونکہ اگر میں چلا گیا تو تمھاری جان

خطرے میں پڑ جائے گی لہٰذا اگر ایسا ہی ہے تو تم مجھے کسی محفوظ جگہ پہنچا دو تاکہ اگر کل خلیفہ کے سامنے میری حاضری ضروری ہو تو تم مجھے پیش کر سکو۔"

میں نے اس کی بات مان لی اور اُسے ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا۔

دوسرے دن ابھی میں نمازِ فجر سے بھی فارغ نہیں ہوا تھا کہ خلیفہ کے آدمی یہ پیغام لے کر آ گئے کہ خلیفہ نے قیدی کو طلب کیا ہے۔

میں خود مامون کے پاس چلا گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اکیلا آیا ہوں تو کہنے لگا کہ اگر تو یہ کہے گا کہ قیدی بھاگ گیا ہے تو میں اس کی بجائے تجھے قتل کرا دوں گا۔

میں نے جواب دیا: "نہیں۔ وہ بھاگا نہیں بلکہ خلیفہ کے اختیار میں ہے لیکن آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی داستان آپ کے گوش گزار کروں۔"

اُس نے مجھے اجازت دے دی۔

میں نے دمشق میں اپنی مصیبت کا واقعہ اور اسی طرح سابقہ رات جو کچھ گزرا تھا بالتفصیل بیان کیا اور کہا کہ اب میں اپنا عہد پورا کرنا چاہتا ہوں اور اگر میرا آقا مجھے اس شخص کی بجائے قتل کرنا چاہے تو اس وقت میں اپنے لباس کے نیچے کفن پہنے ہوئے ہوں اور مرنے کو تیار ہوں اور اگر وہ مجھے بخش دے تو وہ اپنے غلام پر بہت بڑا احسان کرے گا۔

جب خلیفہ نے سارا ماجرا سُنا تو کہنے لگا: "خدا تجھے خیر نہ دے، وہ تجھے نہیں جانتا تھا اور اس نے تجھ سے اتنی بڑی نیکی کی اور تُو نے

اُسے پہچان لیا ہے اور اُس سے نیکی کرنا چاہتا ہے۔ تُو نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا تاکہ میں اس کی نیکیوں کا بدلہ اسے دیتا۔"

میں نے کہا: "اے امیرالمومنین! وہ اسی شہر میں ہے اور گزشتہ رات میرے بے حد اصرار کے باوجود وہ اپنی جان بچا کر نکل جانے پر راضی نہیں ہوا۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اُسے میری قسمت کے بارے میں اطمینان نہ ہو جائے وہ بغداد سے باہر نہیں جائے گا۔"

خلیفہ نے کہا: "اس نے تجھ پر یہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جا اور اسے میرے پاس لے آ۔"

میں فوراً اس شخص کے پاس پہنچا اور اسے اطمینان دلایا کہ خلیفہ نے تمھیں معاف کر دیا ہے اور اب مجھے بھیجا ہے تاکہ میں تمھیں اس کے پاس لے جاؤں۔

خلیفہ اس سے بڑی مہربانی اور محبت سے پیش آیا اور اس نے دوپہر کا کھانا بھی خلیفہ کے ساتھ کھایا۔

اس کی روانگی کے وقت خلیفہ نے اسے دمشق کی گورنری کی پیشکش کی لیکن اس نے یہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت چاہی۔ تب خلیفہ نے کہا:

"اچھا تم دمشق میں رہو اور خطوط کے ذریعے ہمیں باقاعدہ شام کے حالات کی خبر دیتے رہو۔"

اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ پھر خلیفہ کے حکم کے مطابق بہت سے گھوڑے اور غلام اور روپوں کی چند تھیلیاں اسے دی گئیں۔ پھر خلیفہ نے اس شخص کے بارے میں ایک سفارشی خط شام کے گورنر کو لکھا اور اسے پورے احترام سے دمشق بھیجا۔"

مسلمانوں کو وعدہ خلافی کی ذلّت سے بچانے کی خاطر اسلامی تعلیمات میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہر شخص کو چاہیے کہ کسی معاہدے پر دستخط کرنے یا عہد و پیمان باندھنے سے پہلے اپنی قدرت کا اندازہ لگائے اور اگر اپنے آپ کو وعدہ پورا کرنے کے قابل نہ سمجھے تو سرے سے وہ وعدہ ہی نہ کرے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَا تَعِدُ مَا تَعْجِزُ عَنِ الْوَفَاءِ ، لَا تَضْمَنْ مَا لَا تَقْدِرُ عَلَى الْوَفَاءِ بِهِ [1]

"تم شروع سے ہی ایسا وعدہ نہ کرو جسے تم پورا نہ کرسکو اور ابتدا سے ہی ایسے کام کی ذمّے داری نہ لو جسے کرنے پر تم قادر نہ ہوسکو۔"

آپ کا ایک اور قول یہ ہے:

لَا تَعِدَنَّ عِدَةً لَا تَثِقُ مِنْ نَفْسِكَ بِإِنْجَازِهَا [2]

"کسی سے ایسا وعدہ نہ کرو جس کے بارے میں تمھیں اطمینان ہو کہ تم بخوبی انجام نہ دے پاؤ گے۔"

اب جبکہ پیشوایانِ اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق وعدہ وفائی کی اہمیّت اور ضرورت کسی حد تک واضح ہوگئی ہے تو اِس عظیم امر کے احیاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ بچّے لڑکپن سے ہی وعدہ اور عہد کے معنی سمجھنے لگیں، اس مسئلے سے آشنا ہوجائیں اور اپنے بزرگوں کے اقوال اور کردار میں وعدہ وفائی کا سبق پڑھیں اور اسے ازبر کریں تاکہ یہ صفت ان کی پختہ عادتوں کا جزو بن جائے۔

گھر اور خاندان بچّوں کے لیے پہلا اور بنیادی مدرسہ ہیں۔ اگر گھر اور خاندان

---

[1] غررالحکم، کلمہ ۱۰۱۷۸

[2] غررالحکم، کلمہ ۱۰۲۹۷

کا ماحول فضیلت اور تقویٰ کا ماحول ہو تو بلا شبہ بچّے فضیلت اور تقویٰ کا سبق سیکھتے ہیں اور سعادت مندانہ زندگی کی راہ و رسم اختیار کرتے ہیں۔

پیشوایانِ اسلام نے اپنے ارشادات میں اس اہم موضوع کی جانب توجّہ دی ہے اور مسلمانوں کو گھر کے اندر اور بچّوں کے بارے میں ایفائے عہد کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

اَحِبُّوا الصِّبْیَانَ وَارْحَمُوْهُمْ وَاِذَا وَعَدْتُمُوْهُمْ فَفُوْا لَهُمْ فَاِنَّهُمْ لَا یَرَوْنَ اِلَّا اَنَّكُمْ تَرْزُقُوْنَهُمْ [1]

"بچّوں کو دوست رکھو اور ان سے مہربانی سے پیش آؤ اور جب ان سے کوئی وعدہ کرو تو اسے ضرور پورا کرو کیونکہ وہ تمھیں اپنا رازق سمجھتے ہیں۔"

امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں:

لَا یَصْلَحُ الْكِذْبُ جِدٌّ وَلَا هَزْلٌ وَلَا اَنْ یَعِدَ اَحَدُكُمْ صَبِیَّهٗ ثُمَّ لَا یَفِیْ لَهٗ [2]

"یہ بات اچھی نہیں کہ انسان مذاق میں یا سنجیدگی سے جھوٹ بولے اور یہ بات بھی ٹھیک نہیں کہ انسان اپنے بچّے سے کوئی وعدہ کرے اور اسے پورا نہ کرے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا ارشاد ہے:

اِذَا وَعَدَ اَحَدُكُمْ صَبِیَّهٗ فَلْیُنْجِزْ لَهٗ [3]

"جب تم میں سے کوئی اپنے چھوٹے سے فرزند سے کوئی وعدہ کرے

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۱۲۶ [2] وسائل الشیعہ جلد سوم۔ صفحہ ۲۳۲

[3] مستدرک الوسائل۔ جلد دوّم۔ صفحہ ۶۲۶

تو اسے چاہیے کہ اسے ضرور پورا کرے "۔

بچوں سے ایفائے عہد کے بارے میں یہ سب سفارشات اس لیے ہیں کہ بڑوں کے اعمال بچے کے صفحۂ ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لیے ناقابلِ انکار اثر رکھتے ہیں۔

اگر بچے دیکھیں کہ ان کے ماں باپ اور دوسرے بزرگ غلط بیانی اور وعدہ شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں تو بڑے ہو کر وہ بھی یہی وتیرہ اختیار کریں گے اور وعدہ خلاف اور بے وفا افراد ثابت ہوں گے۔

بحث کے خاتمے پر ہم اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ ہم سب کو وعدہ وفائی کا وظیفہ انجام دینے اور بچوں کو اسلام کی بنیاد پر تربیت دینے کی توفیق عطا فرمائے جو کہ اس دنیا اور آخرت میں سعادت اور نیک بختی کی بنیاد ہے۔ "آمین"

اسلام میں اِستقامت

ہر کام میں کامیابی استقامت اور مستقل مزاجی سے وابستہ ہے اور استقامت کے بغیر کوئی شخص کسی معاملے میں بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔

جو شخص عالم بننا چاہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے تکالیف برداشت کرے اور مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ اُستاد کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے۔ پڑھائی اور مطالعہ سے تنگ نہ آجائے اور علم حاصل کرنے کا جو موقع ملے اُس سے فائدہ اُٹھائے اور وقت ضائع نہ کرے تاکہ رفتہ رفتہ بہ حیثیت عالم ایک مقام حاصل کرلے۔

جو شخص دولت کمانا چاہتا ہو اُسے چاہیئے کہ محنت کرے اور مشقّت اور مستعدی سے مُنہ نہ موڑے۔ اگر شروع شروع میں اُسے ناکامی ہو اور نقصان اٹھانا پڑے تو بددل نہ ہو اور ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھّے تاکہ آہستہ آہستہ دولت جمع کر سکے۔

جو بیمار شخص یہ چاہتا ہو کہ صحت یاب ہو جائے اُسے چاہیئے کہ علاج معالجے کی تلخی اور مکمّل پرہیز اور بعض اوقات آپریشن کی تکلیف اُٹھانے کے سلسلے میں ثابت قدم رہے تاکہ نئے سرے سے تندرستی سے ہمکنار ہو۔

جو شخص خود اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہو اور اس کی یہ خواہش ہو کہ بُری عادتوں کی بجائے اس میں اچھّی صفات پیدا ہو جائیں اُسے چاہیئے کہ نفسانی خواہشات اور گمراہ کرنے والے جذبات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرے اور اپنے ناجائز شوق کو ٹھکرا دے اور استقامت اور مستقل مزاجی کی بدولت اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔

جو شخص اپنے معاشرے کی اصلاح کا خواہش مند ہو اور اُس کی رہنمائی خوشحالی اور خوش نصیبی کی جانب کرنا چاہتا ہو اُسے مخالفین کی مزاحمت اور بدزبانی سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے اور میدان خالی نہیں کر دینا چاہیئے بلکہ اسے چاہیئے کہ ہر قسم کی مشکلات برداشت کرے اور ناموافق حالات پر صبر کرے اور ثابت قدم رہے تاکہ اپنی مُراد کو پہنچے۔

جو مسلمان اپنے ایمان کی حفاظت کرنا چاہتا ہو اُسے چاہیئے کہ اگر بے دین لوگ اُس کا مذاق اُڑائیں یا اُسے تکلیف دیں تو ثابت قدم رہے۔ دولت، رُتبے اور نفسانی خواہشات کے فریب میں نہ آئے بلکہ ان خواہشات کا مقابلہ مستقل مزاجی سے کرے۔ تکلیفیں اُٹھا کر زندہ رہنا سیکھے۔ محرومیوں کو برداشت کرے اور گناہوں سے بچے تاکہ اُس کا ایمان محفوظ رہے۔

جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں وہ انسان کی مادّی اور رُوحانی زندگی کے مختلف مسائل کے چند ایسے نمونے ہیں جن میں ثابت قدمی کی ضرورت کا مکمّل طور پر احساس ہوتا ہے اور ان کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی انسان استقامت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

پس پتا چلتا ہے کہ تمام اچھی صفات میں سے استقامت سب سے ممتاز صفت ہے کیونکہ اِس کی بدولت انسان تمام انسانی صفات اور مادّی اور روحانی کامیابیاں حاصل کرسکتا ہے۔

ایک جاہل شخص مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ذریعے عالم بن سکتا ہے بخیل سخی ہوجاتا ہے۔ خود پسند، خدا پرست بن جاتا ہے اور نادار شخص دولت مند ہوجاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ اُسے حاصل ہو اُس کی حفاظت کے لیے بھی مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرے کیونکہ جس طرح کوئی مقصد حاصل کرنے کے لیے استقامت ضروری ہے اُسی طرح اُس مقصد کے حصول کے بعد اُس کی نگہداشت کے لیے بھی استقامت اور ثابت قدمی لازم ہے۔

لہٰذا استقامت انسان کو اُس کا مقصد حاصل کرنے میں بھی مدد دیتی ہے اور جو کچھ وہ حاصل کرے اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"اِنْ كُنْتُمْ لِلنَّجَاةِ طَالِبِيْنَ فَارْفُضُوا الْغَفْلَةَ وَاللَّهْوَ وَالْزِمُوا الْاِجْتِهَادَ وَالْجِدَّ"۔[1]

"اگر تم نجات اور خوش نصیبی کے طلبگار ہو تو غفلت نہ برتو اور بیہودہ کام ترک کردو اور کوشش کو اپنا شعار بناؤ اور محنت کو اپنی زندگی کا سرورق قرار دو۔"

امیر المومنین علیہ السّلام نے مزید فرمایا ہے:

"عَلَيْكَ بِمَنْهَجِ الْاِسْتِقَامَةِ فَاِنَّهُ يُكْسِبُكَ الْكَرَامَةَ وَيَكْفِيْكَ الْمَلَامَةَ"۔[2]

---

[1] غرر الحکم - کلمہ ۳۷۴۱   [2] غرر الحکم - کلمہ ۶۱۲۷

"تمھیں چاہیئے کہ استقامت کے راستے پر چلو کیونکہ یہ راستہ تمھیں سرداری اور عزّت بخشتا ہے اور لوگوں کی ملامت سے محفوظ رکھتا ہے۔"

سکاکی ساتویں صدی ہجری میں ایک مشہور عالم گزرا ہے۔ وہ جوانی میں لوہار کا کام کرتا تھا اور اپنے پیشے میں اُس نے حیرت انگیز مہارت حاصل کرلی تھی۔

ایک دفعہ اُس نے لوہے کا ایک بے حد خوبصورت اور نازک صندوقچہ بنایا اور اس کا چھوٹا سا تالہ بھی تیّار کیا۔ یہ صندوقچہ اُس نے خلیفۂ وقت کو تحفے کے طور پر پیش کیا۔

خلیفہ اور اُس کے مصاحبین نے صندوقچہ بہت پسند کیا اور سکاکی کی بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔

اسی دوران میں ایک عالم شخص اس محفل میں وارد ہوا۔ خلیفہ اُس کے احترام کے طور پر کھڑا ہوگیا اور پھر اُس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا۔

سکاکی نے لوگوں سے پوچھا:

"یہ شخص کون ہے جس کی خلیفہ نے اتنی عزّت کی ہے؟"

اُسے بتایا گیا کہ یہ شخص عالمِ دین ہے۔

سکاکی نے اپنے دل میں سوچا کہ میں نے یہ صندوقچہ تیّار کرنے میں اتنی مشقّت اُٹھائی اور اس کے بدلے میں فقط میری تعریف اور حوصلہ افزائی کی گئی۔ کیوں نہ میں بھی علم حاصل کروں تاکہ اس شخص جیسی عزّت پاؤں۔

جب وہ خلیفہ کے دربار سے نکلا تو سیدھا مدرسے پہنچا اور اُستاد سے درخواست کی کہ اُسے پڑھائے۔ اُس وقت سکاکی کی عمر تیس سال تھی۔

اُستاد نے پہلے دن اُسے فقہ کا ایک مسئلہ پڑھایا تاکہ اُسے یاد کرلے اور دوسرے دن سُنائے۔ لیکن سُنانے بیٹھا تو مسئلہ یوں اُلٹا پلٹا کر بیان کیا کہ سب طالب علم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

اُستاد نے اُنھیں ہنسنے سے منع کیا اور سکاکی کو ایک اور مسئلہ پڑھایا۔ وہ دس سال تک علم حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر تھک ہار کر اور مایوس ہو کر وہ جنگل میں جا پہنچا اور ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھ کر اپنی ناگفتہ بہ حالت پر غور کرنے لگا۔ اِسی اثنا میں اُس نے دیکھا کہ پہاڑی کے اوپر سے پانی قطرہ قطرہ ایک پتّھر پر ٹپک رہا ہے اور پانی کے قطروں نے پتّھر میں سوراخ کر دیا ہے۔ سکاکی نے سوچا کہ میرا دل پتّھر سے زیادہ سخت تو نہیں ہے۔ وہ فوراً اُٹھا اور مصمّم ارادے کے ساتھ دوبارہ مدرسے پہنچا اور علم حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تیس سال کی عمر کا کُند ذہن لوہار ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کی بدولت ایک مشہور عالم بن گیا اور اعلیٰ رتبوں پر فائز ہوا۔[۱]

امیرالمومنین علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"مَنْ بَذَلَ جُهْدَ طَاقَتِهٖ بَلَغَ كُنْهَ اِرَادَتِهٖ"[۲]

"جو شخص اپنی قوّت سے کام لیتا ہے وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"مَنِ اسْتَدَامَ قَرْعَ الْبَابِ وَلَجَّ وَلَجَ"[۳]

"جو شخص مسلسل دروازہ کھٹکھٹاتا رہے اور اِس کام میں استقامت دکھائے اُس کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔"

ایک نکتہ جو قابلِ توجّہ ہے وہ یہ ہے کہ استقامت جو بہترین انسانی صفات میں سے ہے وہ اس چیز سے عبارت ہے کہ انسان سوچ بچار اور مطالعہ کے بعد

---

[۱] روضات الجنات۔ صفحہ ۷۴۷

[۲] اور [۳] غرر الحکم کلمہ ۸۷۸۵ اور ۹۱۶۰

اور غلط احساسات اور تعصبات کو دخل اندازی کا موقع دیے بغیر ایک مقصد کی صحت اور درستی کو سمجھ لے اور پھر اُسے حاصل کرنے کے لیے یا اُس کی حفاظت کی خاطر ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے کام لے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایک غلط، ناجائز اور نامعقول مقصد حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہے تو یہ استقامت نہیں بلکہ ضد ہو گی جو بدترین صفت ہے اور گمراہی اور ہلاکت کا موجب ہے۔

دُوسرا نکتہ یہ ہے کہ تمام صحیح راستوں اور جائز اور معقول مقاصد کے لیے استقامت ایک پسندیدہ چیز ہے لیکن وہ راستہ جو صحیح معنوں میں استقامت اور تکالیف برداشت کرنے کے لیے موزوں ہے وہ اللہ اور ایمان کی حفاظت اور معاشرے میں روحانیت کو رواج دینے کی راہ میں استقامت کا راستہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی معاملات میں استقامت کا واحد نتیجہ مادّی مقاصد کا حصول ہے جب کہ اللہ کی راہ میں استقامت کا نتیجہ دونوں جہان کی نیک بختی سے فیض یاب ہونا ہے۔

جن اشخاص کو اس قسم کی استقامت حاصل ہو قرآنِ مجید اُنھیں ابدی خوش نصیبی کی بشارت دیتا ہے:

"یقیناً جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب (وہ ذاتِ پروردگار جس کے قوانین و احکام فرد و اجتماع، معاشرت، سیاست، عدالت وغیرہ کے تمام شعبوں میں نافذ ہوں) اللہ ہے اور اس کے بعد اس راہ پر استقامت اختیار کرتے ہیں انھیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے اور وہ اُن تکالیف کے صلے میں جو اُنھوں نے اُٹھائی ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہیں گے اور انھیں ابدی سعادت حاصل ہو گی۔" (سورۃ الاحقاف۔ آیت ۱۳)

اِس سلسلے میں رسولِ اکرمؐ کا کردار آپ کے پیروؤں کے لیے بہترین نمونہ ہے جنھیں حکم دیا گیا تھا کہ :

"فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۔" [۱]

"(اے رسولؐ) جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے ثابت قدم رہو۔"

آنحضرتؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق لوگوں کی ہدایت کا بیڑا اُٹھایا حالانکہ آپ ظاہری قوت اور مادّی ساز و سامان سے محروم تھے۔ اِس راستے میں آپ کا سب سے بڑا سرمایہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور تمام مشکلات کے مقابلے میں ثابت قدمی تھی۔

وہ اللہ تعالیٰ اور اُس کی مقدّس تعلیمات پر کامل ایمان رکھتے تھے اور اِس راہِ حق میں انھیں مال اور جان قربان کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔

اُنھوں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے مشرکین کی دھمکیوں اور زیادتیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور پوری خاطر جمعی کے ساتھ ثابت قدم رہے اور ایسے لوگوں کی ایک جماعت تیّار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو خطروں اور تکالیف کے مقابلے میں ہرگز نہیں گھبراتے اور سخت سے سخت حوادث کا پوری قوت اور پامردی سے مقابلہ کرتے تھے۔

جو لوگ رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی سالوں میں بے حد مشکل حالات میں آپ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں بے انتہا مصیبتیں جھیلیں اور ان کا پوری قوّت سے مقابلہ کیا ان میں عیاش ابنِ ابی ربیعہ اور ان کی زوجہ اسما بنتِ سلامہ شامل ہیں۔

عیاش، ماں کی جانب سے ابوجہل اور حارث کے بھائی تھے اور جب اُنھوں نے اسلام قبول کیا اُس وقت اُن کی عمر تیس سال تھی اور ان کی بیوی کی عمر

---

[۱] سورۃ ہود - آیت ۱۱۲

بیس سال تھی۔
عیاش کے اسلام قبول کرنے پر ان کے اہل خاندان کو بہت طیش آیا اور انھیں آنحضرتؐ کی پیروی سے باز رکھنے کے لیے اُن لوگوں نے بہت تکلیفیں دیں لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اسلام کی پیروی میں ثابت قدم رہے۔
عیاش اور اُن کی اہلیہ نے رسول اکرمؐ کی مرضی کے مطابق حبشہ کی جانب ہجرت کی لیکن دوسروں سے پہلے ہی مکّہ واپس آ گئے اور دوبارہ مُشرکین کے شکنجے میں پھنس گئے حتّٰی کہ رسولِ اکرمؐ کی ہجرت کا وقت آ گیا اور مسلمانوں نے مکّہ سے مدینہ ہجرت کر کے دشمنوں کے شر سے نجات پائی۔
جب عیاش کی ماں اسمار کو اُن کی ہجرت کا علم ہوا تو اُس نے قسم کھائی کہ جب تک میرا بیٹا واپس نہیں آئے گا میں نہ تو اپنے سر میں تیل ڈالوں گی اور نہ ہی سائے میں بیٹھوں گی۔ چنانچہ ابوجہل اور حارث مدینہ جا کر عیاش سے ملے اور انھیں اُن کی ماں کی قسم کے بارے میں اطّلاع دی اور کہا:

"تم ماں کو اپنے سب بچّوں سے زیادہ عزیز ہو اور ایک ایسے مذہب پر ایمان رکھتے ہو جو والدین سے نیکی کرنے کی تلقین کرتا ہے لہٰذا تمھیں چاہیے کہ واپس مکّہ چلو۔ وہاں تم اپنے خدا کی اسی طرح عبادت کرتے رہنا جیسے کہ اب مدینے میں کرتے ہو۔"

عیاش اپنی ماں کی قسم کے متعلّق سُن کر بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں کا کہا مان لیا اور اُن سے یہ وعدہ لے کر کہ اِن کے مکّہ پہنچنے پر اِن سے کوئی دھوکا نہیں کیا جائے گا اُن کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہو گئے لیکن جب وہ لوگ شہر سے کچھ دُور پہنچے تو آزار اور اذیّت کا آغاز ہو گیا۔ بھائیوں نے عیاش کے بازو اُن کی پُشت پر باندھ دیے اور انھیں اسی حالت میں لے کر دن دہاڑے مکّہ میں

داخل ہوئے اور بہ آوازِ بلند کہا :

"اے اہلِ مکّہ ! اپنے اُن نادان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے اسلام قبول کرلیا ہے ایسا ہی سخت سلوک کرو جیسا کہ ہم نے اپنے احمق بھائی سے کیا ہے۔"

پھر اُنھوں نے اپنے تمام وعدے بھُلا کر عیاش کو ایک ایسی کوٹھری میں نظربند کر دیا جس کی کوئی چھت نہ تھی اور جس میں قیام سخت تکلیف دہ تھا۔

عیاش چند سال تک مکّہ میں قید رہے اور بے حد اذیّتیں اٹھاتے رہے لیکن اس تمام مدّت میں ان میں عقیدے کی کمزوری یا روحانی شکست کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔ ان کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم تھا اور وہ اپنے ایمان کی قوت سے تمام مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے۔

رسول اکرمؐ مدینے میں عیاش کی رہائی کے لیے مکرّر دُعا فرماتے تھے اور سب لوگوں کو اپنے اس بھائی کی تکلیف کا بے حد احساس تھا۔ بالآخر ایک مسلمان خفیہ طور پر مکّہ پہنچا اور ایک ماہرانہ منصوبے کے مطابق عیاش کی رہائی کی راہ نکالی اور پھر دونوں مدینہ واپس آگئے۔ [1]

رسولِ اکرمؐ کے مکتب میں پرورش پانے والے دوسرے لوگ بھی استقامت کی دولت سے مالامال تھے۔

رسولِ اکرمؐ کی ثابت قدمی

اللہ تعالیٰ کی راہ میں رسولِ اکرمؐ کی ثابت قدمی آپ کے پیروؤں کے لیے ایک عملی سبق تھا اور اُنھوں نے آنحضرتؐ کے طرزِ عمل سے مستقل مزاجی اور

---

[1] شبابِ قریش۔ صفحہ ۱۲۸ ۔ جوان ، جلد ۲۔ صفحہ ۱۶۱

استقامت کے طور طریقے سیکھے۔

مکّہ کے بُت پرستوں نے دینِ اسلام کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے بات چیت اور دلفریب وعدوں کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے حضرت ابو طالبؑ سے کہا:

"آپ اپنے بھتیجے محمد (ص) سے بات کریں اور اُن سے پوچھیں کہ بُتوں کی مخالفت کر کے اور لوگوں کو اَن دیکھے خدا کی طرف دعوت دے کر وہ دراصل چاہتے کیا ہیں؟ اگر وہ دولت کے خواہش مند ہیں تو ہم بیش بہا دولت اُن کے حوالے کرنے کو تیار ہیں اور اگر وہ حکومت چاہتے ہیں تو ہم اُنھیں اپنا حاکم مانے لیتے ہیں۔"

حضرت ابو طالبؑ نے کفّارِ مکّہ کا پیغام رسولِ اکرمؐ کو پہنچا دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"چچا جان! آپ مکّہ کے لوگوں کو بتا دیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک ذمّے داری سونپی گئی ہے جسے پورا کرنا میرا فرض ہے۔ میرا مقصد اللہ کی رضا اور اُس کے احکام نافذ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اگر اہلِ مکّہ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں تو میں اپنی دعوت سے دست بردار نہیں ہوں گا۔"

جب کفّار کو اس طریقِ کار سے مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے باقاعدہ لڑائی کا آغاز کر دیا اور مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے اذیتیں پہنچانے لگے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنا پڑی اور بعد میں خود رسولِ اکرمؐ بھی ہجرت فرما کر مکّہ سے مدینہ منتقل ہو گئے۔

بعد ازاں بھی لڑائی بدر، اُحد اور خندق وغیرہ کے غزوات کی شکل میں جاری رہی۔

تاہم ان میں سے کسی جنگ نے بھی رسول اکرمؐ کے پختہ ارادے پر کوئی اثر نہ ڈالا اور آپ نے ان تمام لڑائیوں کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں آپ اسلام کے مقدس دین کو اُس زمانے کی دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہوگئے اور اُن نیم وحشی لوگوں میں سے انسانی اوصاف سے مزین ایک ترقی یافتہ قوم کو وجود میں لے آئے۔

ایک نکتہ جس کی جانب یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ استقامت کا سختی اور کرختگی کے ساتھ ہونا لازم ہے۔ اگر ایک با استقامت شخص کو پہاڑ سے تشبیہ دی جاتی ہے تو یہ اُس کی طوفانوں اور سیلابوں اور حوادث کے مقابلے میں پائیداری کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ اُس کی سختی کی بنا پر۔

رسولِ اکرمؐ جو استقامت کا مکمّل اور ممتاز نمونہ تھے بے حد خوش اخلاق، نرم دل اور مہربان تھے اور اُن کی یہی خوش اخلاقی اُن کی کامیابی کا موجب تھی۔

اپنی شخصیّت کو قائم رکھنے اور اجتماعی ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے سلسلے میں اجتماعی حوادث میں لچک اور نرمی اہم اور بنیادی مسائل میں سے ایک ہے جو لوگ حوادث کا سامنا عقلمندی سے کرتے ہیں اور ہٹیلے پن اور نامناسب مزاحمت سے پرہیز کرتے ہیں وہ بخوبی مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں اور اپنی شخصیّت ثابت کر دیتے ہیں۔ اِس کے برعکس جو لوگ ضدّی اور سخت دل ہوتے اور حوادث کا بے موقع مقابلہ کرتے ہیں وہ اپنی شخصیّت کو توڑ پھوڑ لیتے ہیں اور اکثر مصیبتوں میں پھنس جاتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے

مَثَلُ الْمُؤْمِنِ مَثَلُ السُّنْبُلَةِ يُحَرِّكُهَا الرِّيحُ
فَتَقُومُ مَرَّةً وَتَقَعُ أُخْرٰى وَمَثَلُ الْكَافِرِ مَثَلُ

الْاَرْزَةِ لَا تَزَالُ قَائِمَةً حَتّٰى تَنْقَعِرَ"۔ [1]

"ایک ایماندار شخص حوادث کے طوفان کے مقابلے میں ایک انگور کے پکے ہوئے خوشے کی مانند ہے جو ہوا چلنے پر زمین پر جھک جاتا ہے اور جب ہوا رک جاتی ہے تو دوبارہ اونچا ہو جاتا ہے اور اس طریقے سے واقعات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور حوادث کے شر سے محفوظ رہتا ہے لیکن ایک کم عقل کافر کی مثال ایک صنوبر کے درخت کی ہے وہ بغیر سوچے سمجھے اور بیجا طور پر حوادث کے طوفان کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر ہوا کے زبردست دباؤ کی وجہ سے جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے"۔

ایک تندرست انسان جو اپنے اندر لچک اور عام حالت پر واپس آجانے کی قوّت رکھتا ہے وہ ہر شکست برداشت کر لیتا ہے اور دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور نئے سرے سے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیتا ہے اور چونکہ اُس کے ترکش میں کئی ایک تیر ہوتے ہیں اس لیے اگر اس کے لیے ایک راستہ بند ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے راستے پر چل کھڑا ہوتا ہے اور ایک نیا مقصد چُن لیتا ہے۔ اِس کے برعکس ایک بیمار روح کو فقط ایک مقصد اور ایک راستہ نظر آتا ہے اور اگر اس راستے میں کوئی دقّت پیش آئے تو ایسا شخص ہمّت ہار جاتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے۔ ایک شخص میں حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت جتنی زیادہ ہو اتنا ہی وہ شکست سے کم ڈرتا ہے اور کامیابی کے میدان پر بہتر طور پر قبضہ کرتا ہے اور اُسے اپنی اُمنگ، استعداد اور کوشش کی جولانگاہ قرار دیتا ہے اور اگر اُس میں اِس صلاحیّت کا فقدان ہو تو وہ بہت جلد مقابلے کے میدان سے خارج ہو جاتا ہے اور ناکامی کے دُکھ سے دوچار ہو جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر روح البیان - جلد ۴ - صفحہ ۳۵۶

یہ ضروری ہے کہ استقامت ہمیشہ متانت اور متحمّل مزاجی کے ہمراہ ہوتاکہ انسان کو کامیابی اور فتح سے ہمکنار کرسکے۔

رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ کوئی مُشرک آپ سے سختی سے پیش آیا اور گو آپ ایسے لوگوں کو سزا دینے کی قدرت رکھتے تھے لیکن آپ صحابہ کو ان سے سختی سے پیش آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ ایسے شخص سے بڑی خوش اخلاقی اور مہربانی سے خود گفتگو فرماتے تھے اور بالآخر اُسے اسلام کی طرف راغب کر لیتے تھے۔

قرآنِ مجید اس بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

"(اے رسولؐ) یہ اللہ کی رحمت اور عنایت ہے کہ آپؐ لوگوں کے لیے نرم دل ہو گئے اور اگر آپ تُند مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ کب کے آپ کے اردگرد سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔ پس آپ اِن کی لغزشوں سے درگزر کیا کریں اور اِن کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اور مختلف معاملات میں اِن سے مشورہ کر لیا کریں اور جب آپ کسی کام کا مصمّم ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیں کیونکہ جو لوگ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اللہ اِنھیں ضرور دوست رکھتا ہے۔" [1]

یہاں جس چیز کی وضاحت کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو آیت اوپر نقل کی گئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کو ہدایت کی ہے کہ آپ اپنے صحابہ سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ مشورہ عام مسائل مثلاً جنگ، صلح وغیرہ کے بارے میں ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک قوانینِ اسلام وضع کرنے کا تعلّق ہے نہ صرف یہ کہ صحابہ اِس میں کوئی دخل نہیں دے سکتے تھے بلکہ آنحضرتؐ کا بھی ان کے وضع کرنے میں کوئی دخل نہ تھا۔

---

[1] سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۵۹

یہ قوانین اور احکام اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنحضرتؐ پر نازل ہوتے تھے اور آپ انھیں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔

تہذیبِ اخلاق میں اِستقامت

ایک مسئلہ جس میں استقامت ہر شخص کے لیے ضروری ہے اچھے اخلاق اور عادتیں اپنانے اور بُری عادتوں اور خصلتوں کے ترک کرنے کا ہے۔

انسان کی پیدائش کے وقت اس میں نہ اچھی عادات اور صفات ہوتی ہیں اور نہ بُری۔ لیکن رفتہ رفتہ والدین، اُستادوں اور معاشرے کے طور طریقوں سے متاثر ہو کر وہ اچھی یا بُری عادات اور صفات اپنا لیتا ہے۔

اچھی عادات اور صفات کی حفاظت کرنی چاہیے اور اِن کی حفاظت کے لیے استقامت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اِن کی حفاظت کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ بہت جلد انھیں کھو بیٹھتا ہے۔

بُری عادات اور صفات کو ترک کرنے کے لیے بھی کوشش اور استقامت ضروری ہے تاکہ ان کی جگہ اچھی عادات اور صفات کو اپنایا جا سکے۔

اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ بُری عادات اور صفات کو بدلنا ممکن نہیں تو وہ غلطی پر ہے۔ جس چیز کا تجربے سے پتا چلتا ہے اور جسے ماہرینِ نفسیات بھی تسلیم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ پختہ ارادے اور ثابت قدمی کے ذریعے تمام انسانی صفات کا بدلنا ممکن ہے۔ لہٰذا اگر خاندان کی غلط تربیت یا معاشرے کی خرابیوں کے زیرِ اثر ایک شخص کی اُٹھان ٹھیک نہ ہوئی ہو اور وہ معاشرے کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کر سکے تو اُسے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ بدنصیب اور محروم رہے گا۔ بلکہ وہ مصمم ارادہ کر کے اپنی اصلاح کر سکتا ہے اور ایک عمدہ

شخصیّت کا مالک بن سکتا ہے۔

دینی اور علمی نقطۂ نگاہ سے ایسے شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی بُری عادتوں کا مقابلہ کرے اور جو بُرے اخلاق اُس کی محرومی کا باعث بنے ہوں انھیں اپنے دل کے صفحے پر سے مٹا دے اور اچھّی عادات اور صفات اپنا کر اپنی کامیابی کی داغ بیل ڈالے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"لَا تَتْرُكِ الْاِجْتِهَادَ فِیْ اِصْلَاحِ نَفْسِكَ فَاِنَّهُ لَا یُعِیْنُكَ عَلَیْهَا اِلَّا الْجِدُّ"۔[1]

"اپنے نفس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا ہرگز ترک نہ کرو کیونکہ کوشش کے علاوہ اور کوئی چیز اس کام میں تمھاری مدد نہیں کر سکتی"۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"اَیُّهَا النَّاسُ تَوَلَّوْا مِنْ اَنْفُسِكُمْ تَاْدِیْبَهَا وَاعْدِلُوْا بِهَا عَنْ ضَرَاوَةِ عَادَاتِهَا"۔[2]

"اے لوگو! اپنے نفس کی اِصلاح کی ذمّے داری سنبھالو اور اسے بُری عادتوں سے روکو"۔

امام الصّادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"اِقْصِرْ نَفْسَكَ عَمَّا یَضُرُّهَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تُفَارِقَكَ وَاسْعَ فِیْ فِكَاكِهَا كَمَا تَسْعٰی فِیْ طَلَبِ مَعِیْشَتِكَ

---

[1] غرر الحکم ۔ صفحہ ۸۱۸

[2] نہج البلاغہ ۔ کلمہ ۳۵۱

فَاِنَّ نَفْسَكَ رَهِيْنَةٌ بِعَمَلِكَ"۔ [1]

"مرنے سے پہلے اپنے نفس کو اُس چیز سے روکو جو اِس کے لیے مُضر ہے اور اپنی روح کی آزادی کے لیے اِسی طرح کوشش کرو جس طرح روزی کمانے کے لیے کوشش کرتے ہو کیونکہ تمھاری روح تمھارے اعمال کے قبضے میں ہے اور تمھاری کوشش کے بغیر آزاد نہیں ہو سکتی۔"

جو عادتیں ہم نے سالہا سال سے اپنا رکھّی ہوں اور ہماری فطرتِ ثانیہ بن گئی ہوں وہ راتوں رات ہمارے دماغ سے محو نہیں ہو سکتیں تاہم خوش قسمتی سے اگر ہم عقل و شعور اور پختہ ارادے سے کام لیں اور جلد بازی نہ کریں تو ہر عادت خواہ وہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو جتنی دیر میں پیدا ہوئی تھی اُس کے مقابلے میں بہت جلد دُور ہو جائے گی۔

ہمیں چاہیئے کہ پہلے ان عام قوانین کو سمجھیں جو انسان کے وجود پر حکومت کرتے ہیں اس کے بعد خود اپنے آپ کو جتنا بہتر طور پر سمجھ سکیں سمجھیں یعنی یہ جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کون سی عادتیں اور اخلاق ہیں جنھیں ہم بدلنا چاہتے ہیں اور ان کی جگہ کون سی عادات کو اپنانا اور انھیں ترقّی دینا چاہتے ہیں۔ بالخصوص ہمیں اس بات کا پتا لگانا چاہیئے کہ ہمارے اندر وہ کون سی خاص قابلیّت موجود ہے جو ہمیں زندگی میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ اِن چیزوں کی صحیح صحیح تشخیص کر لینے کے بعد ہمیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کی صفات سے آراستہ کریں اور اس بات کا خیال رکھّیں کہ جس اصلاح کو بروئے کار لانے کا ہم نے ارادہ کیا ہے جب تک وہ ہمارے اندر پیدا نہ ہو جائے محنت اور کوشش ترک نہ کریں۔

ظاہر ہے کہ جو عادتیں انسان کے اندر جڑ پکڑ چکی ہوں انھیں ترک کرنے

---

[1] وسائل۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۰

کے لیے کوشش اور مستقل مزاجی ضروری ہے لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ اگر کوئی شخص پختہ ارادے کے ساتھ کوئی کام شروع کرے اور اس کی انجام دہی میں ثابت قدم رہے تو وہ کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

مشکلات میں استقامت

ہر شخص کو اپنی زندگی میں ایسی پریشانیاں اور مشکلات پیش آتی ہیں جنھیں صبر اور مستقل مزاجی کے بغیر دُور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

جو اشخاص اپنے آپ کو استقامت کے ہتھیار سے لیس کر لیتے ہیں اُن کے لیے مشکلات کا مقابلہ کرنا اور اُن پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے اور وہ اِن مشکلات کو بخوبی اپنے راستے سے دُور کر سکتے ہیں۔

قرآنِ مجید لوگوں کو اِس بات کی ہدایت کرتا ہے کہ پریشانیوں اور مشکلات کے عالم میں وہ صبر، ثابت قدمی اور نماز سے مدد حاصل کریں۔

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ[1]

"یعنی صبر اور نماز کے ذریعے اللہ کی مدد مانگو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ثابت قدمی اور مدد حاصل کرنے کا سوال اِس لیے پیدا ہوتا ہے کہ انسان تنہا زندگی کی مشکلات حل نہیں کر سکتا اور چونکہ درحقیقت اللہ کے علاوہ انسان کا کوئی مددگار نہیں اس لیے مدد بھی اسی سے مانگنی چاہئیے۔ یہ مدد استقامت، صبر اور قربِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے اور اِسی کو "صبر و صلوٰۃ" کہا گیا ہے۔ درحقیقت یہ دو چیزیں (استقامت اور نماز) مشکلات کا مقابلہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ کیونکہ صبر اور ثابت قدمی

[1] سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۵۳

کی بدولت بڑی سے بڑی مشکل چھوٹی ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دینے اور اس کی پناہ مانگنے سے انسان کے اندر ایمان کی قوت بیدار ہوتی ہے اور اسے پتا چل جاتا ہے کہ ان سخت اور مشکل دنوں میں وہ بے سہارا نہیں ہے اور اُسے پروردگارِ عالم کا مضبوط آسرا میسّر ہے۔ [1]

امام علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

تَجَلْبَبِ الصَّبْرَ وَالْيَقِيْنَ فَاِنَّهُمَا نِعْمَ الْعُدَّةُ فِي الرَّخَاءِ وَالشِّدَّةِ۔ [2]

"صبر اور یقین کا لباس پہن لو کیونکہ آسائش کے زمانے اور مشکلات اور تکلیف کے دنوں میں یہ اچھی پناہ گاہ ہے۔"

اس بارے میں چند اشعار بھی امیر المومنین علیہ السّلام سے منسوب ہیں جن میں آپ فرماتے ہیں:

هِيَ حَالَانِ، شِدَّةٌ وَرَخَاءٌ
وَسَجَالَانِ، نِعْمَةٌ وَبَلَاءٌ
وَالْفَتَى الْحَاذِقُ الْاَدِيْبُ اِذَا
مَا خَانَهُ الدَّهْرُ لَمْ يَخُنْهُ عَزَاءٌ
اِنْ اَلَمَّتْ مُلِمَّةٌ بِيْ فَاِنِّيْ
فِي الْمُلِمَّاتِ صَخْرَةٌ صَمَّاءٌ

"انسان کی زندگی کی دو حالتیں ہیں۔ کبھی سختی اور تکلیف ہوتی ہے اور کبھی آرام اور آسائش ہوتی ہے۔ کبھی انسان نعمتوں میں ڈبکیاں لگاتا ہے

---

[1] تفسیر المیزان از علامہ محمد حسین الطبا طبائی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۵۲

[2] غرر الحکم۔ کلمہ ۴۵۰۹

اور کبھی مصیبتوں میں غرق ہوتا ہے ۔ اگر زمانہ ایک باشعور اور دانا شخص کے ساتھ سخت برتاؤ کرے تو وہ صبر اور خودداری اختیار کرسکتا ہے اگر ایک دن مجھ پر مصیبتیں ٹوٹ پڑیں تو میں اُن کے مقابلے میں پتّھر کی طرح مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما رہوں گا۔"

جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے امام علی علیہ السّلام تمام عمر مشکلات اور مصائب سے دوچار رہے کیونکہ دس سال کی عمر سے لے کر جب کہ انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی خدمت پر کمر باندھی زندگی کے آخری لمحات تک انھیں ہزاروں خطرات کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے ہر موقع پر ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کیا :

○ ═══ جس رات آپ رسولِ اکرمؐ کے بستر میں سوئے (لیلۃ المبیت) اور آنحضرتؐ نے رات کے وقت مکّہ سے مدینہ ہجرت فرمائی ۔

○ ═══ جب مسلمان عورتوں کی سرپرستی کی ذمّے داری آپ کے سپرد ہوئی اور آپ نے انھیں مدینہ پہنچایا ۔

○ ═══ جب جنگِ بدر میں آپ نے کینہ ور قریش کے خلاف جنگ کی اور مکّہ کے متعدّد جنگجوؤں کو خاک و خون میں ملا دیا ۔

○ ═══ جب جنگِ اُحد کے دَوران آپ اسلام کے واحد سپاہی تھے جو باقی رہ گئے اور آپ نے رسولِ اکرمؐ کا دفاع کرتے ہوئے اپنے جسم پر نوّے زخم کھائے اور لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار کا تمغہ پانے کا اعزاز حاصل کیا ۔

○ ═══ جب جنگِ خندق میں آپ نے عمرو بن عبدوَد سے جنگ کی اور اُن نازک لمحات میں اسلام کو تباہی سے بچایا ۔

○ ═══ جب جنگِ خیبر میں بعض مسلمان نما لوگوں کے فرار کے نتیجے

○ ═══ یں اسلام کو پے در پے شکستوں سے دوچار ہونے کے بعد آپ نے میدان میں قدم رکھا اور یہودیوں کے مضبوط قلعے فتح کیے۔

○ ═══ جب رسولِ اکرمؐ کے حکم کے مطابق آپ سورۂ برارت پڑھنے کے لیے مکّہ آئے اور انتہائی خطرناک ماحول میں اپنا فریضہ ادا کیا۔

○ ═══ اور جب رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں ساز باز کی گئی اور منصبِ خلافت جو آپ کا مسلّم اور ناقابل انکار حق تھا غصب کر لیا گیا۔

○ ═══ اور جب فدک کو جو آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی مسلّمہ ملکیّت تھا اور اُن کے تصرّف میں تھا کسی جواز کے بغیر اُن کے قبضے سے چھین لیا گیا۔

○ ═══ اور جب قرآنِ کریم کی نص کے برخلاف اُم المومنین جناب عائشہ نے آپؑ کے مقابلے میں آکر جنگ جمل چھیڑ دی۔

○ ═══ اور جب معاویہ نے آپ کے خلاف جنگ صفّین کا آغاز کیا اور جب آپ کی مرضی اور حکم کے خلاف حکمیّت کا معاملہ وجود میں لایا گیا۔

○ ═══ اور جب نہروان کے خوارج نے آپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور جنگِ نہروان کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اور کئی ایک اور مواقع پر جو سراسر مصائب اور تکالیف سے عبارت تھے امام علی علیہ السّلام چٹان کی مانند اپنی جگہ پر جمے رہے اور اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

امام علیؑ ابنِ ابی طالب اپنے ایک خطبے میں جو "خُطبۂ شِقشِقیّہ"
کے نام سے مشہور ہے رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد اپنے آپ کو پیش آنے والے چند مصائب
کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی خودداری اور صبر و استقامت کا ذکر کرتے ہیں۔

آپؑ فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم۔ خلافت کا لباس اپنے ناموزوں بدن پر پہنتے وقت ابوقحافہ کے بیٹے کو اچھّی طرح معلوم تھا کہ یہ قمیص فقط میرے جسم کے لیے موزوں اور متناسب ہے۔

وہ بخوبی جانتا تھا کہ امامت کا آسمان میرے وجود کے محور کے بغیر نہیں گھوم سکتا اور اس چکّی کو جب تک میں نہ گھماؤں یہ کام نہیں کر سکتی۔

میں وہ بلند پہاڑ ہوں جس کے سینے سے علم و فضل کی ندیاں سیلاب کی مانند پھوٹتی ہیں اور زندگی کے مرغزار کو جس نے میری پناہ میں دامن پھیلا رکھّا ہے سرسبز اور شاداب کرتی ہیں۔

کوئی بلند اُڑنے والا پرندہ میری چوٹی پر آشیانہ نہیں بنا سکتا کیونکہ انسان کے خیال کے شاہباز کے لیے اتنی بلندی تک اُڑنا ممکن نہیں۔

ان سب چیزوں کے باوجود میں لوگوں کے شور و غل سے دُور رہا۔ میں نے اپنا دامن ان نجس اور بددیانت اشخاص کی طرف سے سمیٹ لیا اور اپنے اچھّے دلوں کے ساتھیوں کو تعجّب سے دیکھتا رہا۔

بعض اوقات میں سوچتا تھا کہ تنِ تنہا اُٹھ کھڑا ہوں اور گو ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی پھر بھی اپنے حق کی بحالی کے لیے دنیا کو ہنگامے اور بے چینی سے پُر کر دوں لیکن بعد میں میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ

اِس حواس باختہ کر دینے والی سیاہی پر جو اِسلام کے اُفق پر چھاگئی ہے صبر کروں۔

میں نے سوچا کہ اِس گھٹاٹوپ اندھیرے میں جس نے بوڑھوں کو ناکارہ اور جوانوں کو پژمُردہ اور بوڑھا بنا دیا ہے اور ضمیر کی آواز کو بدترین طریقے سے دبا دیا ہے میرے لیے بہتر یہی ہے کہ بردباری اور تحمّل اختیار کروں۔

مجھے اپنے حلق میں صبر کا ذائقہ بے حد کڑوا اور ناگوار لگ رہا تھا۔ میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے کہ ایک کانٹا مسلسل میری آنکھ میں چُبھ رہا ہے اور مجھے پَل بھر کو چین نہیں لینے دیتا یا یہ کہ ایک ہڈی میرے گلے میں اٹکی ہوئی ہے جو لحظہ بلحظہ میرے لیے سانس لینا دشوار کر رہی ہے۔ میرے لیے وہ صورت کیوں ناگوار نہ ہوتی جبکہ میری میراث ایک گیند کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی جانب لڑھک رہی تھی اور میری حیثیّت جس کا احترام رسول اکرمؐ کے زمانے میں خانۂ خدا کی طرح کیا جاتا تھا اب اس کا کوئی احترام باقی نہ رہا تھا۔

اعشیٰ ہمدانی کا یہ شعر میرے مناسبِ حال ہے :

" یہ زندگی جو میں اب اونٹ کی ناہموار پیٹھ پر بیابانوں میں گزار رہا ہوں جابر کے بھائی حیّان کی شاندار اور شاہانہ زندگی سے مقابلے کے قابل نہیں ہے "

میں جو رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں بڑا اعلیٰ مقام رکھتا تھا آنحضرتؐ کے بعد اعشیٰ ہمدانی ہوگیا تاکہ شتربانی کروں اور سفر کی تکلیفیں اُٹھاؤں۔

لیکن پھر بھی میں نے صبر کیا۔

وہ اپنی زندگی میں بار بار کہتا تھا:

"جب تک ابوطالب کا بیٹا زندہ ہے میں امامت کے قابل نہیں ہوں!"

لیکن کتنے تعجّب کی بات ہے کہ جب ابھی اُس کی عمر کے چند دن باقی تھے اُس نے خلافت کی دلہن دوسرے کی گود میں ڈال دی اور ایک ایسے شخص کی گود میں ڈالی جو خودسر اور بدمزاج تھا اور جس کی زندگی سراسر غلطیوں، غلطیوں کے اعتراف اور عذرخواہی سے عبارت تھی۔ جو لوگ اُس کے پاس رہتے تھے وہ بڑی پریشانی میں وقت گزارتے تھے اور اس کی بداخلاقی کی وجہ سے تکلیف اُٹھاتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص ایک سرکش اُونٹ کی مانند تھا جس کی مہار اُس کی ناک کے سُوراخ سے گزرتی ہے اور وہ شتر سوار کو حیرت اور شک میں ڈال دیتا ہے کیونکہ اگر وہ مہار کو اپنی طرف کھینچے تو اُونٹ کی ناک پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اگر اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دے تو ممکن ہے کہ وہ اپنی سرکشی اور ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ڈھلوان سے نیچے کُود پڑے۔

اس تمام عرصے میں میرے لیے اس تکلیف اور عذاب پر صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اور اس مصیبت میں مبتلا مسلمانوں کو میں ہمدردی اور عبرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا حتیٰ کہ اِس گستاخ شخص کا دَور بھی ختم ہوا اور خلافت کا مسئلہ مجلسِ شوریٰ کے سپرد ہوا۔

میں ایک ایسی مجلسِ شوریٰ کا رکن بنا جس کے بارے میں میں نے زندگی بھر میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ میں اُن چھ اشخاص میں سے ایک تھا

جن کے سروں پر ہُمائے خلافت یہ طے کرنے کے لیے اُڑ رہا تھا کہ ان میں سے کس پر فتحمندی کا سایہ ڈال دے۔

مجھے ایسے پانچ اشخاص کا ہم پلّہ بننا پڑا جو رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں میری ماتحتی میں سپاہی کے طور پر جنگ کرتے تھے اور جنھیں میری برابری کا خیال کبھی خواب میں بھی نہ آیا تھا۔

پھر بھی میں نے حالات سے سمجھوتہ کیا اور مجلسِ شوریٰ میں شامل ہوا اور تمام نشیب و فراز میں ان کی پیروی کی۔

اس مجلس میں دین اور تقویٰ کے سوا باقی ہر چیز کا خیال رکھّا گیا اور رشتہ داری اور دوستی کے لحاظ کے علاوہ ہزاروں دوسری شرمناک باتیں بھی وقوع پذیر ہوئیں۔ تین دن کے بعد قرعۂ خلافت تیسرے شخص کے نام پڑا جس طرح بہت سا چارا کھا جانے پر اونٹ کے دونوں پہلو پھول جاتے ہیں اسی طرح اس شخص کا سینہ میرے متعلّق دشمنی اور کینے سے بھرا ہوا تھا۔

اس کے چچا زاد بھائیوں نے موقع غنیمت جانا اور خلیفہ کی حیثیت کا سہارا لیتے ہوئے ظلم و ستم پر کمر باندھ لی۔ اور خوب دل کی بھڑاس نکالی بالآخر وہ بھی سفید بالوں اور سیاہ چہرے کے ساتھ خون آلود لباس میں مٹّی تلے دب گیا۔

اب مجھ میں خلافت کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کی تاب نہیں رہی تھی اور اس طویل اور طاقت فرسا مدّت میں میرے قویٰ جواب دے چکے تھے لیکن لوگوں کے ہجوم نے جو بجّو کی گردن کے بالوں کی طرح ایک جگہ جمع ہو گئے تھے چاروں طرف سے میرا دامن یوں پکڑ رکھّا تھا کہ ان

کی دھکّا پیل سے میرے دونوں پہلو درد کرنے لگے۔ اس کے علاوہ میں ڈرتا تھا کہ رسولِ اکرمؐ کی دو یادگاریں یعنی حسن اور حسین لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں تلے کچلے نہ جائیں۔ ان چیزوں نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ گڈریے کا لباس پہن لوں اور اس گلّے کا مہربان اور غمخوار رکھوالا بن جاؤں جو بھیڑیوں کے حملے کی زد میں آ کر تتر بتر ہو چکا تھا۔

بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہی لوگ جنھوں نے بڑے اصرار اور خواہش کے ساتھ بیعت اور متابعت کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا میری متابعت سے منحرف ہو گئے اور رسولِ اکرمؐ کی بیوی کو ایک زرہ پوش ہودج میں بٹھا کر نادان لوگوں کے ایک گروہ کو جمع کیا اور بصرہ میں جنگِ جمل چھیڑ دی۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بے دین اور فاسق گروہ نے جس کے ظلم و ستم کی راہ میں عثمان نے بھی اپنی جان کی قربانی دی تھی صفّین کی خونی جنگ کی تیاری کی اور قتلِ عثمان کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔

آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ قرآنِ مجید کے حافظ اور میرے مخلص پیرو دین سے خارج ہو گئے اور نہر (نہروان) کے کنارے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئے۔

کیا انھوں نے نہیں سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کیا فرمایا ہے؟:

"قیامت کے دن جاہ طلب اور بدکار ظالم لوگ ہماری رحمت سے بہرہ ور نہ ہوں گے"۔ [1]

---

[1] سورۃ القصص۔ آیت ۸۳

ہاں ۔ سُنا ہے لیکن ہوس اور لالچ کے اشتعال کے پردۂ غفلت نے اُن کی دیکھنے والی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے اور انھیں حقائق کو سمجھنے سے محروم کر دیا ہے۔

اللہ کی قسم فقط مسلمانوں اور بیکس مظلوموں کی ہمدردی نے خلافت کی بھاری ذمّے داری میری گردن پر ڈال دی ورنہ میں اِس سرکش سواری کی باگ جس قدر جلد ممکن ہوتا اس کی پیٹھ پر ڈال دیتا اور اسے دُنیا کی طرح طلاق دے دیتا۔ اُس وقت تمھیں یقین آجاتا کہ دنیا جو تمھیں عزیز ہے میری نگاہوں میں مُردار سے بھی بدتر ہے۔" [1]

یہ تھے چند نمونے امیرالمومنین علیہ السّلام کے صبر اور استقامت کے جن کی تشریح آپ نے خود فرمائی ہے اور جن میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں ہے ۔

آپؑ کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے انسان کو تکالیف اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت کا درس ملتا ہے اور آپ کے اقوال بھی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سکھاتے ہیں۔

امام علی علیہ السّلام فرماتے ہیں :

"لَمْ يَعْدِمِ النَّصْرَ مَنِ انْتَصَرَ بِالصَّبْرِ" [2]

"جو شخص صبر اور استقامت کی قوّت سے لیس ہو وہ فتح اور کامیابی سے محروم نہیں رہتا"

تاریخ کی عظیم شخصیتوں کی زندگی ہمیشہ پریشانیوں اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت سے توام رہی ہے ۔ چنانچہ استقامت کو ان معانی میں بڑے آدمیوں کی زندگی کا لازمہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ کسی شخص کو تکالیف اور مصائب برداشت کیے

---

[1] ماخوذ از نہج البلاغہ

[2] غرر الحکم ۔ کلمہ ۷۵۳۸

بغیر بڑائی اور عظمت نصیب نہیں ہوتی۔

ساسانی بادشاہ انوشیروان اپنے وزیر بزرجمہر سے خفا ہوگیا۔ اُس نے بزرجمہر کو ایک کال کوٹھڑی میں بند کرا دیا اور حکم دیا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں ملا کر لوہے کی زنجیروں سے باندھ دیے جائیں۔

اُس دانا شخص نے بہت سے دن انتہائی تکلیف کے عالم میں قیدخانے میں گزار دیے۔ پھر انوشیروان نے ایک شخص کو اس کے پاس اس مقصد سے بھیجا کہ دیکھے کہ وہ کس حالت میں ہے اور تکالیف اور مصائب نے اس کے ذہن پر کیا اثر ڈالا ہے۔

وہ شخص بزرجمہر کے پاس پہنچا اور اس نے خلاف توقّع اُسے ذہنی طور پر پُرسکون اور مطمئن پایا۔ یہ دیکھ کر اُسے تعجّب ہوا اور اُس نے کہا:

"اے بزرگ حکیم! ان تمام تکلیفوں اور پریشانیوں کے باوجود جو آپ کو جھیلنی پڑی ہیں میں دیکھتا ہوں کہ آپ خوش و خرّم اور مطمئن ہیں۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟"

بزرجمہر نے جواب دیا:

"میں نے چھ چیزیں ملا کر ایک دوائی تیّار کی ہے اور اُسے استعمال کرتا ہوں۔ تم میری جو کیفیّت دیکھ رہے ہو یہ اسی دوائی کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔"

اُس شخص نے کہا:

"میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ نسخہ مجھے بھی بتائیں تاکہ اِسے مصیبت کے وقت استعمال کرسکوں۔"

بزرجمہر نے کہا:

"وہ نسخہ یہ ہے:۔

پہلی مد : اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسا۔
دوسری مد : مقدّر سے فرار ممکن نہیں۔
تیسری مد : صبر و استقامت۔
چوتھی مد : اگر میں صبر نہ کروں تو پھر کیا کروں؟ اور میں بے صبری اور نالہ و فریاد کے ذریعے اپنی بربادی میں اعانت نہیں کروں گا۔
پانچویں مد : میری موجودہ حالت سے زیادہ تکلیف دہ اور طاقت فرسا حالات بھی ہوتے ہیں۔
چھٹی مد : وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نجات کی امیّد بھی ہوتی ہے۔"
بزرجمہر کے حکیمانہ اقوال انوشیروان کے گوش گزار کیے گئے اور اسے اس کی حالت کے بارے میں بھی اطلاع دی گئی۔
انوشیروان نے اُسے قید سے رہائی دی اور اسے عنایات سے نوازا۔ [1]

نتیجہ

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اِس سے ہم یہ نتائج اخذ کرتے ہیں :

- ہر کام میں کامیابی کا راز استقامت میں پوشیدہ ہے۔
- غلط مقاصد کے لیے مسلسل کوشش کرنا ضد ہے نہ کہ استقامت۔
- استقامت سختی کے ساتھ نہیں بلکہ ملائمت اور نرم خوئی کے ساتھ وابستہ ہونی چاہیے۔
- سب سے گرانقدر استقامت وہ ہے جو اللہ کی راہ میں اور

---

[1] داستانہای تاریخی۔ صفحہ ۵۷

روحانی مقاصد کی خاطر اختیار کی جائے۔

◎ —— استقامت کا سبق سیکھنے کا بہترین ذریعہ پیشوایان اسلام کی زندگیوں کا مطالعہ اور ان کے اقوال سے استفادہ کرنا ہے۔

"اسلام میں استقامت،، اس کتاب کا آخری باب قرار دیا گیا ہے کیونکہ درحقیقت صبر و استقامت ہی پیغمبروں کا شیوہ اور تمام انسانی خوبیوں کی بنیاد ہے۔ اسی کی بدولت انسان اس دنیا میں اپنے ایمان کی حفاظت کرسکتا ہے اور آخرت کی کامیابیوں اور مسرتوں سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ اس موضوع کو زیر بحث لانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ:

ہم یہ عہد کریں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مقبولؐ پر پورا پورا ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا دین صرف اور صرف اسلام ہے۔

ہم یہ عہد کریں کہ دینِ اسلام کو جو انسان کی سعادت کے لیے آیا ہے اور اس کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہے اپنے دل میں اس طرح جگہ دیں گے کہ ہمارے تمام افکار اس کی حمایت اور تصدیق کریں اور ہمارے اعمال ہمارے مومن ہونے کی گواہی دیں۔ ہماری زبان اس کا ذکر کرے اور قلم اس کی تائید کرے۔

ہم یہ عہد کریں کہ ہم پوری دُنیا کو اسلام سے روشناس کرائیں گے اور خود اپنے معاشرے میں اس کی صحیح اور اصلی شکل میں ترویج کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔

ہم یہ عہد کریں کہ ہم تعصّب اور تنگ نظری سے بالاتر رہ کر حق، عدالت اور اسلام کی حمایت کے لیے کام کریں گے اور اسی بنیاد پر مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے لیے دل و جان سے کوشاں رہیں گے۔

ﷺ ہم یہ عہد کریں کہ ہم اپنے معاشرے، ملک، دوسرے اسلامی ممالک بلکہ ساری دنیا میں کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت کریں گے اور انھیں آزادی دلانے کے لیے ظالم اور جابر استحصالی قوتوں سے برسرِ پیکار رہیں گے۔

ﷺ ہم یہ عہد کریں کہ ہم کسی کافر یا مسلم نما فاسق و فاجر اور ظالم شخص یا طبقے کو مسلمانوں اور اسلامی ممالک پر مسلّط نہیں ہونے دیں گے۔

خلاصہ یہ کہ

ﷺ ہم یہ عہد کریں کہ ہم اسلام کے زیرِ سایہ عدل، مساوات اور آزادی کا بول بالا کرنے کے لیے انتھک جدّوجُہد کریں گے اور اللہ کے سوا نہ کسی کے آگے سر جھکائیں گے اور نہ ہی کسی کی حکومت تسلیم کریں گے۔

خدائے بزرگ و برتر ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar#2
KARACHI
PH. 7211795

WORLD SHIA MUSLIM ORGANISATION

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت
اسلام دینِ مُعاشرت
اسلام دینِ مَعرفت
اسلام دینِ حِکمت
فلسفۂ مُعجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ حجاب
فلسفۂ احکام
تاریخِ عاشوراء
گفتارِ عاشوراء
بنائے کربلا
مرگِ گُل رنگ
مکتبِ اسلام
مکتبِ رسولؐ
مکتبِ تشیّع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
توضیح المسائل اردو
توضیح المسائل فارسی
شریعت کے احکام

کتابُ الدعاء والزیارات
اعمالِ حج
حکایاتُ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مَردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزتُ بِربِّ الکعبۃِ
سخن
ابُوطالب ـ مظلومِ تاریخ
تفسیر سورۂ حمد
شرح قرآن
سِیَر و سُلوک
یَسَّرنَا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
پاسدارانِ اسلام
دعائے خلیل، نویدِ مسیحا
انسانِ کامل

نیز بچّوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!

اُردو اور انگریزی مطبوعات کی مکمل فہرست تمام بک اسٹالوں پر دستیاب ہے، طلب فرمائیے

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان